مئی 2015

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ۔

خواتین ڈائجسٹ

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور

بلقیس بھٹی

لفظیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

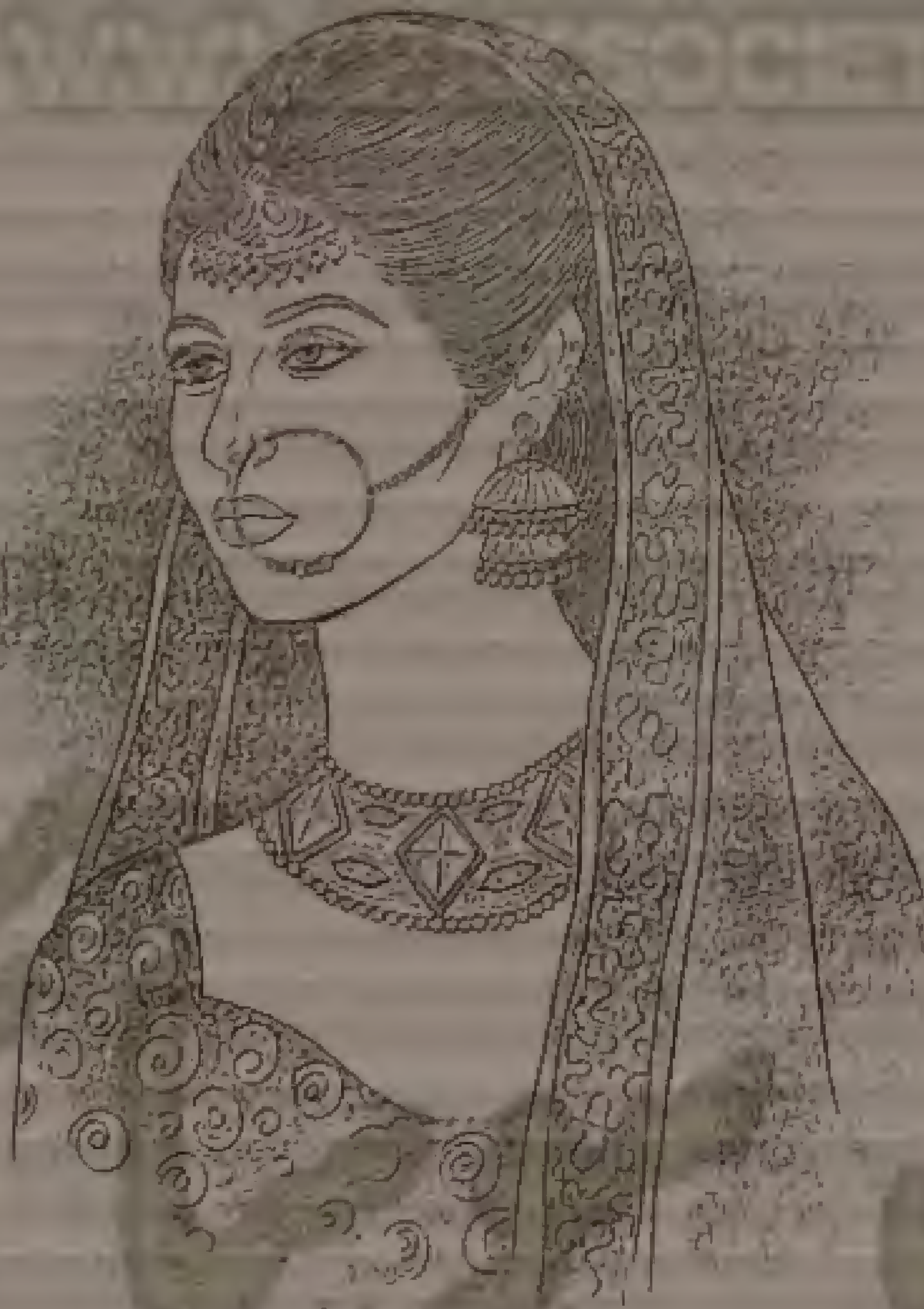
37- اردو بازار کراچی

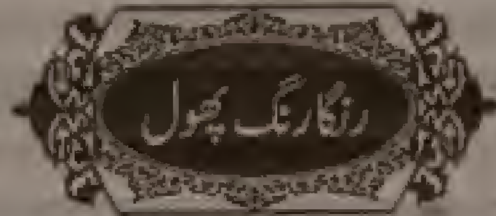
MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

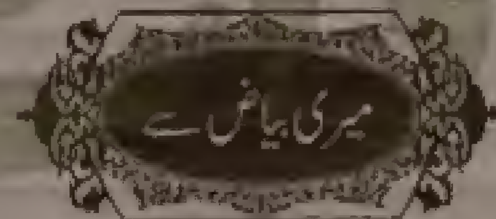
زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

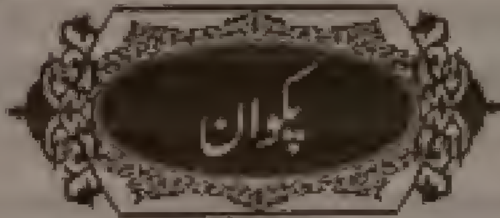
پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

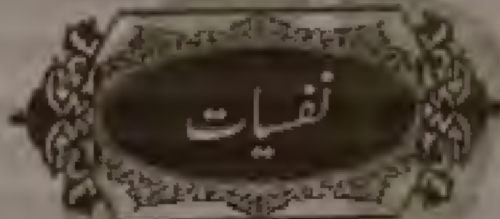


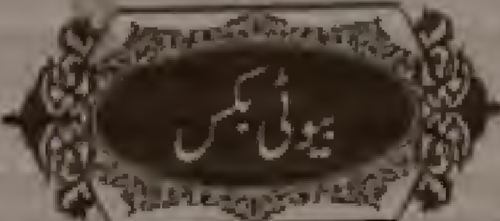












مئی 2015

جلد 43 شمارہ 1

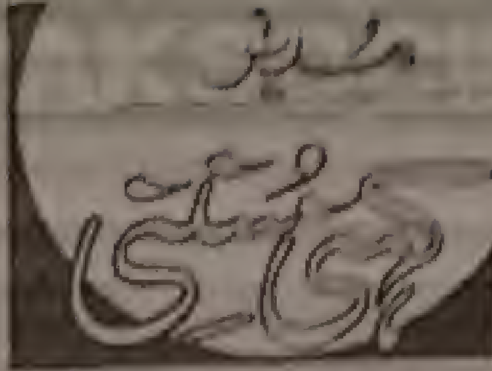
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

زندگی کیا ہے، کہاں سے آتی ہے، کہاں چلی جاتی ہے، آغاز و انجام دونوں ہی نامعلوم۔ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے جانا ہے۔ ایک اٹل حقیقت۔

اس نگار خانۂ ہستی میں موت و حیات کا یہ کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔

وہ لوگ جو ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، ہمارے ساتھی ہوتے ہیں، ایک دن اچانک ہاتھ چھڑا کر بہت دور نکل جاتے ہیں۔ انجان بستیوں کی طرف۔ اجنبی منزلوں کی طرف۔ اور کبھی لوٹ کر نہیں آتے، یہ کھو جانے والے، بچھڑ جانے والے اپنی یادیں، اپنی محبتیں ہمارے دلوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فگن رہتی ہے، دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے لیکن جانے والوں کی یاد ایک کسک بن کر دل میں جاں گزیں ہو جاتی ہے۔

زندگی کے اس مختصر سے وقفے کو معنی و مفہوم ہم دوسروں کے لیے کچھ کر کے ہی عطا کر سکتے ہیں۔ انسان کا دوسروں کے کام آنا ہی زندگی کو کچھ معنی دے سکتا ہے۔ ایسا کچھ کر کے چلو کہ بہت یاد رہو۔

ریاض صاحب کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے زندگی کے مفہوم کو سمجھا، اسے معنویت عطا کی۔ خوش نصیب ان معنوں میں نہیں کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے اور ساری زندگی سکھ کا جھولا جھولتے گزاری۔ زندگی میں انہوں نے بہت کچھ سہا۔ سخت محنت اور نامساعد حالات میں بہت جدوجہد کے بعد اپنا مقام بنایا۔ ذہین، خوش شکل، خوش طبع جوان بیٹوں کی دائمی جدائی کا صدمہ بڑی ہمت اور حوصلے سے سہا۔

خوش نصیب ان معنوں میں تھے کہ انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے ادا کیں، خود سے منسلک تمام رشتوں کو خوش دلی سے نبھایا۔ ان کا خیال رکھا، سب کے کام بھی کیے۔ اور سب سے بڑی خوش نصیبی یہ کہ جس پودے کو لگایا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پھلتے پھولتے، پروان چڑھتے دیکھا۔

خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کی صورت جو چراغ روشن کیے، انہوں نے تاریک راستوں میں رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ اور روشنی کا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

10 مئی کو ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر فرمائے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- ہمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل، ،ام ایمان قاضی کا مکمل ناول۔ اف یہ ممی،
- سحر ساجد اور عنبرین ولی کے ناولٹ، ،عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، عزالہ روشن، حیا بخاری، ازکیٰ اخلاق بٹ اور علیشبہ احمد کے افسانے،
- حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ۔ مصنفین سے سروے،
- باصلاحیت ٹی وی فنکارہ صباحت بخاری سے ملاقات،
- نوجوان فنکار آغان وحید قریشی سے باتیں، ، کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

اک کرن روشنی

ادارہ

بغیر شرعی عذر کے یا حد ادب سے زیادہ غلام، جانور، بیوی اور اولاد کو سزا دینا ممنوع ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور ماں باپ، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار (یا قریب کے) پڑوسی، دور کے پڑوسی، ہم نشین ساتھی اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے غلام ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

(النساء۔36)

فائدہ:

ان تمام قسم کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو حسن سلوک کے منافی ہو اور بغیر کسی شرعی عذر کے کسی کو سزا دینا یا ادب سکھانے کے لیے مارنے کی ضرورت پیش آجائے تو ضرورت سے زیادہ مارنا بھی اسی لیے ممنوع ہے کہ یہ حسن سلوک کے منافی ہے۔

بلی کی وجہ سے عذاب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے قید کر دیا تھا حتیٰ کہ وہ مر گئی، چنانچہ وہ اس کی وجہ سے جہنم میں گئی۔ نہ اس نے اسے کھلایا پلایا جب کہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ اسے اس نے چھوڑا کہ وہ خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حیوانات کے ساتھ بھی نرمی اور حسن سلوک ضروری ہے، سنگ دلی کا مظاہرہ حرام ہے۔

2۔ جانوروں کو قید کر کے پنجرے وغیرہ میں رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

جان دار چیز کو نشانہ بنانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا جو ایک پرندے کو نشانہ بنائے اسے تیر مار رہے تھے اور پرندے کے مالک سے یہ طے کیا تھا کہ ہر چوک جانے والا تیر اس کا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا۔

"ایسا کام کس نے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کام کیا ہے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جان دار چیز کو نشانہ بنائے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

کسی جاندار چیز کو تختہ مشق بنا کر اسے تیروں وغیرہ کا نشانہ بنانا کبیرہ گناہ ہے' اس کا مرتکب ملعون ہے۔

نشانہ بنانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قتل یا نشانے کے لیے) جانوروں کو باندھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب ہے کہ قتل کرنے کے لیے اسے قید کر دیا جائے۔

فائدہ :

باندھ کر یا قید کر کے مارنے کا مطلب ہے کہ اسے باندھ کر پھر تیروں یا گولیوں وغیرہ سے اسے نشانہ بنایا جائے حتی کہ وہ مر جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جانور کو قابو کر کے اس کے گلے پر تیز چھری پھیری جائے تاکہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

ملازم کے ساتھ سلوک

حضرت ابو علی سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں مقرن کے سات بیٹوں میں سے ساتواں تھا (ہم سات بھائی تھے) ہماری ایک ہی کنیز تھی۔ اسے ہمارے سب سے چھوٹے بھائی نے طمانچہ مارا تو نبیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اسے آزاد کر دیں۔ (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے میں اپنے بھائیوں کا ساتواں تھا۔

فائدہ :

مملوک (غلام اور نوکر چاکر) کو بلاوجہ مارنا پیٹنا اور اس پر زیادتی کرنا سخت جرم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے یا پھر کسی دوسرے طریقے سے اسے راضی کیا جائے' ورنہ عنداللہ زیادتی کرنے والا مجرم ہوگا۔ یہ ساتوں بھائی صحابی اور مہاجر تھے۔

غلام کے ساتھ سلوک

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی۔

"خبردار' اے ابو مسعود!"

مگر میں غصے کی حالت میں ہونے کی وجہ سے آواز کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جب وہ (آواز دینے والے۔) میرے قریب ہوئے تو دیکھا کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"خبردار' اے ابو مسعود! اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہے جتنا تو اس غلام پر ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کی ہیبت سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔

ایک اور روایت میں ہے چنانچہ میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! یہ اللہ کی رضا کے لیے آزاد ہے۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تو آزاد نہ کرتا تو آگ تجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی' یا (فرمایا) تجھے جہنم کی آگ ضرور چھوتی۔" (یہ تمام روایات مسلم نے

بیان کی ہیں۔)

فوائد و مسائل :

1۔اس میں بھی غلاموں (اور نوکروں چاکروں) پر بلاوجہ سختی کرنے یا جرم سے زیادہ شدید سزا دینے کی وعید کا ذکر ہے۔

2 ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے جس جلالت وہیبت سے سرفراز فرمایا تھا' اس کا بھی کچھ بیان اس میں آگیا ہے۔

کفارہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے اپنے غلام پر کسی ایسے جرم کی حد لگائی جو اس نے کیا ہی نہیں یا اس کو طمانچہ مارا' تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردے۔" (مسلم)

فائدہ :

قاضی عیاض فرماتے ہیں اس پر اجماع ہے کہ آزاد کرنا واجب نہیں' صرف مستحب ہے' تاہم یہ آزادی گو اجر میں بغیر کسی سبب کے آزاد کرنے کے برابر نہیں ہے' مگر اس کی زیادتی کا کفارہ ضرور ہو گی۔

لوگوں کو عذاب دینا

حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "ان کا ملک شام میں کچھ عجمی کاشت کار لوگوں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا' اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔

انہوں نے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے؟"

ان کو بتلایا گیا کہ "انہیں خراج کی وجہ سے سزا دی جارہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔"

حضرت ہشام نے فرمایا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔"

پھر حضرت ہشام ان لوگوں کے گورنر کے پاس گئے۔ اور انہیں یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان کی بابت حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ خراج' اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو اس زمین کی پیداوار پر عائد کیا جاتا ہے۔ جو کسی اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے قبضہ و تصرف میں ہو' اور مسلمانوں کی زمینوں کی پیداوار سے جو مالیہ وصول کیا جاتا ہے' اسے عشر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جزیہ' وہ سالانہ رقم ہے جو اسلامی مملکت میں رہنے والے ذمیوں سے ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے عوض وصول کی جاتی ہے۔ مسلمان' سالانہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور غیر مسلم اہل ذمہ جزیہ۔

2 ۔ عذاب سے مراد' وہ مخصوص قسم کی سخت سزا ہے جو اللہ تعالیٰ جہنم میں جہنمیوں کو دے گا' دنیا میں کوئی ایسی سزا کسی کو دے گا تو اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں ہے اور وہ قیامت والے دن ایسی سزا دینے والے کو سزا دے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کرنا اور سروں پر تیل ڈالنا بھی' جہنم ہی کی سزاؤں میں سے ہے۔ اس لیے صحابی رسول نے حدیث رسول بیان فرما کر اس پر گورنر کو متنبہ فرمایا اور انہوں نے یہ سزا موقوف کردی۔

3 ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

4 ۔ ظالموں کو ان کے ظلم سے ڈرایا جائے تاکہ وہ ظلم کے ارتکاب سے باز آجائیں۔

چہرے کو داغنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گدھے پر سے گزر ہوا جس کے چہرے کو داغا گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جس نے اسے داغا ہے۔" (مسلم)

اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے اور چہرے کو

داغنے سے منع فرمایا ہے۔

فائدہ :

چہرہ چونکہ نہایت ہی لطیف اور حساس چیز ہے' اس لیے انسان ہو یا جانور' اس کے چہرے پر مارنا یا اسے داغنا یا کوئی اور ایسا عمل کرنا جو اس کی نزاکت کے خلاف ہو' ممنوع ہے۔ اسی لیے بیوی' اولاد اور خادم وغیرہ کو اگرچہ بطور تادیب مارنے کی اجازت ہے' لیکن یہ تاکید کی گئی ہے کہ اس مار سے چہرہ محفوظ رہے۔

ہر جان دار' حتیٰ کہ چیونٹی وغیرہ کو بھی آگ میں جلانے کی سزا دینا منع ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا تو فرمایا۔

''اگر تم فلاں فلاں کو پاؤ تو ان کو آگ میں جلادو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے دو آدمیوں کا نام لیا۔ پھر جب ہم نکلنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کو جلادینا۔ لیکن آگ کا عذاب تو صرف اللہ ہی دے گا' اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو انہیں قتل کر دینا۔'' (بخاری)

فائدہ :

1 ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوسرے حکم میں واضح فرمادیا کہ آگ میں جلانے کی سزا کسی کو نہیں دینی چاہیے' حتیٰ کہ اپنے شدید تر دشمن کو بھی نہیں۔

رحم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی بشری حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ ہم نے (چڑیا کی طرح کا) ایک سرخ پرندہ دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا۔ وہ پرندہ ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اس پرندے کو اس کے بچوں کی وجہ سے کس نے درد مند کیا (تکلیف پہنچائی) ہے؟ اسے اس کے بچے لوٹا دو۔''

اور آپ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جس کو ہم نے جلا دیا تھا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

''یہ بستی کس نے جلائی ہے؟''

ہم نے جواب دیا۔

''ہم نے (جلائی ہے)۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''آگ کا عذاب دینا تو آگ کے رب ہی کو سزاوار ہے۔''

(اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

چیونٹیوں کی بستی سے مراد چیونٹیوں کا ایسا مسکن ہے جہاں چیونٹیاں موجود ہیں۔

فوائد و مسائل

1 ۔ پرندوں کے بچوں کو پکڑ کر پرندوں کو ایذا پہنچانا' چیونٹیوں اور دیگر حشرات الارض کے مسکنوں کو کیڑے مکوڑوں سمیت جلانا منع ہے' البتہ خالی مسکنوں کو جلانا ممنوع نہیں ہے۔

2 ۔ اگر کسی نے کسی کو آگ میں جلا کر مار دیا تو قصاص میں ایسا کیا جاسکتا ہے کہ قاتل کو بھی جلا دیا جائے' البتہ مقتول کے ورثاء چاہیں تو تلوار سے اس کی گردن اڑا کر بھی قصاص لے سکتے ہیں۔

حق دار کا اپنے حق کا مطالبہ کرتے پر مال دار آدمی کا ٹال مٹول کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔'' (النساء۔ 58)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''پس اگر تمہارا بعض بعض پر اعتبار کرے تو چاہیے کہ جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے' وہ امانت واپس کردے'' (البقرہ۔283)

ہبہ واپس لینے کی کراہت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" جو شخص اپنے ہبے کو واپس لیتا ہے ' وہ اس کتے کی طرح ہے جو قے کرکے اپنی قے کو چاٹتا ہے۔ " (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے۔

" اس شخص کی مثال جو اپنا صدقہ واپس لیتا ہے ' اس کتے کی طرح ہے جو قے کرتا ہے ' پھر اپنی قے میں لوٹتا اور اسے چاٹتا ہے۔ "

ایک اور روایت میں ہے۔

" اپنے ہبے کو واپس لینے والا اپنی قے میں لوٹتا اور اسے چاٹتا ہے۔ "

ایک اور روایت میں ہے۔

" اپنے ہبے کو واپس لینے والا اپنی قے میں لوٹنے والے کی طرح ہے۔ "

فائدہ :

اس کی شناعت و قباحت اس سے واضح ہے کہ ایک تو ایسے شخص کو ' جو ہبہ واپس لیتا ہے ' کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور دوسرے ' موہوب چیز کو قے سے تعبیر کیا جس سے انسان سخت کراہت محسوس کرتا ہے۔ تاہم علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اجنبی آدمی کے لیے ہے۔ اگر انسان اپنی اولاد یا پوتوں ' پڑپوتوں کو کوئی چیز ہبہ کرے تو اسے واپس لینے کا یہ حکم نہیں ہے ' اس کا واپس لینا اس کے لیے جائز ہے جیسا کہ عنوان باب سے بھی واضح ہے۔

صدقہ کی ہوئی اپنی چیز خریدنا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

" میں نے ایک شخص کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک گھوڑا دے دیا ' چنانچہ جس کے پاس وہ تھا ' اس نے اسے ضائع کردیا (اس کی دیکھ بھال نہیں کی۔) میں نے اسے اس سے خریدنے کا ارادہ کیا اور میرا خیال تھا کہ وہ اسے معمولی سی قیمت پر بیچ دے گا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کی بابت) پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" اسے نہ خریدو اور اپنا صدقہ واپس نہ لو ' اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم میں دے دے ' اس لیے کہ اپنا صدقہ واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو اپنی قے کو چاٹتا ہے۔ " (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمتاً خرید کر بھی واپس لینا جائز نہیں۔

مال یتیم کے حرام ہونے کی تاکید کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" بے شک وہ لوگ جو ناجائز طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں ' وہ یقیناً " اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔ " (النساء۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا

" یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ " (الانعام۔152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا

" یہ تجھ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں ' ان سے کہہ دے ' ان کی اصلاح کرنی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو (خرچ میں) اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے ہی بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے ' خرابی کرنے والا کون ہے ' اور اصلاح کرنے والا کون۔ " (البقرہ۔220)



تین چربہ کہانیاں ننھے منے بڈھوں کے لئے

انشاء جی

تین چربہ کہانیاں ننھے منے بڈھوں کے لیے!

اچھا تو میرے پیارے بزرگو! راج دلارے بزرگو! اب حقے کا ایک کش لو اور سو جاؤ۔ تم کام کر کے تھک گئے ہو گے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کل کا کام آج پر نہ ڈالو۔ یعنی جو کام کل ہو سکتا ہے' اسے آج مت کرو۔ آرام بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ بلکہ زریں اصول تو یہ کہ "پہلے آرام' پھر بھی آرام۔"

"کہانی سنیں گے۔"

"ارے بڈھو! نٹ کھٹ بڈھو! ہم کہانیاں کہاں سے لائیں۔ نئی کہانیاں تو آج کل فلم والوں کو بھی نہیں ملتیں۔ بے چارے کابل جاتے ہیں اور وہاں سے ہینگ' سلاجیت' ٹرانزسٹر' ریڈیو اور چربہ کہانیاں لاتے ہیں۔ اچھا تم بھی کچھ نصیحت آمیز کہانیاں ہم سے سنو۔ لیکن شور مت کرنا' چین سے سننا۔"

1۔ ایک گرو کے دو چیلے

ایک تھا گورو۔ بڑا نیک' دھرماتما۔ دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار' جاں نثار' گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کا شبھ نام پوربول تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند گوروجی جب لوگوں کو اپدیش دیتے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیٹتے تو چیلا پوربول ان کی داہنی ٹانگ دباتا اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے۔ تیل چپڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے۔ اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گوروجی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پوربول کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً "ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گوروجی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی مرمت کی۔ گوروجی بہت چلائے۔

"ظالمو..... کیوں مارے ڈالتے ہو' ہائے۔" لیکن چیلے کہ علاقائی خود مختاری کے قائل تھے کب مانتے تھے۔ دونوں نے اخباری بیان جاری کیے اور زیادتی میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا۔ گوروجی کی ٹانگیں سوج کر کپا ہو گئیں۔ مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔

"بس.....؟"

"نہیں..... بس کیوں..... کہانی آگے بھی چلتی ہے۔ لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونہار اور ہوشیار' پشاوری مل' لاہور رام' سندھو پرکاش وغیرہ۔ جب لالہ پچھمی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گوروجی کی ٹانگ تو دباتے تھے' لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ محنت کرتا تھا۔ کوئی گھٹنے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور طے ہوا کہ ہم اپنا اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پوربول نے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کر لے جا رہا ہوں۔ اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی۔ تیسرے نے گھٹنا اٹھایا اور گھر کی راہ لی۔ اس کے بعد سب ہی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

"گوروجی کا کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں کیا ہوا۔ کہانی میں اس کا ذکر نہیں۔ حد سے حد مر گئے ہوں گے۔ اچھا اب ایک اور کہانی سنو۔"

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع

مئی 2015
کے شمارے کی ایک جھلک



مئی 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- راشدہ رفعت کا مکمل ناول ”ہے زندگی کتنی حسین“،
- ”خواب تھا کوئی“ نگہت سیما کے مکمل ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- سحرش خان کا مکمل ناول ”چاند میری چوکھٹ پر“،
- رخسانہ نگار عدنان کا سلسلے وار ناول ”ایک تھی مثال“،
- نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول ”رقصِ بسمل“،
- صائمہ اکرم کا ناولٹ ”سیاہ حاشیہ“،
- ایمل رضا، قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا نوشین، دیناز سحر سلیم اور نوشین ناز اختر کے افسانے،
- مقبول فنکارہ ”روبینہ اشرف اور طارق“ کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دستک“،
- ”روبرو“ آپ کے سوالات کے جوابات لیے ”سمیرا حمید“،
- ”پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں“ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- خط آپ کے، مسکراہٹیں، آئینہ خانے میں، کھلتا کسی پہ،

موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع کا مئی 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

2۔ مچھیرا اور انعام

"اچھا تو سنو! ایک مچھیرے کے ہاتھ ایک عمدہ سی مچھلی آئی تو وہ انعام و اکرام کی خواہش میں اسے لے بادشاہ کے محل پر پہنچا اور اندر جانے کی کوشش کی۔

دربان نے روکا۔ "بے کہاں جاتا ہے' پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔" مچھیرے نے مدعا بیان کیا۔ دربان نے کہا۔ "دیکھ بابا! جو کچھ انعام ملے اس میں سے چھپن فیصدی میں لوں گا۔"

مچھیرا آدھے پر راضی ہو گیا' لیکن دربان اپنے چھپن فیصدی پر اڑا رہا' بلکہ بولا۔

"اگر بادشاہ نے اس مچھلی کو برآمد کر کے فارن ایکسچینج کمایا تو اس میں سے بھی چھپن فیصد لا کر مجھے دینا۔"

خیر اس بے چارے کو ہامی بھرنی پڑی۔

بادشاہ مچھلی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "مانگ کیا انعام مانگتا ہے؟"

مچھیرے نے کہا۔ حضور' اللہ کا دیا اور تو سب کچھ ہے۔ بس سو جوتے میرے سر پر کس کے لگا دیے جائیں۔

بادشاہ بہت حیران ہوا' سمجھانے کی کوشش کی' لیکن بوڑھا مچھیرا اڑا رہا۔ آخر بادشاہ نے ایک چوبدار سے کہا۔ "اس کے سر پر ہلکے ہلکے سو چھتر لگا دو۔ دماغ خراب معلوم ہوتا ہے بے چارے کا۔

جب گنتی 44 پر پہنچی تو مچھیرے نے کہا۔ "حضور بس' میرا اس میں اتنا ہی حصہ ہے۔ باقی 56 جوتوں کا حق دار باہر ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"

بادشاہ نے پورا حال سنا۔ انصاف پسند تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں بھئی' بات تو ٹھیک ہے۔ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ہر چیز میں اس کو حصہ واجب ملنا چاہیے۔ خواہ بے بھاؤ کے جوتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اب تو ہم اپنے ملک میں بھی یہ کرنے والے ہیں کہ اگر ایک حصے میں 44 آدمی پانی نہ ملنے سے پیاسے مر جائیں تو دوسرے میں 56 کو پکڑ کر تالاب میں ڈبو دیا جائے۔ بے انصافی کب تک چلے گی۔"

اچھا بس اب ہم تھک گئے۔

"ایک اور۔۔۔ ایک اور۔۔۔"

3۔ دیوگری سے واپسی

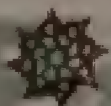
اچھا اب ہم تمہیں ایک تاریخی حکایت سناتے ہیں۔ ملک ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا محمد تغلق۔ بڑا عقل والا۔ علم و فضل والا۔ ایک روز اس کو خیال آیا کہ دہلی میں اور تو ساری خوبیاں ہیں' لیکن یہ ہندوستان کے وسط میں نہیں۔ اس نے فوراً" نقشہ منگایا۔ پرکار رکھ کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دکن کے اوپر دیوگری کا مقام زیادہ مرکزی ہے۔ فوراً" حکم دیا۔

کہ مابدولت کا دارالخلافہ وہاں بنایا جائے اور دہلی کی آبادی نہ صرف اہل کار بلکہ اہل حرفہ بھی کوچ کر کے وہاں چلے جائیں۔ یہ ہمارا حکم ہے' کوئی سرتابی نہ کرے۔

رعایا خچروں اور چھکڑوں پر بیوی' بچے' مال' اسباب لاد روانہ ہوئے۔ کئی مہینے کی راہ تھی۔ کہیں ڈاکوؤں نے حملہ کیا' کہیں جنگلی جانور آن پڑے۔ بہت سے مر کھپ گئے۔ جو بچے انہوں نے وہاں سر چھپایا۔ کاروبار جمایا۔ مقام پُرفضا تھا' پسند آیا۔ لیکن نازک مزاج شاہاں' ایک روز جانے کیوں ان کا جی دیوگری سے اچاٹ ہوا اور انہوں نے فرمان جاری کیا کہ چلو دلی واپس۔ یہاں ہمارا جی نہیں لگتا۔ جو لوگ بچ گئے تھے' ان میں سے آدھے پھر ڈاکوؤں' جنگلی جانوروں اور راہ کی سختیوں کا شکار ہوئے۔ بس تھوڑے سے برے حالوں واپس پہنچے۔ اب اس سے بھی کئی اخلاقی نتیجے نکلتے ہیں۔ بھلا بتاؤ کیا؟

خر۔۔۔ رر۔۔۔ رر۔۔۔ خر۔۔۔ رر۔۔۔ رر

ارے کیا سو گئے۔ اچھا السلام علیکم! خدا حافظ' شب بخیر۔



بیادِ محمود ریاض



آہ! کیسے بھلائیں ہم اہلِ درد اسے
دلوں میں چھوڑ گیا اپنی داستاں وہ شخص

روشنی کہ خوشبو

لبنیٰ غزل

ایک طویل عرصہ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق رہا' بے شمار کہانیاں' ناول افسانے لکھے' تعلق تو اب بھی ہے لیکن مصروفیات نے لکھنے سے دور کردیا' جاب' بچے' گھرداری اور دوسرے مسائل میں گھر کر رہنے کی حد تک تو رشتہ قائم رہا' لیکن لکھنے کی مہلت نہ ملی۔
ایک عرصے کے بعد امتل کا فون آیا اور اس نے سالگرہ نمبر کے سروے میں حصہ لینے کو کہا تو نہ جانے کیا کیا یاد آیا۔

مئی کا مہینہ ہی تو تھا جب ریاض صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ اپریل میں میرے شوہر شکیل کی پہلی برسی تھی' ایک طویل رفاقت کے بعد انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب ریاض صاحب کی برسی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔

؎ اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا

یہ دنیا ایک سرائے ہے اور سب اس کے مسافر۔ اور مسافروں کو تو جانا ہی ہوتا ہے۔ کسی کو جلدی کسی کو دیر سے۔ مسافر تو چلا جاتا ہے' مگر اس کے جانے کے بعد اس کے قدموں کے نشان ہر قدم پر اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

انشاء جی' ریاض صاحب' محمود بابر فیصل' محمود خاور جو چاند نگر کے باسی تھے' اب اس جہاں سے کوچ کرچکے ہیں جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔ اپنے پیاروں کی زندگی بھر کی جدائی کا روگ سہنا کس قدر مشکل لگتا ہے' یہ اب میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

وقت جو ظالم بھی ہے اور مرہم بھی۔ وقت گزر ہی جاتا ہے۔ آج ریاض صاحب کو اس دنیا سے گئے چودہ برس بیت گئے۔ مگر لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔ جب میں پہلی بار اپنی والدہ کے ساتھ خواتین ڈائجسٹ کے آفس اپنی پہلی تحریر چھپوانے کی غرض سے گئی تھی۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ آج تو خواتین ڈائجسٹ کا دفتر بند ہے کیونکہ انشاء جی کی برسی ہے۔

میں اس بات پر حیران تھی کہ انشاء جی کی برسی پر خواتین ڈائجسٹ کا دفتر کیوں بند ہے۔

بہرحال میں کچھ دنوں کے بعد دوبارہ گئی تو ریاض صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں انہیں دیکھ رہی ہوں یا انشاء جی کو۔ دونوں میں حد درجہ مشابہت اور مماثلت۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ انشاء جی ریاض صاحب کے بھائی تھے' جن کی وفات نے انہیں صدمے سے نڈھال کر رکھا تھا' مگر دکھ کی اس کیفیت میں بھی ریاض صاحب نے میزبانی کا پورا حق ادا کیا اور بہت اچھی طرح ملے۔ وہیں امتل سے بھی تعارف ہوا اور ملاقات ہوئی' بہت ادبی ماحول میں۔ ریاض صاحب کے مزاج کی شگفتگی' ان کا خوش دلی سے ملنا' ان کی شاعرانہ اور ذو معنی باتیں' موقع محل سے برجستہ جملے اور حاضر جوابی کا جواب نہیں تھا۔ ہر بات میں شعر پڑھنا ان کے اعلا ذوق کی نشاندہی تھا۔
میں چونکہ ابتدائی دور میں اپنی والدہ کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ ریاض صاحب میری والدہ سے پنجابی میں بات کرتے تو مجھے بہت خوشی اور اپنائیت کا احساس ہوتا تھا اور مجھے ریاض صاحب کہتے تھے۔

"تم تو جعلی پنجابی ہو جسے اپنی زبان بولنا نہیں آتی۔" دیکھنے میں ریاض صاحب کی شخصیت نہایت سنجیدہ' خاموش اور رعب دار تھی' مگر مزاج میں دھیما پن' شاعرانہ انداز اور بذلہ سنجی نمایاں تھی۔

طبیعت میں سادگی تھی' اس لیے میں نے ان کے آفس میں ان کی میز کو بے ترتیب ہی پایا۔ بکھرے

ہوئے کاغذات اور کتابیں۔ اس ماحول میں بھی زندگی محسوس ہوتی تھی' کیونکہ ان کے چاروں طرف سچے لفظ بکھرے ہوتے تھے اور وہ لفظ باتیں کرتے تھے۔
ریاض صاحب کی مثبت اور اصلاحی تنقید اور اچھی تحریروں پر حوصلہ افزائی نے مجھے ایک دہائی تک مسلسل خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور کرن کا لکھاری بنائے رکھا۔ جس ماہ میں لکھ نہیں پاتی تھی' ریاض صاحب اصرار کر کے اگلے پرچے کے لیے زبردستی لکھواتے تھے۔

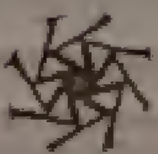
آج یہ ادارہ جس مقام پر ہے اس میں ریاض صاحب اور ان کے بیٹوں کی ان تھک محنت کا رنگ شامل ہے۔ آج ڈائجسٹ رائٹرز ٹی۔ وی چینلز پر چھائی ہوئی ہیں اس کا سارا کریڈٹ اس ادارے کو ہی جاتا ہے' جس کی بنیادوں میں ریاض صاحب اور ان کے بیٹوں کی محنتوں کا پسینہ شامل ہے۔
ریاض صاحب کی مضبوط' قد آور اور رعب دار شخصیت میں اس وقت دراڑ آگئی' جب انہوں نے دو جوان بیٹوں کا دکھ سہا۔ باپ کے کندھوں پر اس سے بڑا بوجھ کوئی اور نہیں ہو سکتا اور کوئی اور بڑا دکھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے جوان بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائیں۔ جوان اولاد کی دائمی جدائی کا روگ انہیں اندر سے ختم کر گیا۔ اور پھر وہ خود بھی ان سے جا ملے۔ اپنوں سے جدائی کا دکھ' دائمی جدائی کا دکھ کیا ہوتا ہے اسے میں اب اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کیونکہ ابھی پچھلے برس ہی تو میں نے اور میرے بچوں نے اپنا سب سے قیمتی رشتہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ اور برسی کے چند دنوں کے بعد ہی میں ریاض صاحب کے لیے یہ تعزیتی مضمون لکھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے کہ وہ وقت پھر زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے آکر ٹھہر گیا ہے۔ وہ ظالم وقت جو ہم سے ہمارے اپنے کتنی بے دردی سے چھین کر لے جاتا ہے۔ مگر یہ قانون قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم کہ جسے آنا ہے اسے جانا بھی ہے۔ اور جانے والوں کو کوئی



روک نہیں سکتا اور نہ ہی جانے والوں کے ساتھ جایا جا سکتا ہے۔ بس پھر اپنے آپ کو صبر کے حوالے کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔

اک اور در بند ہو گیا
اک اور سائبان کھو گیا
پھر کہاں صورت نصیب ان کی
عدم کے راستے پر اک بار جو گیا
عداوت کی جسے عادت نہ تھی
ستم پہ ستم وہ شخص ہو گیا
اپنے پیاروں کی جدائی میں

ہنس کر آخر وہ بھی رو گیا
نیند سے خالی آنکھیں تھیں
پھر بھی تھک ہار کر سو گیا
جگر گوشوں کو روانہ کیا
پھر ان کے پیچھے خود بھی ہو لیا



زندگی کی صورت

سعدیہ عزیز آفریدی



کچھ لوگ سبز موسموں کی
دعا ہوتے ہیں
جیون میں سکھ کی ردا ہوتے ہیں
زندہ رہتے ہیں کچھ اس طرح سے
زندگی کی صورت دلربا ہوتے ہیں

ریاض صاحب بھی زندگی کی صورت دلربا ہی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی کے سفر میں راستہ چنیں تو نہ صرف خود اس پر چلتے ہیں بلکہ پیچھے آنے والوں کو بھی آسانیاں دینے کی سعی کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں اگر کسی سفر میں کوئی گرتا ہے تو وہ اپنے آگے چلنے والوں پر صرف تنقید کرتا ہے۔ ان لفظوں سے کہ انہوں نے راستے کے پتھر نہیں ہٹائے جو اس کو گرانے کا سبب بنے۔

وہ ایسے ہی تھے نرم خو، حلیم طبع اور سیلف میڈ، سیلف میڈ لوگ زندگی کا حسن ہوتے ہیں، انہوں نے جب خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا تو دھیرے دھیرے وہ ایک سفر کی بنیاد رکھ رہے تھے انہیں معلوم نہیں تھا یہ سفر کتنا طویل، کتنا خوش گوار رہے گا، مگر وہ چل پڑے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فرد سے فرد ملتا گیا اور قافلہ بنتا گیا، ڈائجسٹ گھر کا فرد بنتا گیا۔ شعر و شاعری، خطوط، محبت کی باتیں، بیوٹی بکس، اور دین کی بنیادیں کھڑی ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ ایک عمارت بنتی گئی پھر "شعاع" عمران، کرن" کے ذریعے ان سے مضبوط رشتہ بنتا گیا، اتنا مضبوط کہ آج بھی لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔ ان کے اس سفر کو نئے سرے سے پڑھنا چاہتے ہیں اور میرا قلم ہے کہ آج بھی ان کو مرحوم لکھتے ہوئے کئی بار لڑکھڑا جاتا ہے اور ایک ہی سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ ریاض صاحب جیسے لوگ مر سکتے ہیں؟ اور کوئی چپکے سے کہتا ہے، نہیں ایسے لوگ جن کے جانے کے بعد بھی انہیں یاد رکھیں، ان کی مہربانیوں کو دہرائیں، ان کے کاموں کو سراہیں، ان کی جدائی پر پہلے دن کی طرح تڑپ اٹھیں، ان کی باتوں کو مشعل راہ بنائیں، ان کی محبت کے انداز کو محبت سے تھامے رکھیں، وہ انسان مرا نہیں کرتے، وہ لوگ زندہ رہتے ہیں، لفظوں میں، دلوں میں، زندگی میں، ایسے لوگوں کا سفر رکتا نہیں ہے، ان کا سفر جاری رہتا ہے اور جو سفر جاری رہے وہ روح کے لیے صدقہ جاریہ بن جاتا ہے اور روح تا ابد زندہ ہے، ریاض صاحب بھی اب بھی زندہ ہیں، زندہ رہیں گے، کیونکہ وہ دل تھے، روح تھے، محبت تھے۔ اور محبت کبھی نہیں مرتی۔






حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا، وہ شوق، وہ جستجو، وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

ثمرہ بخاری

آپ کا بھیجا ہوا سوال نامہ بہت دنوں سے میری فائل میں موجود ہے۔ سوال بہت اچھے ہیں۔ مگر عمر رفتہ کو آواز دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں لمبی لمبی کہانیاں تو لکھ لیتی ہوں لیکن کسی کو خط لکھنا، بچوں کے لیے تقریر یا مضمون لکھنا اور اسی طرح سوالوں کے

جواب لکھنا میرے لیے بے حد مشکل کام ہے۔
بہر حال آج کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی ہوں۔
اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔
(1) آپ کا پہلا سوال کیا کیا یاد دلا رہا ہے مجھے۔
وہ سارے لوگ جو علم کے حصول میں سرگرداں رہے۔ جنہوں نے کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ وہ کون تھے؟ وہ میرے اپنے تھے۔
مجھے لکھنے کی صلاحیت وراثت میں ملی ہے۔ میری دادی اماں۔ میری دو پھوپھو' بہت اچھا لکھنے والوں میں تھیں۔

میری بڑی پھوپھو جو میرے والد کی بڑی بہن تھیں' لاہور میں باقاعدہ مشاعرے اٹینڈ کیا کرتی تھیں۔ یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔
جب ہم نے ہوش سنبھالا' شاعری کی کتابیں اچھی لگنے لگیں تو اس کے ساتھ ہی شعرا کی ذات میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہم ان سے پوچھا کرتے تھے احمد فراز کے بارے میں پروین شاکر اور دوسرے بہت سے شعرا کے بارے میں۔
شادی کے بعد انہیں لاہور چھوڑنا پڑا ان کے شوہر گورنمنٹ آفیسر تھے ایک شہر سے دوسرے شہر ٹرانسفر ہوتی رہتی تھی' پھر گھریلو مصروفیات بھی تھیں۔ میری پھوپھو کچھ عرصے کے لیے لکھنا بھول ہی گئی تھیں۔ لیکن پھر جب فراغت کا دور آیا تو انہوں نے دوبارہ بھی لکھا۔ میری چھوٹی پھوپھو جرمنی چلی گئی تھیں اور وہاں ادبی حلقوں میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔
میری ذات کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں نے لکھنے کا آغاز تو تب کیا جب میٹرک کے امتحانات کے بعد میں فارغ تھی' لیکن کہانیاں بننا میں نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ خاندان میں افسانہ نگار تو کم ہیں۔ میری علاوہ

میری بہن عظمیٰ بخاری نے لکھا مگر پھر گھریلو مصروفیات آڑے آئیں اور یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکی۔

میرا پھوپھی زاد بھائی یاسر جواد بہترین مترجم ہے اور ادبی حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔

(2) اب آتے ہیں آپ کے دوسرے سوال کی طرف۔

جی نہیں' میری کہانیاں میرے گھر والے نہیں پڑھتے۔ صرف عظمیٰ بخاری میری بہن ہے جو پڑھتی ہے اور سراہتی بھی ہے۔

اس کے علاوہ تو کوئی میری کہانیوں کو پڑھتا ہے نہ میرا لکھا ڈرامہ دیکھتا ہے اور نہ ہی میرا تعارف کسی اجنبی سے کرواتے ہوئے یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری یہ عزیز چھوٹی موٹی رائٹر بھی ہے۔

میرے میاں صاحب نے شاید ہی میری کوئی تحریر پڑھی ہو گی۔

گھر والوں کے ایسے سلوک کی وجہ سے اگر کہیں کبھی کوئی فین ٹکرا جائے اور کہہ دے کہ ہم آپ کو شوق سے پڑھتے ہیں تو میں بے یقین اور شرمندہ دکھائی دیتی ہوں۔

(3) سوال نمبر 3 کا جواب دینا میرے لیے ذرا مشکل ہے۔ میں نے تقریباً" ساڑھے چار سو کے قریب افسانے لکھے ہیں اور انہیں تین مختلف رنگوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک رنگ وہ ہے جو مکمل دیہی زندگی کی عکاسی کرتا ہے' میں نے دیہات کی زندگی خصوصاً" دیہات کی عورت کی زندگی پر کافی زیادہ لکھا ہے۔

دوسرے نمبر پر ہلکی پھلکی کامیڈی ہے اور مجھے حیرت ہے' لوگ مجھے میرے اسی رنگ سے پہچانتے ہیں۔

تیسرا رنگ ہماری عام معاشرتی زندگی کا ہے۔

دیہاتی کلچر پر لکھی گئی تحریروں میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل ہے۔ اپنی کتاب "دل دا دیس" میں' میں نے کچھ کہانیاں اکٹھی کی ہیں اور یہ سب ہی مجھے پسند ہیں۔

عام معاشرتی کہانیوں میں "لاؤ اپنے حسن کی ناؤ" "تتلی اور دریچہ" اور بھی بہت سی کہانیاں' جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے اور اگر کامیڈی کی بات کی جائے۔ جب سے "ہم سے ہے زمانہ" لکھنا شروع کیا ہے' میری باقی کہانیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔

ان دو کریکٹر کو لے کر لکھنا مجھے خود بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ لوگ تعریف کرتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

مجھے اپنی ہر کہانی لکھنے کے بعد اطمینان ہی محسوس ہوا کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہر ماہ ڈیر امتل کا خط موصول ہوتا تھا جس میں وہ لکھتی تھیں' جلدی سے ناولٹ یا مکمل ناول لکھ بھیجو' میں نے ڈائجسٹ میں تمہارے لیے صفحات رکھے ہیں۔ اور میں ہڑبڑا کر لکھنے بیٹھ جاتی تھی اور جب مکمل کر لیتی تھی اطمینان کی سانس لیتی تھی۔

(4) آپ نے پوچھا ہے اپنے علاوہ کن مصنفات کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں۔ اب تو کچھ عرصے سے میں باقاعدہ ڈائجسٹ پڑھ نہیں پا رہی۔

جب پڑھتی تھی' ان دنوں کی لمبی لسٹ ہے۔ مگر اس میں سب سے اوپر فائزہ افتخار کا نام آتا ہے۔ فائزہ نے ہر موضوع کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے اور کبھی بھی اس کی تحریروں میں یہ تاثر نہیں ملا کہ رائٹر یہ بتانا چاہتا ہے' میرے پاس معلومات کے خزانے ہیں۔ میں فلسفے کے بیان میں ماہر ہوں اور یا میری انگریزی انگریزوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

رخسانہ نگار بہت ذہین رائٹر ہیں۔

فاخرہ جبیں کو میں بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔

نگہت سیما بہت معتبر نام ہے۔

آسیہ رزاقی کا اپنا انداز ہے اور یہ انداز بہت خوب صورت ہے۔

اور اس رائٹر کا ذکر کرنا میں کیسے بھول سکتی ہوں جن کی تحریروں کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا۔ میں ساجدہ حبیب کا ذکر کر رہی ہوں' ان کا انداز سب سے جدا ہوا کرتا تھا اور دل کو چھو لیتا تھا۔

آج بھی رائٹرز یقیناً" اچھا لکھ رہی ہوں گی مگر ہر دوسری کہانی کے آخر میں باقی آئندہ لکھا دیکھ کر میں

ڈائجسٹ رکھ دیتی ہوں۔ برامت مانیے گا' اصل میں میں ڈائجسٹ خود کو ریلیکس کرنے کے لیے اٹھاتی ہوں' باقی آئندہ' کا مطلب ہے ایک نئی کوفت جو میں سہنا نہیں چاہتی' بس اسی لیے آج کی نامور رائٹرز بہنوں کی تحریریں نہیں پڑھ سکی۔ اس کے لیے معذرت۔

آمنہ زریں

(1) پہلے سوال کا جواب دینے کی خواہش نے باقی جوابات کا بھی پابند کیا ہے۔ کیونکہ میں خود کو مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں کرتی۔ ہر لکھنے والا مصنف نہیں کہلاتا اور نہ ہی ہر مصنف کہانی کار ہوتا ہے۔

بہرحال ... اپنے والد سے ورثے میں ملنے والی صلاحیت کا اعتراف کرنے کا یہ بہترین موقع ہے جسے میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ (حالانکہ میں مواقع ضائع کرنے کی عادی ہوں)

صلاحیت جو خداداد کہلاتی ہے' اس کا ذریعہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ وہ چیز جسے ارتقا کہتے ہیں' وہ نسل در نسل کا مرحلہ ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہوگا کہ آسودگی اور نا آسودگی' فہم اور حصول فہم کی آرزو' خوبی اور خوبی کا ادراک ... اسے آگے بڑھاتا ہے یا پیچھے کی طرف لوٹاتا ہے!

پڑھنا' لکھنے سے پہلے کا مرحلہ ہے جسے طے کرکے ہی لکھنے کا عمل ممکن ہوتا ہے اور یوں بھی "پڑھنے" کو آفاقی درجہ حاصل ہے۔ (اقرا)

میرے ابو کو مطالعے سے بہت شغف تھا۔ رات کی خاموشی میں' نظر کا چشمہ لگائے گہرے انہماک سے پڑھتے' عکس ... ذہن میں لہراتے ہیں! مجھے پڑھنے کا شوق بالکل نہیں تھا لیکن پھر وہ کیا چیز تھی جو مجھ تک منتقل ہوئی؟

سنجیدگی' احساس' مشاہدہ اور پرکھ کی صلاحیت ... !

والدین کا لفظ' ماں باپ کی شراکت کو ظاہر کرتا ہے۔ موروثیت صرف والد سے ہی مشروط نہیں رہتی ... جس بطن میں پرورش پاکر انسان مشرف بہ زندگی قرار پاتا ہے۔ خوبیوں اور خامیوں کا ایک لامتناہی' ان دیکھا سلسلہ اس سے منسلک ہے ... دکھائی دینے والا ہر انسان اپنے ماں باپ سے ملنے والی مثبت اور منفی تحریک کا نمائندہ ہے۔

انسان کا شمار ناشکری مخلوق میں ہوتا ہے ... مگر اس کے باوجود شکر کی کوشش ترک نہیں کی جاتی ... ان سطور کے ذریعے' اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے (فائدہ اٹھاتے ہوئے) ادارے کی شکر گزار ہوں' جس کی وساطت میرے لیے اس موقع کا ذریعہ بنی ... کہ میرے پاس اگر کچھ ہے تو وہ میرے ماں باپ کی وجہ سے ہے۔ ان سے منسلک ہونا ہی میرے کسی بھی وصف کے اظہار کی وجہ ہے۔

قناعت اور دیانت کو خمیر میں شامل کرنا بھی مشکل ہے اور الگ کرنا بھی اتنا ہی دشوار' سوان خوبیوں کے دور رس اثرات کے فیض کا علم ہو یا نہ ہو' سرچشمہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ زمانے کے بہتے دھارے اور معاشرے کے عام چلن سے الگ چلنا ... آسان نہیں اور یہ مشکل پسندی تقدیر نے ہم پر واجب کررکھی ہے! گوکہ کبھی کبھی دشوار ہوجاتا ہے ... مگر پھر بھی اس منفرد راستے پر ابو کے نقش قدم کا شکریہ!

میں ڈائری لکھا کرتی تھی۔ ابو نے اخبار' رسالے مقرر کررکھے تھے اور نونہال میں ایک دفعہ حکیم سعید صاحب نے بچوں کو ڈائری لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ (راغب ہونے کی صلاحیت بھی قدرتی ہوتی ہے) میں نے اپنائی اور پھر سال گزرتے گئے ... ڈائری عادت بن گئی ... جہاں میں' وہاں ڈائری ... میں اور ڈائری ساتھ ساتھ ... بہت عرصہ رہے ... !

شعاع میں لکھنے کا موقع ایک خط نے فراہم کیا اور تب میں نے جانا کہ کچھ بھی ایک دم سے کبھی نہیں ہوا کرتا ... !

پھر میں نے پڑھنا شروع کیا ... امتل کے کہنے پر "سیر دو جہاں" پر روانہ ہوئی اور اس سفر میں جس صلاحیت کی بدولت میں نے لطف اٹھایا ... وہی مجھے ورثے میں منتقل ہوئی ہے!

گھر میں پڑھنے والوں کا مطالعہ میری نسبت بہت زیادہ ہے۔۔۔ لکھنا البتہ میرے حصے میں آگیا۔

(2) میں چونکہ کہانیاں نہیں لکھتی۔۔۔ اس لیے پڑھنے والوں کی تعداد نسبتاً" کم ہے۔ گھر میں امی ' بھائی ' بہن خوش ہوتے ہیں۔۔۔ رائے نہیں دیتے! اور کچھ عزیز تعلق ' خوشی کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی خوشی کا باعث ' خود کو سمجھ کر خوشی ہوتی ہے۔

(3) لکھنے سے پہلے ' پڑھنے کے مرحلے سے گزرتے وقت کا لطف ' اس سلسلے کی بدولت ہے۔ چونکہ مجھے اس پر لکھنا ہوتا ہے ' اس لیے ' اس کو سرسری نگاہ سے پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (سرسری مطالعے سے مطلوبہ نتائج نہیں مل سکتے نا) سو ' مجھے سب ہی کتابیں ' جن پر میں نے تبصرہ لکھا ' بے پناہ پسند ہیں۔

(4) خواتین میں ' ایک دفعہ میرا خط منتخب خطوط میں شائع ہوا تھا۔ (لکھنے کے سال بھر بعد) اس میں ' میں نے تفصیل سے اپنی پسندیدہ لکھاریوں کے نام اور اوصاف گنوائے تھے۔ ان میں سے تاحال صرف تنزیلہ ریاض ہیں جو لکھ رہی ہیں۔ باقی سب ٹی وی اور مصروفیت کو پیاری ہو چکی ہیں۔

تازہ ترین ' خوش گوار اضافہ ' سادگی و پرکاری کی مثال ' سائرہ رضا ہیں جن کی تحریر میں فطری روانی لطف دیتی ہے!

(5) کیونکہ یہ محبت نہیں ہے۔ جو صحرا کی طرح ساکت ہو اور نہ وہ محبت ہے۔ جو ہوا کی طرح دنیا بھر میں گھومتی پھرے۔ محبت وہ بھی نہیں جو ہر چیز کا دور سے مشاہدہ کرے ' جیسا کہ تم کر رہے ہو۔ محبت ایک ایسی طاقت ہے۔ جو تبدیل کرتی اور دنیا کی روح کو بڑھاتی ہے۔ جب میں پہلی بار اس تک پہنچا تو سوچا کہ دنیا کی روح بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں ' میں نے دیکھا کہ یہ بھی دوسری تخلیقات جیسی ہے اور اپنے جذبات رکھتی ہے۔ یہ ہم ہیں جو دنیا کی روح کو خوراک فراہم کرتے ہیں۔ اور وہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ یا تو بہتر ہو گی یا بدتر ' اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم خود اچھے یا برے نہیں اور یہ وہی چیز ہے ' جس سے محبت کی قوت

پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم جب محبت کرتے ہیں تو ہمیشہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے بہتر بنیں جیسے کہ ہیں۔"

(الکمسٹ۔پاؤلوکوئیلو)

عفت سحر طاہر

بہت عرصے بعد امتل نے پھر سے مصنفین کو بھی دوستوں کے ہی ہجوم بیکراں میں لا کھڑا کیا۔ سوالات دیکھ کر بہت پرانی بات یاد کر کے ہنسی آئی۔ یونہی ایک ڈائجسٹ کی طرف سے قارئین کے خطوط مجھے بھیجے گئے (انٹرویو کے لیے) میرے چھوٹے بھائی نے سوالات پڑھے۔ کھانے میں کیا پسند ہے' رنگ' خوشبو کون سی پسند ہے؟

"ہنہ۔۔۔ بڑی آئی ریما' میرا۔" یہ بھائی کا طنز تھا۔
اب آئیں جوابات کی طرف

(1) گھر کا ماحول سخت بے ادب۔ کسی کو بھی ادب سے لگاؤ نہیں۔ بس ایسے ہی بے ادب ماحول سے ایک "باادب" پودا پروان چڑھا جسے آپ عفت سحر طاہر کے نام سے جانتی ہیں۔ لکھنے کا شوق تھا۔ وراثت میں صرف ذہانت ملی (شاید) باقی سب اللہ کی دین ہے۔ جو چار سیدھی لائنیں لکھ لیتی ہوں۔

(2) جی بالکل۔ میری بہنیں اور اب بھانجیاں بہت شوق سے میری تحریریں پڑھتی ہیں۔ خاص طور پر شنزہ اور فرزینہ۔ اور شنزہ کو تو عادت ہے فون پر لمبے لمبے تبصرے کرنے کی۔ میری نند اور جیٹھانی بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں' مگر انہوں نے کبھی تبصرہ نہیں کیا (کیوں بھئی؟) خاندان۔۔۔؟ ابو اکلوتے تھے اور امی بھی اپنے والدین کی اکیلی اولاد۔ البتہ فرینڈز اور ان کی فیملی کی خواتین میرے رائٹر ہونے کے حوالے سے بہت محبت اور جوش سے ملتی ہیں۔ بہت تعریف کرتی ہیں۔ (جس کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔) مگر خوشی اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اس قابل بنایا کہ کوئی تعریف کرے ہماری۔

(3) جی۔۔۔ جب "دل دریا سمندروں ڈونگھے" لکھا۔ یا پھر کشمیر کے موضوع پہ "زنجیر بہاراں" لکھا۔ تب تب سکون تو کیا ملتا' ہاں رونا بہت آیا۔ اسی طرح خواتین میں "دست بے طلب میں۔" از میرٹ سیریز سب قارئین کے ساتھ میرا بھی فیورٹ ہے۔

پھول "لکھا۔ تو اچھا رسپانس ملا مجھے' اپنا ناول "محبت دل پہ دستک" بہت سی وجوہات کی بنا پر پسند ہے۔ اور یہ میرے دل کے بہت قریب بھی ہے۔ میرا پہلا طویل ترین قسط وار ناول' جس میں زندگی کی گہرائی تھی' سنجیدگی تھی رومینس اور بھرپور مزاح تھا۔

(4) میں پانچویں کلاس میں تھی تب سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ تب ہما کوکب بخاری' عنیزہ سید' رفعت سراج' رفعت ناہید سجاد' خالدہ اسد (مرحومہ) اقبال بانو' غزالہ نگار اور کرنئی وغیرہ کا طوطی بولتا تھا۔ (جگہ کم پڑ جائے اگر سب پیاری مصنفین کے نام لکھنے بیٹھوں) ان سب کی تحریروں سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔ فارحہ ارشد لمبے عرصے کے بعد اب فیس بک پہ دکھائی دیں۔ سائرہ رضا کے افسانے' سمیرا حمید کی ہر تحریر اور عمیرہ کے لکھے ہوئے (پہلے والے) ناولز پسند ہیں۔ سحر ساجد کی غریق رحمت نے دل کو چھوا۔ عنیزہ جی کو میں آج بھی بہت غور و فکر کے ساتھ پڑھتی ہوں۔

(5) اقتباس تو ڈھیروں ڈھیر ہیں جو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی رہتی تھی (جی ہاں۔۔۔ جب آتش جوان تھا)
"آدمی کو اپنے دل کو مارنا ضرور آنا چاہیے۔" تابندہ نے یاسیت بھرے افسوس سے کہا۔ "دل کی خواہشات در حقیقت نفس کا طمع ہوتی ہیں۔ اگر اس وقت میں اپنے دل کو مار لیتی تو آج مجھے اپنی عزت نفس کو نہ مارنا پڑتا۔" (سبز رتوں کی جھلمل میں' عفت سحر طاہر)

باقی بڑے لوگوں اور مصنفین نے تو اتنا کچھ کہا ہے کہ لکھتے لکھتے صفحات بھر جائیں۔ سو یار زندہ صحبت باقی۔
آپ سب کی محبتوں کا بہت شکریہ۔ اور تعریف کے لائق صرف اللہ کی ذات۔



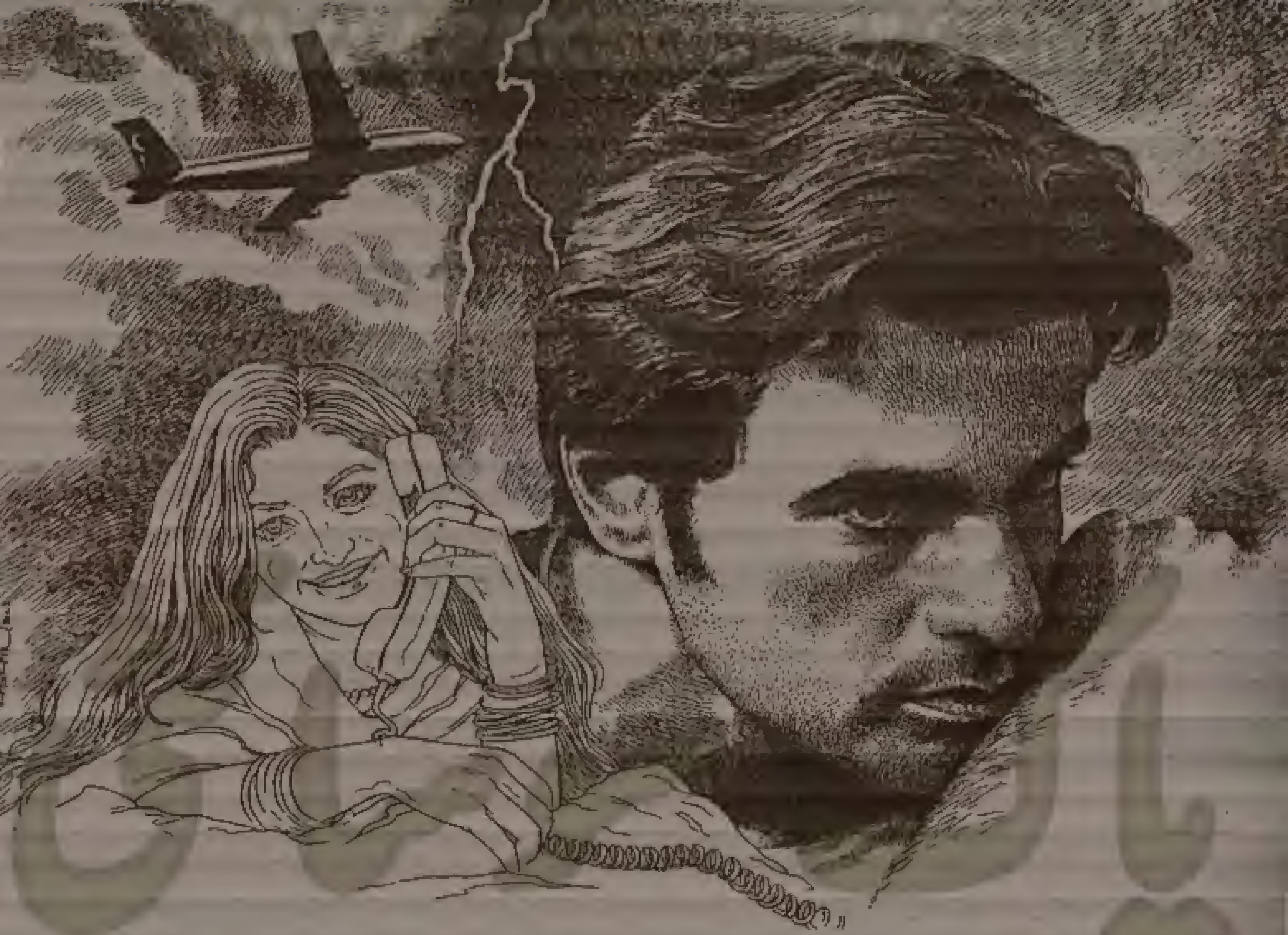
عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور اسعفی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔
8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔
10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار' احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔
Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔
K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔
3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے' امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے' سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان' طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط' امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار' امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔
ڈاکٹر سبط' سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً" روتے ہوئے وہی بتاتی ہے' جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں' پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو' کسی اور سے نہ کرنا' ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا' وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے کر آتا ہے' جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان، سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آکر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آجاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جاب یہاں ہے تو وہ مہینہ میں ایک دفعہ آجایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے، پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوئی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار، امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ انیتا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے جس میں سبزیوں کا فارم، فش فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکڑ کا ہونا چاہیے۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو میکے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے

بدگمانی آجاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلہ پر بحث کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ سالار کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی، لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے بری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاٹ بیچ کر تقریباً" ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں، پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی تھی یہ رنگ؟"

سالار بتاتا ہے کہ اس نے قیمتی ترین شاپ سے خاص طور پر یہ انگوٹھی ڈیزائن —— کروائی ہے۔ اور تھوڑی رقم بچی تھی جو اس نے خیراتی اداروں کو دے دی ہے۔ امامہ کو اس انگوٹھی کی قیمت کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔ سالار بھی اسے اصل قیمت نہیں بتاتا۔

امامہ کی ملاقات اتفاقا" جلال سے ہوتی ہے۔

جلال اسے لنچ کے لیے لے جاتا ہے۔ وہ یہ جان کر بہت مرعوب ہوتا ہے کہ وہ سالار سکندر کی بیوی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سالار جس عہدے پر ہے۔ وہاں اس نے خوب کمایا ہوگا۔ ریسٹورنٹ میں اچانک فاروق صاحب آجاتے ہیں۔ جلال کے امامہ کے تعارف کرانے پر وہ چونک جاتے ہیں۔ جلال سے مل کر امامہ بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ اس سے گاڑی بھی نہیں چلائی جاتی۔ وہ سالار کو فون کرتی ہے۔ فون آف ہوتا ہے۔ اس کی جوتی کا اسٹریپ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ تب وہ اس کے آفس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سالار کو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا کریڈٹ کارڈ بھی شاپنگ سینٹر میں بھول آئی ہے۔ وہ سالار کے آفس کے باتھ روم میں جا کر فریش ہوتی ہے اور اپنی قیمتی انگوٹھی وہاں بھول آتی ہے۔ اسے بعد میں بھی وہ انگوٹھی یاد نہیں آتی۔

دو دن بعد ایک ڈنر پر فاروق صاحب، سالار سے ملتے ہیں جب وہ اپنی بیوی کا تعارف کرانا چاہتا ہے تو وہ کہتے ہیں ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنچ کے دوران امامہ سے مل چکے ہیں۔

سالار یہ جان کر امامہ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ ناراضی میں اسے سعیدہ اماں کے ہاں بھجوا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سبط علی سالار کو بلاتے ہیں۔ وہ نہیں جاتا تو وہ امامہ سے تعلق ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ تب سالار ان کے پاس جاتا ہے اور امامہ سے معافی مانگ کر اسے اپنے گھر لے آتا ہے۔

ایک ہفتہ بعد سالار اسے یاد دلاتا ہے کہ امامہ انگوٹھی کہاں بھولی تھی۔ سالار، امامہ سے ایک معاہدہ پر دستخط کراتا ہے جس میں اسے سالار سے علیحدگی کی صورت میں بہت سے حقوق حاصل ہوں گے۔

ڈاکٹر سبط علی کا سلوک سالار کے ساتھ بہت روکھا ہو جاتا ہے۔ امامہ کو برا لگتا ہے، وہ ان سے کہتی ہے تب ڈاکٹر سبط علی اس کو نصیحت کرتے ہیں کہ عورت کو اپنا گھر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریسٹورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لا کر دیتا ہے ''آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔'' سالار جانے لگتا ہے' لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آ جاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

ساتویں قسط

سالار نے اپنا دفاع کرتے' اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے ہاشم مبین کو ذرا سا پیچھے دھکیلا۔ ان کے لیے یہ دھکا کافی ثابت ہوا۔ وہ پیر پھسلنے پر بے اختیار نیچے گرے۔ ریسپشن تب تک باہر موجود سیکیورٹی کو انفارم کر چکا تھا۔ ہال میں دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کچھ متوحش انداز میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جبکہ میزوں پر سرو کرتے ہوئے ویٹرز بے حد برق رفتاری سے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دھکے نے عظیم کو بھی یک دم مشتعل کر دیا۔ وہ بھی بلند آواز میں اسے گالیاں دیتے ہوئے جوش میں آگے آیا اور بے حد غیر متوقع انداز میں اس نے سالار کے جبڑے پر گھونسا دے مارا۔ چند لمحوں کے لیے سالار کی آنکھوں کے سامنے واقعی اندھیرا چھا گیا' وہ اس گھونسے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ذرا سا ایک طرف جھکا اور عظیم اس کے پیچھے کھڑی امامہ تک جا پہنچا۔ اس نے کانپتے ہوئے سالار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی' لیکن عظیم نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نہ صرف سالار سے الگ کرنے کی کوشش کی' بلکہ اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کیا۔ سالار تب تک سنبھل کر سیدھا ہوتے ہوئے اسے چھڑانے کے لیے پلٹا تھا۔ جب اس کے بائیں کندھے کی پشت پر درد کی تیز لہر اٹھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخ روکی۔ وہ ہاشم مبین تھے جنہوں نے ٹیبل پر پڑا چاقو اس کی پشت میں مارنے کی کوشش کی' لیکن آخری لمحے میں ہلنے کی وجہ سے وہ اس کے بائیں کندھے میں جا لگا تھا۔

سیکیورٹی اور دوسرے ویٹرز تب تک قریب پہنچ چکے تھے۔ سالار نے اپنے کندھے کی پشت سے وہ چاقو نکال لیا۔ سیکیورٹی والے اب ان تینوں کو پکڑ چکے تھے۔ وہ چاقو نوک دار ہوتا تو زخم بے حد خطرناک ہوتا' لیکن اب بھی اس چاقو کا اگلا سرا اس کے کندھے کے گوشت میں دھنسا ہوا تھا۔ امامہ نے نہ تو ہاشم مبین کو سالار کو وہ چاقو مارتے دیکھا تھا' نہ ہی اس نے سالار کو وہ چاقو نکالتے دیکھا۔ سیکیورٹی والوں نے سالار کو عظیم سے چھڑاتے ہوئے' عظیم کو اپنی گرفت میں لے لیا' تب تک سالار اپنی جینز کی جیب سے سیل نکال کر سکندر کو فون پر وہاں آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے' لیکن وہ اس کے باوجود اپنے لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے سکندر سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی پشت کے اس زخم کو دبائے ہوئے تھا۔ اس کے دبانے اور محسوس کرنے کے باوجود اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے کندھے سے کمر تک خون کی نمی محسوس کر رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خون کتنی مقدار میں نکل رہا تھا۔

سیکیورٹی والے اس گفتگو کے دوران ہاشم مبین' وسیم اور عظیم کو وہاں سے لے جا چکے تھے۔ ریسٹورنٹ کے پورے ہال میں بے حد سراسیمگی کا عالم تھا۔ کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور جو ابھی وہاں موجود تھے' وہ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''آپ کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہو گی' آپ آ جائیں۔'' منیجر نے اس کی پشت پر بہنے والے خون کو دیکھتے ہوئے کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا۔ اس نے یقیناً یہ سوچا ہو گا کہ ہال کا ماحول ان کی موجودگی میں نارمل نہیں ہو سکتا تھا۔

امامہ نے منیجر کی اس بات پر کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا' وہ اب فون پر بات ختم کر رہا تھا۔ امامہ نے اس کے اس ہاتھ کو پہلی بار نوٹس کیا جو وہ کندھے کے اوپر سے بھینچے ہوئے تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" امامہ نے قدرے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سالار نے اپنا بازو سیدھا کیا۔ امامہ نے اس کی خون آلود انگلیاں دیکھیں۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کا ہاتھ زخمی تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے کچھ حواس باختہ ہو کر پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ایک قریبی ٹیبل سے نیپکن اٹھا کر اپنا ہاتھ صاف کرتے ہوئے امامہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ منیجر اور سیکیورٹی کے چند لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ منیجر کے کمرے میں آگئے۔ وہ پولیس کو کال کر چکا تھا اور اب وہ پولیس کے آنے تک انہیں وہاں روکنا چاہتا تھا لیکن سالار زخمی تھا اور اسے فرسٹ ایڈ دینا ضروری تھی۔

منیجر کے کمرے میں پہنچ کر ہی امامہ نے پہلی بار سالار کی خون آلود پشت دیکھی اور وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ ایک قریبی کلینک سے پہنچنے والی ایمبولینس کے آنے تک انہوں نے اس کی شرٹ اتار کر اس کا خون روکنے کی کوشش کی مگر زخم گہرا تھا اور ٹانکوں کے بغیر ٹھیک ہونا مشکل تھا۔

وہ اس قدر شاکڈ تھی کہ وہ ریسٹورنٹ کے عملے کے افراد کی فرسٹ ایڈ اور سالار کو گم صم دیکھتی رہی۔ وہ کیا کچھ کر سکتی تھی یا اسے کیا کرنا چاہیے تھا' اسے سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔

اگلے پانچ سات منٹ میں پولیس' ایمبولینس اور سکندر آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔

سکندر کے آتے ہی سالار نے امامہ کو گھر کے بجائے فوری طور پر کہیں اور بھیجنے کے لیے کہا۔ سکندر خود سالار کو ہاسپٹل لے کر جارہے تھے۔ چاہنے کے باوجود وہ سالار سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

سکندر نے اسے فوری طور پر اپنے بڑے بھائی شاہنواز کے گھر ڈرائیور اور پولیس کی سیکیورٹی میں بھجوایا تھا۔ شاہنواز کی فیملی گھر پر نہیں تھی۔ عجلت میں انہوں نے نوکروں کو امامہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور سکندر کی طرف چلے گئے۔

وہ بت کی طرح آکر گیسٹ روم میں بیٹھ گئی۔ اسے سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ سالار کو کسی نے چاقو سے زخمی کیا تھا' یہ اس نے سن لیا تھا مگر یہ اس کے باپ نے کیا تھا یا بھائیوں میں سے کسی نے ــــ یہ وہ نہیں جان سکی تھی۔ ریسٹورنٹ کی سیکیورٹی نے ہاشم' وسیم اور عظیم کو پولیس کے آنے تک ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اور اس کے بعد اب آگے کیا ہونے والا تھا' اسے سوچتے ہوئے بھی اسے اپنا وجود مفلوج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے ابھی آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سالار کی کال آئی۔

"تم پہنچ گئی ہو؟" اس نے امامہ کی آواز سنتے ہی کہا۔

"ہاں ــــ تم کہاں ہو؟"

"ابھی کلینک پر ہوں۔" سالار نے اسے کہا۔

"اور ابو ــــ؟"

"پاپا ساتھ ہیں میرے۔" سالار نے اس کے لفظوں پر غور نہیں کیا تھا۔

"میں اپنے ابو کا پوچھ رہی ہوں؟" امامہ نے بے ساختہ کہا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا۔

اسے نا چاہتے ہوئے بھی اس وقت امامہ کی ہاشم کے بارے میں تشویش بری لگی۔

"وہ تینوں پولیس کسٹڈی میں ہیں۔۔۔ یہاں سے فارغ ہو کر اب ہم وہیں جائیں گے۔" امامہ کا دل ڈوبا۔
باپ اور بھائیوں کے حوالات میں ہونے کے تصور نے چند لمحوں کے لیے اسے سالار کے زخمی ہونے کے بارے میں بالکل لاپروا کر دیا۔

"سالار! پلیز! انہیں معاف کر دو اور ریلیز کروا دو۔"

سکندر اس وقت اس کے پاس تھے۔ وہ امامہ سے کچھ کہہ نہیں سکا لیکن وہ خفا ہوا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اپنی فیملی کے لیے پریشان تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اس نے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اب کیسا ہے اور اس کی بینڈیج ہو گئی یا زخم گہرا تو نہیں تھا؟

"میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" اس نے کچھ کہنے کے بجائے فون بند کر دیا تھا۔

کلینک میں اس کے چیک اپ اور بینڈیج میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کی۔۔۔ کسی رگ یا شریان کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

کلینک میں ہی سکندر کی فیملی کے افراد نے پہنچنا شروع کر دیا اور سالار کو سکندر کے اشتعال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ بہت سنجیدہ نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ خود بے حد ناراض ہونے کے باوجود اس معاملے کو ختم کرنے کا خواہش مند تھا لیکن سکندر نہیں۔

شاہنواز کی بیوی اور دونوں بہوئیں آدھے گھنٹے کے بعد گھر آئی تھیں اور تب تک طیبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ سکندر نے فی الحال اپنے گھر میں نہ رہنا بہتر سمجھا تھا۔

شاہنواز کی بیوی اور بہوؤں نے اگرچہ امامہ سے اس ایشو پر زیادہ بات نہیں کی تھی، لیکن وہ لاؤنج میں طیبہ اور ان لوگوں کی بلند آواز میں ہونے والی باتیں سنتی رہی۔ طیبہ بری طرح برہم تھیں۔ وہ شاہنواز کے گھر آنے کے باوجود امامہ کے پاس نہیں آئیں۔ وہ خود بھی اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ باہر نکل کر ان کا سامنا کرتی۔ وہ بے حد غصے میں ہاشم مبین اور اس کے بھائیوں کو برا بھلا کہتی رہیں اور وہ گیسٹ روم میں بیٹھی ہچکیوں سے روتے ہوئے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ یہ طیبہ کے کڑوے کسیلے جملے یا خاندان کے سامنے ہونے والی سبکی نہیں تھی، یہ احساس تھا کہ ہاشم اور اس کے بھائی اس وقت حوالات میں بند تھے اور نجانے ان کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی فیملی بے حد بارسوخ تھی اور حوالات میں کوئی ان کے ساتھ عام مجرم کی طرح کا رویہ نہیں رکھ سکتا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کی فیملی کا حوالات میں رہنا ہی بے حد بے عزتی کا باعث ہے۔

اس نے دوبار سالار سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کی کال نہیں لی اور دوسری بار اس کا سیل بند تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس نے اسی کی کال سے بچنے کے لیے فون بند کیا ہو گا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے اپنا سیل فون اس کی وجہ سے آف کیا ہوا تھا۔

"کیوں persue (پیروی) نہ کروں اس کیس کو۔۔۔؟ انہیں چھوڑ دوں تاکہ اگلی بار وہ تمہیں شوٹ کر دیں۔"
اس نے ہسپتال سے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے گاڑی میں سکندر سے کہا تھا۔ "میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔"

"بات بڑھ چکی ہے اور اس سب کی ابتدا بھی انہوں نے کی ہے۔" سکندر بے حد مشتعل تھے۔

"پاپا! وہ امامہ کی فیملی ہے۔" اس نے بالآخر کہا۔

"نہیں، وہ امامہ کی فیملی تھی، انہیں اگر امامہ کی پروا ہوتی تو وہ اس کے شوہر پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتے اور اگر انہیں امامہ کی پروا نہیں ہے تو امامہ کو بھی ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔"

انہوں نے ہین السطور کیا کہا تھا' سالار کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔
"یہ ایک حد تھی جو میں کبھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پار کریں' لیکن انہوں نے یہ حد پار کرلی ہے۔ میری فیملی میں سے کسی کو تکلیف پہنچے گی تو میں ہاشم فیملی کو کسی سیف ہیون میں نہیں رہنے دوں گا۔

I'll pay them in the same coin.

(میں انہیں ان ہی کی زبان میں جواب دوں گا)
یہ بات تم اپنی بیوی کو بتا بھی دو اور سمجھا بھی دو۔"
"پاپا! پلیز' اس ایشو کو حل ہونا چاہیے۔" سالار نے باپ سے کہا۔
سکندر کا یہ مشتعل رویہ اسے خائف کرنے لگا تھا۔ وہ بے حد متحمل مزاج تھے لیکن اس وقت سالار ان کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔

"یہ خواہش ان کو کرنی چاہیے۔۔۔ صرف تب یہ مسئلہ حل ہوگا۔

How dare he touch my son

(اسے میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی ہمت بھی کیسے ہوئی) اس کا خیال ہے میں برداشت کروں گا یہ غنڈہ گردی۔۔۔؟ یہ وہ مجھے پولیس اسٹیشن سے نکل کر دکھائے۔"
انہیں ٹھنڈا کرنے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ معاملہ کس حد تک بڑھ جائے گا' اس کا اندازہ سالار کو نہیں تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں جہاں اس کی فیملی پولیس اسٹیشن میں آگئی تھی' وہاں ہاشم مبین کی بھی پوری فیملی وہاں موجود تھی۔
یہ صرف دو بار سوخ فیملیز کا مسئلہ نہیں رہا تھا' یہ کمیونٹیز کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اسلام آباد پولیس کے تمام اعلا افسران اس معاملے کو حل کرانے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہاشم مبین کو سب سے بڑی مشکل اس ریسٹورنٹ کی انتظامیہ کی وجہ سے ہو رہی تھی جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ یہ سب کہیں اور ہوتا تو وہ بھی جواباً" سالار اور اس کی فیملی کے خلاف دس بارہ ایف آئی آر رجسٹر کروا چکے ہوتے' لیکن ہال میں لگے سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ ہاشم مبین کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔
ابتدائی غصے اور اشتعال کے دورے کے بعد بالآخر ہاشم فیملی نے واقعے کی سنگینی کو محسوس کرنا شروع کردیا' مگر مسئلہ یہ ہو رہا تھا کہ سکندر فیملی کسی قسم کی لچک دکھانے پر تیار نہیں تھی۔
فجر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا اور وہ بالآخر گھر واپس آگئے۔
وہ واپسی پر سارے راستے سکندر کو کیس واپس لینے پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس میں ناکام رہا تھا۔ سکندر اب اس معاملے میں اپنے بھائیوں کو شامل کرنے کے بعد سب کچھ اتنے آرام سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔
وہ شاہنواز کے گھر آنے سے پہلے اپنے گھر سے' اپنے اور امامہ کے کچھ کپڑے لے آیا تھا۔ شاہنواز کے گھر گیسٹ روم میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے پوچھا تھا۔
"ابو اور بھائی ریلیز ہوگئے؟" اس کا دماغ گھوم گیا تھا' تو واحد چیز جس کی اسے پروا تھی وہ صرف اتنی تھی کہ اس کے باپ اور بھائی رہا ہو جائیں۔ اس کا زخم کیسا تھا؟ اس کی طبیعت ٹھیک تھی؟ اسے ان میں سے جیسے کسی بات میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔
"نہیں۔ اور ہوں گے بھی نہیں۔" وہ بے حد خفگی سے کہتے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں

گیا تھا۔ پین کلرز لینے کے باوجود اس وقت تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کی حالت واقعی خراب تھی اور رہی سہی کسر امامہ کی عدم توجہی نے پوری کردی تھی۔
"وہ پولیس اسٹیشن میں ہیں؟" اس کے واش روم سے نکلتے ہی اس نے سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔
وہ اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
"کیس واپس لے لو سالار.... انہیں معاف کردو۔" اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ملتجیانہ انداز میں اس سے کہا۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔
"امامہ! میں اس وقت سونا چاہتا ہوں' تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"
"میرے ابو کی کتنی عزت ہے شہر میں' وہ وہاں کیسے ہوں گے اور کیسے برداشت کر رہے ہوں گے یہ سب کچھ ۔" وہ رونے لگی تھی۔
"عزت صرف تمہارے ابو کی ہے؟ میری' میرے باپ' میری فیملی کی کوئی عزت نہیں ہے؟"
وہ بے ساختہ کہہ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے ہونٹ کاٹتے ہوئے روتی رہی۔
"یہ سب میرا قصور ہے' میری وجہ سے ہوا ہے یہ سب کچھ' مجھے تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"
"تمہارے پاس ہر چیز کی وجہ صرف شادی ہے۔ تم مجھ سے شادی کرکے جہنم میں آگئی ہو' شادی نہ ہوئی ہوتی تو جنت میں ہوتیں تم؟ ہے نا۔" وہ بری طرح برہم ہوا تھا۔
"میں تمہیں تو الزام نہیں دے رہی' میں تو....." اس نے خائف ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا۔
"Show me some loyalty Imama"
(کچھ میرے ساتھ بھی وفاداری کا مظاہرہ کرو)... ویسی وفاداری جیسی تم اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے دکھا رہی ہو۔" وہ بول نہیں سکی تھی۔ اس نے جیسے اسے جوتا کھینچ مارا تھا' اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اسے کبھی اتنی ہرٹ کرنے والی بات کہہ سکتا تھا لیکن وہ اسے کہہ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر اس کے بستر سے اٹھ گئی۔ سالار نے اس کو روکنے کے بجائے آنکھیں بند کرلی تھیں۔
دوبارہ اس کی آنکھ دوپہر ساڑھے بارہ بجے کندھے میں ہونے والی تکلیف کی وجہ سے کھلی تھی۔ اسے ٹمپریچر بھی ہو رہا تھا۔ کندھے کو حرکت دینا مشکل ہو رہا تھا اور بستر سے اٹھتے ہی اس کی نظر امامہ پر پڑی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ رکے بغیر اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔
نہا کر تیار ہونے کے بعد وہ باہر نکلا اور امامہ سے کوئی بات کیے بغیر وہ بیڈ روم سے چلا گیا۔ اسے اپنا آپ وہاں اجنبی لگنے لگا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس کی سپورٹ تھا اور وہ بھی اس سے برگشتہ ہو رہا تھا۔
"میں کیس واپس لے رہا ہوں۔" لنچ ٹیبل پر بیٹھے اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ پورے ٹیبل پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہاں سکندر کے ساتھ ساتھ شاہنواز اور ان کی فیملی بھی تھی۔
"میں نے اس پورے معاملے کے بارے میں سوچا ہے اور....."
طیبہ نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹی تھی۔
"تم سوچنا کب کا چھوڑ چکے ہو' یہ تمہاری بیوی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہوگی۔"
"ممی! امامہ کو اس پوری equation میں سے نکال دیں۔"
"اچھا۔ تو پھر تم اسے طلاق دے دو' یہ سارا معاملہ ہی ختم ہوجائے گا۔"

اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس رکھ دیا۔
یہ میں نہیں کر سکتا اور یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔"
تو پھر ہم بھی وہ نہیں کریں گے جو تم چاہتے ہو۔ امامہ کا باپ اور بھائی جیل میں ہی رہیں گے۔" طیبہ نے بھی
کے انداز میں کہا۔
تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ سارا معاملہ کتنا بڑھ چکا ہے۔ کیس واپس لینے کا مطلب ان کو شہ دینا ہے۔ تم
فیملی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔" شاہنواز نے مداخلت کی۔
رسک تو کیس چلنے کی صورت میں بھی ہو گا' بلکہ زیادہ ہو گا۔ یہ کیس تو مسئلہ حل نہیں کرے گا۔"
وہ جانتا تھا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا' اس سے پوری فیملی کی کتنی لعنت ملامت اسے ملنے والی تھی۔ وہ سب کچھ اس
لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ امامہ کو خوش کر سکتا تھا یا اپنی فیملی کو اور اپنی فیملی کو ناخوش کرنا اس کے لیے بہتر تھا۔
وہ اندر کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی لیکن اب وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے' وہ سمجھ
پا رہی تھی۔ ملازم بالآخر اسے کھانے کے لیے پوچھنے آیا اور وہ شدید بھوک کے باوجود نہیں گئی۔ وہ لنچ ٹیبل پر
کی اس وقت ہمت ہی نہیں رکھتی تھی اس سے بھوکا مرنا زیادہ بہتر تھا۔
وہ رات کے نو بجے تک اسی طرح کمرے میں بیٹھی رہی۔ سالار کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ کوئی کال' کوئی میسج
۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھکن کے عالم میں کب سو گئی' اسے اندازہ نہیں ہوا۔
رات گئے اس کی آنکھ سالار کے کندھا ہلانے پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا گئی تھی۔
"اٹھ جاؤ' ہمیں جانا ہے۔" وہ کمرے سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔
وہ کچھ دیر بیٹھی اپنی آنکھیں رگڑتی رہی۔
"کیس واپس لے لیا ہے میں نے' تمہاری فیملی ریلیز ہو گئی ہے۔" وہ ٹھٹکی تھی۔
وہ بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔ کسی نے جیسے امامہ کے کندھوں سے منوں بوجھ ہٹایا تھا۔ اس کے چہرے پر آنے
والا اطمینان وہ بھی نوٹس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔
اس کے پیچھے باہر لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے ماحول میں موجود تناؤ اور کشیدگی محسوس کی تھی۔ شاہنواز اور
سکندر دونوں بے حد سنجیدہ تھے اور طیبہ کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ وہ نروس ہوئی تھی۔ وہاں سے رخصت ہوتے
ہوئے اس نے صرف اپنے لیے نہیں شاہنواز کے رویے میں سالار کے لیے بھی سرد مہری محسوس کی تھی۔
وہ سالار کے ساتھ جس گاڑی میں تھی اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ سکندر اور طیبہ دوسری گاڑی میں تھے۔ سالار
سارا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھنے کے باوجود اسے مخاطب
کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔
گھر پہنچنے کے بعد بھی سب کی خاموشی اور سرد مہری ویسی ہی تھی۔ سالار' سکندر اور طیبہ کے ساتھ لاؤنج میں
رک گیا اور وہ کمرے میں چلی آئی تھی۔
آدھے گھنٹے کے بعد ملازم اسے کھانے پر بلانے آیا تھا۔
"تم مجھے یہیں پر کھانا دے دو۔" بھوک اس قدر شدید تھی کہ اس بار وہ کھانے سے انکار نہیں کر سکی۔ ملازم کی
واپسی دو منٹ بعد ہی ہو گئی تھی۔
"سالار صاحب کہہ رہے ہیں' آپ باہر سب کے ساتھ آکر کھانا کھائیں۔"
وہ کچھ دیر بیٹھی رہی' یہ بلاوا کچھ غیر متوقع تھا۔ ٹیبل پر سکندر' طیبہ اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بیٹھ کر

کھانا کھانا اس وقت بہت مشکل تھا۔ وہ کھانا اندر لانے گئے لیکن نہ کھا چکی ہوتی تو اس وقت بھوک نہ ہونے کا بہانا کر دیتی لیکن اب یہ مشکل تھا۔

ہمت کرتے ہوئے جب وہ بالآخر ڈائننگ روم میں آئی تو سب ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کامران کی بیوی زوبا' طیبہ سے کچھ بات کر رہی تھی' اس کی آمد پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ صرف سالار اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالے بغیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے پر اسی نے اس سے پوچھتے ہوئے چاول کی ڈش اس کی طرف بڑھائی تھی اور پھر کھانے کے دوران وہ بغیر پوچھے کچھ نہ کچھ اس کی طرف بڑھاتا گیا۔ وہ ٹیبل پر ہونے والی بات چیت خاموشی سے سنتی رہی اور شکر ادا کرتی رہی کہ وہ اس سے متعلقہ نہیں تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایشو اب اس لیے زیر بحث نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اس حوالے سے ان سب کی لعنت و ملامت سمیٹ چکا تھا۔

ماحول آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا۔ طوفان گزرنے کے بعد اب اس کے اثرات بھی معدوم ہونے لگے تھے۔

وہ کھانے کے بعد بیڈ روم میں سالار کے ساتھ ہی آئی۔ وہ ایک بار پھر بات چیت کیے بغیر بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ اندھیرے میں کچھ دیر بستر پر بیٹھی رہی' پھر اس نے جیسے مصالحت کی پہلی کوشش کی۔

"سالار!" آنکھیں بند کیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا جواب دے یا نہ دے۔

"سالار!"

"بولو۔" بالآخر اس نے کہا۔

"زخم گہرا تو نہیں تھا؟" نرم آواز سے اس نے پوچھا۔

"کون سا والا؟" ٹھنڈے لہجے میں کیا ہوا سوال اسے لاجواب کر گیا تھا۔

"تمہیں درد تو نہیں ہو رہا؟" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوال بدلا تھا۔

"اگر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا زخم ہے۔ میرا درد ہے۔"

اب جواب نے اسے لاجواب کیا تھا۔

"بخار ہو رہا ہے تمہیں کیا؟" اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹ کر پیشانی پر گیا تھا۔ بات بدلنے کے لیے وہ اور کیا کرتی۔ اس کا ہاتھ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے سالار نے اسی ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔

"امامہ! تم وہ کیوں نہیں پوچھتیں' جو پوچھنا چاہتی ہو۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے کہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے کچھ بے بسی سے دیکھتی رہی' پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابو سے کیا بات ہوئی تمہاری؟"

"وہ بتاؤں جو میں نے ان سے کہا یا وہ جو انہوں نے مجھ سے؟" انداز اب بھی تیکھا تھا۔

"انہوں نے کیا کہا تم سے؟" اس نے جواب میں ہاشم مبین کی گالیوں کو بے حد ہلنٹ انداز میں انگلش میں ٹرانسلیٹ کیا تھا۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں گالیوں کا نہیں پوچھ رہی' انہوں نے ویسے کیا کہا تھا تم سے؟"

اس نے کچھ خفگی اور سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اوہ! سوری' ان کی گفتگو میں ستر فیصد گالیاں تھیں' اگر میں بہت مختصر بھی کروں تو بھی کتنا ایڈٹ کر سکتا ہوں۔ بہرحال باقی باتوں میں انہوں نے مجھے کہا کہ میں سور ہوں' لیکن کتے کی موت مروں گا اور جو کچھ میں نے ان کی بیٹی کے ساتھ کیا ہے' وہ میری بیٹی اور بہن کے ساتھ ہو۔ اس کے لیے وہ خصوصی طور پر دعا یا بددعا فرمائیں گے۔ تمہارے لیے بھی ان کے کچھ پیغام ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ میں تمہیں دوں۔ یہ تھی ان کی گفتگو۔"

وہ نم آنکھوں کے ساتھ گنگ بیٹھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
وہ اپ سیٹ تھا اس کا اندازہ لگانا آسان تھا لیکن وہ کتنا ہرٹ ہوا تھا' یہ بتانا مشکل تھا۔
"انہوں نے تم سے ایکسکیوز نہیں کی؟" بھرائی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔
"کی تھی انہوں نے' انہیں بڑا افسوس تھا کہ ان کے پاس اس وقت کوئی پسٹل کیوں نہیں تھا یا کوئی اچھا والا چاقو' کیونکہ وہ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر بے حد ناخوش تھے۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
"پھر تم نے کیس کیوں ختم کیا؟"
"تمہارے لیے کیا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی تھی۔
"میں تم سے اور تمہاری فیملی سے کتنی شرمندہ ہوں' میں نہیں بتا سکتی تمہیں... اس سے تو اچھا تھا کہ وہ مجھے مار دیتے۔"
"میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟" وہ سنجیدہ تھا۔
"نہیں' لیکن تم مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہے' کوئی بھی نہیں کر رہا۔"
"میں کل رات سے خوار ہو رہا ہوں' پریشان تھا۔ مجھے تو تم رہنے دو' مجھے تم سے اس حوالے سے کوئی شکایت نہیں ہے' لیکن جہاں تک میری فیملی کا تعلق ہے تو تھوڑا بہت تو ری ایکٹ کریں گے۔
That's but natural وہ... (یہ فطری بات ہے) دو چار ہفتے گزریں گے' سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"
اس نے رسانیت سے کہا تھا۔
امامہ نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"میری کوئی عزت نہیں کرتا۔"
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کسی نے تم سے کچھ کہا؟ پاپا نے؟ ممی نے یا کسی اور نے؟"
"کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن..."
سالار نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "اور کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں تم سے' جس دن کوئی تم سے کچھ کہے' تم تب کہنا کہ تمہاری کوئی عزت نہیں کرتا۔" وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔
"میں تمہیں کبھی اپنے باپ کے گھر میں بھی لے کر نہ آتا اگر مجھے یہ خدشہ ہوتا کہ یہاں تمہیں عزت نہیں ملے گی۔ تم سے شادی جیسے بھی ہوئی ہے تم میری بیوی ہو اور ہمارے سرکل میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے یہ پتا نہیں ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو۔"
اس نے قدرے جھڑکنے والے انداز میں اس سے کہا۔
"ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ ہے... سو جاؤ اب۔" اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔
وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے ڈیڑھ دن میں جان لیا تھا کہ وہ دنیا میں کتنی محفوظ اور غیر محفوظ تھی۔ اس کے پاؤں کے نیچے زمین اس کے وجود کی وجہ سے تھی۔ اس کے سر پر سایہ دینے والا آسمان بھی اسی کی وجہ سے تھا۔ اس کا نام اس کے نام سے ہٹ جاتا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لیے کھڑا ہونے والا نہیں تھا۔
زندگی میں اس سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود' وہ ہمیشہ اس کی مدد اور سہارے کے لیے محتاج رہی تھی اور اس تعلق کے بعد یہ محتاجی بہت بڑھ گئی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی یہ پرواہ کیے

بغیر کہ اس کے سر رکھنے سے اس کے کندھے میں تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی وہ اسے کبھی نہیں ہٹائے گا اور سالار نے اسے نہیں ہٹایا تھا۔ بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے لائٹ آف کر دی۔

"ممی ٹھیک کہتی ہیں۔" اس کے سینے پر سر رکھے اس نے سالار کو بڑبڑاتے سنا۔

"کیا؟" وہ چونکی تھی۔

"تم نے مجھ پر جادو کیا ہوا ہے۔" وہ ہنس پڑی تھی۔



اس واقعے کے بعد اگلے چند ہفتے وہ لاہور میں بھی کچھ محتاط رہے' لیکن آہستہ آہستہ جیسے ہر ڈر' خوف ختم ہونے لگا۔ امامہ کی فیملی کی طرف سے اس بار اس طرح کی دھمکیاں بھی نہیں ملی تھیں' جیسی امامہ کے گھر سے چلے جانے پر سکندر کی فیملی کو ملتی رہی تھیں۔ فوری اشتعال میں آکر ہاشم اور ان کے بیٹے ان پر حملہ کرنے کی غلطی تو کر بیٹھے تھے' لیکن بہت جلد ہی انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ امامہ کو زبردستی واپس لے جانا' اب ان کے مسائل کو بڑھا سکتا تھا' کم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جھوٹ جو امامہ کے حوالے سے انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں بول رکھے تھے' ان کے کھل جانے کا مطلب رسوائی اور جگ ہنسائی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ ایک پردہ پڑا ہوا تھا' اسے پڑا رہنے دینا زیادہ سمجھ داری تھی۔ ان کا واسطہ سکندر جیسی فیملی سے نہ پڑتا تو وہ اس معاملے پر اپنی انا کو اتنا نیچے نہ لاتے' لیکن یہاں اب مجبوری تھی۔

پولیس اسٹیشن میں تصفیہ کے دوران سکندر نے ہاشم مبین کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ سالار اور امامہ کو کسی بھی طرح پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری وہ ہاشم کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں ڈالیں گے۔ عام حالات میں ہاشم اس بات پر مشتعل ہوتے لیکن ایک رات حوالات سے نکلنے کے لیے ہر طرح کے اثرورسوخ استعمال کر کے ناکام ہونے کے بعد ان کا جوش' ہوش میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

جہاں تک سالار اور امامہ کا تعلق تھا' ان کے لیے یہ سب کچھ blessing in disguise تھا۔ (شر میں سے خیر) وہ خدشات جن کا شکار وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران ہوتے تھے' وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے تھے اور یہ خاص طور پر امامہ کے لیے معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اتنی آزادی کے ساتھ رہ سکے گی۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا۔ چند ہفتوں میں اس کی فیملی کا رویہ پھر پہلے جیسا ہی ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ طیبہ کی تلخی بھی ختم ہو گئی تھی اور اس میں زیادہ ہاتھ امامہ کا ہی تھا۔ وہ فطرتاً صلح جو اور فرمانبردار تھی' رہی سہی کسر اس کے حالات نے پوری کر دی تھی۔ پیچھے میکہ ہوتا تو شاید کوئی بات بری لگنے پر وہ بھی اسی طرح موڈ آف کرتی جس طرح سکندر کی دوسری بہوئیں کبھی کبھار کرتی تھیں' مگر پیچھے ہی کچھ کے سوا کچھ نہیں تھا اور احسان مند ہونے کے لیے اتنا بھی بہت تھا کہ وہ اس شخص کی فیملی تھی جو اسے سر پر اٹھائے پھرتا تھا۔



"کوئی وسیم ہاشم صاحب ملنا چاہ رہے ہیں آپ سے؟" اپنے آفس کی کرسی میں جھولتا سالار کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے ایک لمحہ میں اپنے کانٹیکٹس کی لسٹ کھنگالی تھی اور وہاں صرف ایک وسیم ہاشم تھا۔

"اسلام آباد سے... کہہ رہے ہیں کہ آپ کے دوست ہیں۔" ریسپشنسٹ نے مزید بتایا۔

"بھیج دو۔" اس نے انٹر کام رکھ دیا اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آج کے دن وہ ایسے کسی وزٹ کے لیے تیار نہیں تھا۔ وسیم کے وہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو چند ہفتے گزر چکے تھے۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تب ہی وسیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں ساکت ہوئے تھے پھر سالار نے ہاتھ بڑھایا۔ وسیم نے بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان دونوں کے درمیان ہونے والی وہ پہلی ملاقات تھی۔

"کیا لو گے؟ چائے' کافی؟" سالار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں... میں صرف چند منٹ کے لیے آیا ہوں۔" وسیم نے جواباً" کہا۔ وہ دونوں کسی زمانے میں بہت گہرے دوست تھے' لیکن اس وقت ان کو اپنے درمیان موجود تکلف کی دیوار کو ختم کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

سالار نے دوبارہ کچھ پوچھنے کے بجائے انٹر کام اٹھا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔

"امامہ کیسی ہے؟" اس کے ریسیور رکھتے ہی وسیم نے پوچھا۔

"ٹھیک از فائن۔" سالار نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا تھا' ایڈریس تھا میرے پاس تمہارے گھر کا لیکن میں نے سوچا' پہلے تم سے پوچھ لوں۔" وسیم نے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے' تمہیں یہ پتا چل سکتا ہے کہ میں کہاں کام کر رہا ہوں تو ہوم ایڈریس جاننا زیادہ مشکل تو نہیں ہے۔" سالار نے بے حد معمول کے لہجے میں اس سے کہا۔

"میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔" وسیم نے کہا۔

"مناسب تو شاید نہ لگے' لیکن پھر بھی پوچھوں گا تم سے... کس لیے۔" سالار نے جواباً" بڑے فرینک انداز میں کہا۔

"کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس۔" وسیم نے جواباً" کہا۔ "اس دن ریسٹورنٹ میں جو چٹ..."

"وہ تم نے بھیجی تھی' میں جانتا ہوں۔" سالار نے اس کی بات کاٹی تھی' وسیم ایک لمحہ کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے کہا۔

"تم نے اور امامہ نے جو کچھ کیا' وہ بہت غلط کیا۔" وسیم چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولنے لگا تھا۔ سالار نے اس کی گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"لیکن اب جو بھی ہوا' وہ ہو چکا۔ میں امامہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری فیملی کو پتا ہے؟" سالار نے پوچھا۔

"نہیں' نہیں پتا چلے گا تو وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔" سالار اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اس کا سچ اور جھوٹ نہیں جانچ سکتا تھا۔ اس کی نیت کیا تھی۔ وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اور امامہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات وسیم نے اسے امامہ کے ساتھ دیکھ کر اسے باپ

بھائی کے دیکھے جانے سے پہلے متنبہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سالار کے لیے پھر بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اسے امامہ سے ملنے کی اجازت دے دیتا۔ اس میل جول کا پتا چلنے پر امامہ کی فیملی کے لیے اسے نقصان پہنچانا بہت آسان ہو جاتا۔ وہ اگر اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچ سکتے تھے تو وہاں سے امامہ کو کہیں اور لے جانا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وسیم کسی غلط ارادے سے اس کے پاس نہیں آیا تھا لیکن وہ پھر بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"وسیم! میں نہیں سمجھتا کہ اب اس کا کوئی فائدہ ہے۔" اس نے بالآخر بہت صاف الفاظ میں اس سے کہا۔ "امامہ میرے ساتھ خوش ہے۔ اپنی زندگی میں سیٹلڈ ہے.... میں نہیں چاہتا' وہ اپ سیٹ ہو یا اسے کوئی نقصان پہنچے۔"

"میں نہ تو اس کو اپ سیٹ کرنا چاہتا ہوں نہ ہی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں بس کبھی کبھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" وسیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ بے تابی سے کہا۔

"میں اس پر سوچوں گا وسیم! لیکن یہ بڑا مشکل ہے.... میں نہیں چاہتا کہ تمہیں استعمال کر کے کوئی...." وسیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں بھی نہیں چاہتا کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے۔ ایسی کوئی خواہش ہوتی تو اتنے سالوں میں تم سے پہلے رابطہ کرتا۔ میں جانتا تھا' وہ تم سے شادی کر کے گھر سے گئی ہے۔ تم انوالوڈ تھے پورے معاملے میں' لیکن میں نے اپنی فیملی کو کبھی یہ نہیں بتایا۔"

سالار ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے کہا۔ "وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ نہیں تھی۔"

"نہیں ہوگی.... لیکن وہ تم سے شادی کر کے گئی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ان کے دوستوں کا سرکل تقریباً" ایک ہی تھا اور اس میں اگر کسی نے امامہ اور اس کی شادی کے حوالے سے کچھ حقیقی اطلاعات وسیم کو دے دی تھیں تو یہ کوئی اتنی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

"میں سوچوں گا وسیم!" سالار نے بحث کرنے کے بجائے پھر وہی جملہ دہرایا' وسیم مایوس ہوا تھا۔

"میں دو دن کے لیے ہوں لاہور میں.... ! اور یہ میرا کارڈ ہے.... میں اس سے واقعی ملنا چاہتا ہوں۔" وسیم نے مزید کچھ کہے بغیر جیب سے ایک کارڈ نکال کر ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس رات وہ خلاف معمول کچھ زیادہ خاموش تھا۔ یہ امامہ نے نوٹس کیا تھا لیکن اسے وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح آفس میں کام کے پریشر کو ذمہ دار گردانا تھا۔

وہ کھانے کے بعد کام کرنے کے لیے معمول کے مطابق اسٹڈی میں جانے کے بجائے اس کے پاس لاؤنج کے صوفہ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا پھر وہ بھی ٹی وی دیکھنے لگا۔

پانچ دس منٹ کی خاموشی کے بعد امامہ نے بالآخر ایک گہرا سانس لے کر اسے کہتے سنا۔

"امامہ! اگر تم وعدہ کرو کہ تم خاموشی سے تحمل سے میری بات سنو گی.... آنسو بہائے بغیر.... تو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کیا کہنا ہے؟" وہ کچھ حیران تھی۔

"وسیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اس نے بلا تمہید کہا۔ وہ ہل نہیں سکی۔

"وسیم.... میرا بھائی؟" امامہ نے بالآخر کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ سالار نے سر ہلایا پھر وہ اسے اپنی اور اس کی آج کی ملاقات کی تفصیلات بتانے لگا تھا۔ اور ان تفصیلات کے دوران "برسات" شروع ہو چکی تھی۔

سالار نے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا۔ تحمل کے علاوہ وہ اور کس چیز کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔
"تم نے کیوں اسے یہاں آنے نہیں دیا؟ تم اسے ساتھ لے کر آتے۔" اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتے ہوئے گفتگو کے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹی۔
"مجھے پتا تھا' وسیم مجھے معاف کر دے گا۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی مس کرتا ہو گا جتنا میں اسے کرتی ہوں۔ میں تم سے کہتی تھی نا کہ وہ۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے امامہ! میں نہیں جانتا' وہ کیوں ملنا چاہتا ہے تم سے۔ لیکن اس کے تمہارے ساتھ ملنے کے بڑے نقصان دہ نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔" سالار اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا تھا۔ وہ وسیم کے حوالے سے واقعی کچھ خدشات کا شکار تھا۔
"کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے پتا ہے' کچھ نہیں ہو گا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تم اسے فون کر کے ابھی بلالو۔"
"میں کل اسے بلواؤں گا' لیکن وہ اگر کبھی اکیلے یہاں آنا چاہے یا تمہیں کہیں بلائے تو تم نہیں جاؤ گی۔" سالار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اور میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں۔ نہ وہ یہاں اکیلا آئے گا نہ تم اس کے فون کرنے پر کہیں جاؤ گی۔" سالار نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی تھی۔
"میں اس کے بلانے پر کہیں نہیں جاؤں گی' لیکن اس کے یہاں آنے پر کیوں اعتراض ہے تمہیں؟" اس نے احتجاج کیا۔
"وہ میرے گھر پر ہوتے ہوئے آئے' مجھے کوئی اعتراض نہیں' لیکن وہ اکیلا یہاں نہ آئے۔ وہ تو خیر میں نیچے سیکیورٹی والوں کو بھی بتا دوں گا۔"
"وہ میرا بھائی ہے سالار!" امامہ کو بے عزتی محسوس ہوئی۔
"جانتا ہوں' اسی لیے تم سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے حوالے سے اس پر یا کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"
"لیکن۔"
"تم مجھے صرف یہ بتاؤ تمہیں اس سے ملنا ہے یا نہیں۔ اگر تمہیں بحث کرنی ہے اس ایشو پر۔ تو بہتر ہے وسیم آئے ہی نہ۔" سالار نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔
"ٹھیک ہے۔ میں اسے اکیلے نہیں بلاؤں گی یہاں۔" اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے "فوراً" سے پیشتر گھٹنے ٹیکے تھے۔
"مجھے اس سے فون پر بات کرنی ہے۔" سالار نے کچھ کہنے کے بجائے وسیم کا وزٹنگ کارڈ لا کر اسے دے دیا۔ وہ خود اسٹڈی میں چلا گیا تھا۔
چند بار بیل ہونے پر وسیم نے فون اٹھایا تھا اور اس کی آواز سننے پر امامہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔
"ہیلو۔ میں امامہ ہوں۔"
وسیم دوسری طرف کچھ دیر بول نہیں سکا تھا اور پھر جب بولنے کے قابل ہوا' تب تک اس کی آواز بھی بھرانے لگی تھی۔ وہ دو گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے رہے تھے۔ بے ہنگم' بے ربط۔ بے مقصد۔ خاموشی کے لیے وقفوں والی گفتگو۔ لیکن اس گفتگو میں کوئی گلے شکوے نہیں ہوئے تھے۔ کوئی ملامت' مذمت نہیں ہوئی تھی۔ وقت اب اتنا آگے آ گیا تھا کہ یہ سب کہنا بے کار تھا۔ وسیم شادی کر چکا تھا اور اس کے تین بچے تھے۔ فیملی میں اور بھی بہت سے افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اضافے کی تفصیلات سنتی رہی۔

سالار دو گھنٹے کے بعد اسٹڈی سے نکلا تھا اور وہ اس وقت بھی لاؤنج میں فون کان سے لگائے سرخ آنکھوں اور ناک کے ساتھ فون پر وسیم سے گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم میں گیا تھا اور اسے یقین تھا امامہ نے اسے ایک بار بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک اس نئی ڈیولپمنٹ (development) کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ ٹھیک ہو رہا تھا یا غلط۔ وہ امامہ کا کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو وہ کبھی امامہ سے اس کا رابطہ نہ کرواتا لیکن وسیم کے حوالے سے وہ تحفظات رکھنے کے باوجود کسی حد تک کچھ نرم گوشہ رکھنے پر مجبور تھا۔ اگر اس کی فیملی کا ایک فرد بھی اس کے ساتھ کچھ رابطہ رکھتا تو وہ جانتا تھا کہ امامہ ذہنی طور پر بہت بہتر محسوس کرے گی۔ اپنے پیچھے اپنی فیملی کی عدم موجودگی کا جو احساس کمتری وہ لیے ہوئے تھی وہ اتنے مہینوں کے بعد کم از کم سالار سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ فجر کی نماز کے لیے جب وہ مسجد جانے کے لیے اٹھا تو وہ اس وقت بھی بستر میں نہیں تھی۔ لاؤنج میں آتے ہی وہ کچھ دیر کے لیے ہل نہیں سکا تھا۔ وہاں کا انٹیریر راتوں رات بدل گیا تھا۔ فرنیچر کے بہت سے چھوٹے موٹے آئٹمز کی سیٹنگ تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ دیواروں پر کچھ نئی آرائشی اشیا بھی آگئی تھیں۔ صوفہ اور فلور کشنز کے کور بدلے جاچکے تھے اور کارپٹ پر چند نئے رگز (Rugs) بھی نظر آ رہے تھے اور وہ اس وقت کچن ایریا کے کاؤنٹر کے پار ایک اسٹول پر چڑھی کچن کیبنٹ کو اسفنج کے ساتھ رگڑنے میں مصروف تھی۔

"تم ساری رات یہ کرتی رہی ہو؟" سالار پانی پینے کے لیے کچن میں گیا تھا تو اس نے کچن کے فرش کو کیبنٹ سے نکالی گئی چیزوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔

"کیا؟" وہ اسی اطمینان سے کام میں مصروف بولی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کیا کرتی رہی ہو تم!" سالار نے پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے کاؤنٹر پر رکھا اور باہر نکل گیا۔ بیرونی دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت واپس آیا تھا۔

"امامہ! آج سنڈے ہے اور میں ابھی مسجد سے آکر سوؤں گا۔ خبردار تم نے بیڈ روم کی صفائی اس وقت شروع کی۔"

"پھر میں کس وقت صفائی کروں گی۔ بیڈ روم کی... میں نے وسیم کو لنچ پر بلوایا ہے۔" امامہ نے پلٹ کر کہا۔ سالار کی چھٹی حس نے بروقت کام کیا تھا۔

"بیڈ روم کی صفائی کا وسیم کے لنچ سے کیا تعلق ہے؟" وہ حیران ہوا تھا۔ "تم نے اسے بیڈ روم میں بٹھانا ہے؟"

"نہیں لیکن..." وہ اٹکی تھی۔

"امامہ! بیڈ روم میں کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے سونا ہے آکر ابھی۔" اس نے امامہ کو ایک بار پھر یاد دہانی کرائی تھی۔

"یہ سامان لانا مجھے سونے سے پہلے کھانے کی تیاری کرنی ہے مجھے۔" امامہ نے کاؤنٹر پر پڑی ایک لسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں فجر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں اور یہ سامان تمہیں سو کر اٹھنے کے بعد لا کر دوں گا۔" وہ لسٹ کو ہاتھ لگائے بغیر چلا گیا تھا۔

تمام خدشات کے باوجود واپسی پر اس نے اپنے بیڈ روم کو اسی حالت میں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

اس نے دس بجے اس کی مطلوبہ اشیا لا کر دی تھیں۔ کچن تب تک کسی ہوٹل کے کچن کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ وہ پتا نہیں کون کون سی ڈشز بنانے میں مصروف تھی۔ وہ کم از کم 25 افراد کا کھانا تھا جو وہ اپنے بھائی کے لیے

تیار کر رہی تھی۔ اور سالار کو یقین تھا کہ آدھے سے زیادہ کھانا انہیں بلڈنگ کے مختلف اپارٹمنٹس میں بھیجنا پڑے گا۔ لیکن امامہ اتنے جوش اور لگن سے ملازمہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھی کہ سالار نے اسے کوئی نصیحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا انگلش لیگ کا کوئی میچ دیکھتا رہا۔

وسیم دو بجے آیا تھا اور دو بجے تک امامہ کو گھر میں کسی "مرد" کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ کھانا تیار کرتے ہوئے اس سے اپنی فیملی کی باتوں میں مصروف تھی اُس تازہ ترین اپ ڈیٹ کے ساتھ جو اسے رات کو وسیم سے ملی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے ملازمہ کے ساتھ اتنے جوش و جذبہ سے بات کرتے ہوئے سنا تھا اور وہ حیران تھا۔ حیرانگی اس کیفیت کو اتنے موثر طریقے سے بیان نہیں کر پائی۔

وسیم کا استقبال اس نے سالار سے بھی پہلے دروازے پر کیا تھا۔ بہن اور بھائی کے درمیان ایک جذباتی سین ہوا تھا۔ جس میں سالار نے دونوں سے تسلی کے چند الفاظ کہہ کر کچھ کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد ساڑھے چھ بجے وسیم کی موجودگی تک وہ ایک خاموش تماشائی کا رول ادا کرتا رہا تھا۔ وہ کھانے کی ٹیبل پر موجود ضرور تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وہاں ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ امامہ کو بھائی کے علاوہ کوئی اور نظر آ رہا تھا نہ کسی اور کا ہوش تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ٹیبل پر موجود ہر ڈش اپنے ہاتھوں سے وسیم کو کھلائے۔ اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ امامہ نے کھانے کی ٹیبل پر اسے کچھ سرو نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا بچپن کا دوست تھا لیکن یہ بھی پہلا موقع تھا کہ وہاں اس کے ہوتے ہوئے بھی وسیم اور اس کے درمیان صرف چند رسمی سے جملوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر وہ امامہ آپس میں گفتگو کرتے رہے تھے۔

سالار نے اس دوپہر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے زندگی میں پہلی بار کسی مہمان کی موجودگی میں ٹی وی پر کھانا کھاتے ہوئے انگلش لیگ دیکھی۔۔۔ اور ٹیبل پر موجود دوسرے دونوں افراد اپنی باتوں میں مصروف رہے۔

ساڑھے چھ بجے اس کے جانے کے بعد سالار کی توقع کے مطابق بچا ہوا تقریباً "سارا کھانا ملازمہ، فرقان اور چند دوسرے گھروں میں بھیجا گیا۔

وہ عشا کی نماز پڑھ کر آیا تو وہ اس کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا کر خود بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ وہ ویک اینڈ پر رات کا کھانا ہمیشہ باہر کھاتے تھے اور نہ بھی کھاتے تب بھی باہر ضرور جاتے تھے۔

اس نے پہلی بار امامہ کی گھر پر موجودگی کے باوجود اکیلے ڈنر کیا اور وہ بری طرح پچھتایا تھا وسیم کو امامہ سے ملنے کی اجازت دے کر۔



"امامہ! یہ وسیم نامہ بند ہو سکتا ہے اب۔" وہ تیسرا دن تھا جب ڈنر پر بالآخر سالار کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ تین دنوں سے مسلسل ناشتے، ڈنر اور رات سونے سے پہلے صرف وسیم کی باتیں، بار بار سن رہا تھا۔ امامہ بری طرح وسیم پر فدا تھی یہ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ وسیم سے ملنے کے بعد خوش ہو گی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی خوشی اس انتہا کو پہنچے گی کہ خود اسے مسئلہ ہونا شروع ہو جائے گا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"مطلب یہ کہ دنیا میں وسیم کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جن کی تمہیں پرواہ کرنی چاہیے۔" سالار نے اسے ان ڈائریکٹ انداز میں کہا۔

"مثلاً" "کون؟" اس نے جواباً" اتنی سنجیدگی سے پوچھا تھا کہ وہ کچھ بول نہیں سکا۔

"اور کون ہے۔ جس کی مجھے پروا کرنی چاہیے؟" وہ اب بڑبڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم گھر پر توجہ دو اب!"
وہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ "مجھ" پر توجہ دو۔
"گھر کو کیا ہوا؟" وہ مزید حیران ہوئی۔ وہ اس بار مزید کوئی تاویل نہیں دے سکا تھا۔ گھر کو واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔
"تمہیں میرا وسیم کے بارے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا؟" اس نے یک دم جیسے کوئی اندازہ لگایا اور اس کے لہجے میں ایسی بے یقینی تھی کہ وہ "ہاں" نہیں کہہ سکا۔
"میں نے کب کہا کہ مجھے برا لگتا ہے۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں تمہیں۔" وہ بے ساختہ بات بدل گیا۔
"ہاں میں بھی سوچ رہی تھی تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو' وہ تمہارا بیسٹ فرینڈ ہے۔" وہ یک دم مطمئن ہوئی۔
سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ اس کا بیسٹ فرینڈ ہے نہیں کبھی تھا۔
"تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا وہ۔"
سالار کھانا کھاتے کھاتے رکا۔ "میرے بارے میں کیا۔۔۔؟"
"سب کچھ۔" وہ اسی روانی سے بولی۔
سالار کے پیٹ میں گرہیں سی پڑیں "سب کچھ کیا؟"
"مطلب جو بھی تم کرتے تھے۔"
سالار کی بھوک اڑی تھی۔
"مثلاً۔۔۔؟" وہ پتا نہیں اپنے کن خدشات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑی۔
"جیسے تم جن سے ڈرگز لیتے تھے اُن کے بارے میں۔۔۔ اور جب تم لاہور میں اپنے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ ریڈ لائٹ ایریا گئے تھے تو تب بھی۔"
وہ بات مکمل نہیں کر سکی پانی پیتے ہوئے سالار کو اچھو لگا تھا۔
"تمہیں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں۔۔۔" سالار خود بھی اپنا سوال پورا نہیں دہرا سکا۔
"جب بھی جاتے تھے تو بتاتا تھا۔"
سالار کے منہ سے بے اختیار وسیم کے لیے زیرلب گالی نکلی تھی اور امامہ نے اس کے ہونٹوں کی حرکت کو پڑھا تھا۔ وہ بری طرح اپ سیٹ ہوئی۔
"تم نے اسے گالی دی ہے؟" اس نے جیسے شاکڈ ہو کر سالار سے کہا۔
"ہاں وہ سامنے ہوتا تو میں اس کی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیتا۔ وہ اپنی بہن سے یہ باتیں جا کر کرتا تھا۔ اور میری باتیں۔۔۔
I can't imagine (میں تصور بھی نہیں کر سکتا) وہ واقعی بری طرح برہم ہوا تھا۔ "سب کچھ" کی دو جھلکیوں نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ امامہ اس کے بارے میں کیا کچھ جانتی تھی اس کا صحیح اندازہ اسے آج ہوا تھا کیونکہ وسیم اس کے بے حد بے تکلف اور قریبی دوستوں میں سے تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے کرتوت اپنی چھوٹی بہن کو جا کر بتا سکتا تھا۔
"تم میرے بھائی کو دوبارہ گالی مت دینا۔"
امامہ کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا' وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔ سالار جواباً کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی سے کھانے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔
یہ اس کی زندگی کے کچھ بے حد پریشان کن لمحوں میں سے ایک تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ امامہ کو اس کی کسی بات پر یقین کرنا یا اسے اچھا سمجھنا کیوں اتنا مشکل تھا۔۔۔ وہ اس کی کیس ہسٹری کو اتنا تفصیلی اور اتنا قریب

سے نہ جانتی ہوتی تو اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہوتا جن کا سامنا وہ اب کر رہا تھا۔

وہ تقریباً" دو گھنٹے کے بعد بیڈ روم میں سونے کے لیے آئی تھی۔ وہ اس وقت معمول کے مطابق اپنی ای میلز چیک کرنے میں مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر آکر کمبل خود پر کھینچتے ہوئے لیٹ گئی تھی۔

سالار نے ای میل چیک کرتے گردن موڑ کر اسے دیکھا ' اسے اسی ردعمل کی توقع تھی۔ وہ روز سونے سے پہلے کوئی ناول پڑھتی تھی اور کتاب پڑھنے کے دوران اس سے باتیں بھی کرتی تھی۔ یہ خاموشی اس دن ہوتی تھی جس دن وہ اس سے خفا ہوتی تھی۔ اس نے اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ بھی آف کر لیا تھا۔

"میں نے نوسیم کو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم اس طرح ناراض ہو کر بیٹھو۔"

سالار نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کیا۔ وہ اسی طرح کروٹ دوسری طرف لیے بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

"امامہ! تم سے بات کر رہا ہوں میں۔" سالار نے کمبل کھینچا تھا۔

"تم اپنے چھوٹے بھائی عمار کو وہی گالی دے کر دکھاؤ۔" اس کے تیسری بار کمبل کھینچنے پر وہ بے حد خفگی سے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

سالار نے بلاتوقف وہی گالی عمار کو دی۔ چند لمحوں کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔ اگر دنیا میں ڈھٹائی کی کوئی معراج تھی تو وہ وہ تھا۔

"میں پاپا کو بتاؤں گی۔" امامہ نے بالآخر سرخ چہرے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے کہا تھا عمار کو گالی دینے کو۔" وہ ویسے ہی اطمینان سے بولا تھا۔ "ویسے تمہارے بھائی کو اس سے زیادہ خراب گالیاں میں اس کے منہ پر دے چکا ہوں اور اس نے کبھی مائنڈ نہیں کیا اور اگر تم چاہو تو اگلی بار جب وہ یہاں آئے گا تو میں تمہیں دکھادوں گا۔"

وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔

"تم وسیم کو یہاں میرے سامنے گالیاں دو گے؟" اسے بے حد رنج ہوا تھا۔

"جو کچھ اس نے کیا ہے' میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسے گالیاں ہی دیتا اور اس سے زیادہ بری۔" سالار نے لگی لپٹی کے بغیر کہا۔

"لیکن چلو آئی ایم سوری۔" وہ اس بار پھر اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔

سکندر عثمان ٹھیک کہتے تھے۔ ان کی وہ اولاد سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔

"لیکن پاپا! وہ میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں ٹالتا۔"

اس نے ایک بار سکندر کے پوچھنے پر کہ وہ اس کا خیال رکھتا تھا کہ جواب میں سالار کی تعریف کی تھی۔

"امامہ! یہ جو تمہارا شوہر ہے' یہ دنیا میں اللہ نے صرف ایک پیس پیدا کیا تھا۔ تیس سال میں نے باپ کے طور پر جس طرح اس کے ساتھ گزارے ہیں' وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اب باقی کی زندگی تمہیں گزارنی ہے اس کے ساتھ' یہ تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے' اور تمہیں کبھی پتا نہیں چل سکتا۔ اس نے جو کرنا ہوتا ہے' وہ کرنا ہوتا ہے۔ چاہے ساری دنیا ختم ہو جائے اسے سمجھا سمجھا کر' اور کبھی اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ یہ تمہاری بات مان کر اپنی مرضی نہیں کرے گا۔"

سالار سر جھکائے مسکراتا باپ کی باتیں سنتا رہا تھا اور وہ کچھ الجھی نظروں سے باری باری اسے اور سکندر کو دیکھتی رہی تھی۔

"آہستہ آہستہ پتا چل جائے گا تمہیں کہ سالار چیز کیا ہے۔ یہ پانی میں آگ لگانے والی گفتگو کا ماہر ہے۔"

سالار نے کسی ایک بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا تھا' سکندر کے پاس سے واپسی کے بعد امامہ نے سالار سے کہا۔

"تمہارا امپریشن بہت خراب ہے پاپا پر۔ تمہیں کوئی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔"

"کیسی وضاحت؟ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تمہیں ان کی باتیں غور سے سننا چاہیے تھیں۔"

وہ تب بھی اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اور وہ اب بھی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ پھر کہہ رہا تھا۔

"تم شرمندہ تو نہیں ہو۔" اس نے اسے شرمندہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"ہاں وہ تو میں نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تمہیں میرا سوری کہنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے آئی ایم سوری۔"

اس نے تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ امامہ نے جواب دینے کے بجائے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا پورا گلاس پیا اور دوبارہ کمبل کھینچ کر لیٹ گئی۔

"پانی اور لا دوں؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ امامہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔



وہ نیند میں سیل فون کی آواز پر ہڑبڑائی تھی۔ وہ سالار کا سیل فون تھا۔

"ہیلو!" سالار نے نیند میں کروٹ لیتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر کال ریسیو کی۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"ہاں بات کر رہا ہوں۔" اس نے سالار کو کہتے سنا پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ یک دم بستر سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیم تاریکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کی' وہ لائٹ آن کیے بغیر اندھیرے میں ہی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں چلا گیا تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ وہ کس کا فون ہو سکتا تھا۔ جس کے لیے وہ رات کے اس پہر یوں اٹھ کر کمرے سے گیا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ کچھ دیر اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی' لیکن جب وہ کافی دیر تک نہیں آیا تو وہ کچھ بے چین سی اٹھ کر کمرے سے لاؤنج میں آئی تھی۔ وہ لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ فون پر بات کرتے کرتے رکا۔

"ایک جینز اور شرٹ پیک کردو میری۔ مجھے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے ابھی۔"

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟" وہ پریشان ہوئی تھی۔

"اسکول میں آگ لگ گئی ہے۔"

اس کی نیند پلک جھپکتے میں غائب ہوئی تھی۔

سالار اب دوبارہ فون پر بات کر رہا تھا۔ بے حد تشویش کے عالم میں کمرے میں واپس آکر اس نے اس کا بیگ تیار کیا' وہ تب تک کمرے میں واپس آچکا تھا۔

"آگ کیسے لگی؟"

"یہ تو وہاں جاکر پتا چلے گا۔" وہ بے حد عجلت میں اپنے لیے نکالے ہوئے کپڑے لیتا واش روم میں چلا گیا۔ وہ بیٹھی رہی۔ وہ اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتی تھی۔

شادی کے شروع کے چند مہینے چھوڑ کر اب اوپر نیچے کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہیں بری طرح تکلیف پہنچا رہا

تھا۔

دس منٹ میں وہ تیار ہو کر نکل گیا' لیکن وہ دوبارہ بستر میں نہیں جا سکی تھی۔ اس نے باقی کی ساری رات اسی پریشانی میں دعائیں کرتے ہوئے کاٹی تھی۔

سالار سے اس کی ایک دوبار چند منٹ کے لیے بات ہوئی' لیکن وہ فون پر مسلسل مصروف تھا امامہ نے اسے ڈسٹرب کرنے سے گریز کیا۔

اس کے گاؤں پہنچنے کے بعد بھی آگ پر قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔ وجہ بروقت فائر بریگیڈ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔ اور آگ کا اتنے گھنٹوں بعد بھی نہ بجھ پانے کا مطلب کیا تھا وہ امامہ اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھی۔

وہ پورا دن جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھر میں پھرتی رہی تھی۔ سالار نے بالآخر اسے آگ پر قابو پانے کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ اسے رات کو کال کرے گا اور وہ اس رات اسلام آباد ہی میں رہنے والا تھا۔

اس دن وہ سارا دن کچھ کھا نہیں سکی تھی۔ عمارت کو کتنا نقصان پہنچا تھا۔ یہ اسے نہیں پتا تھا لیکن کئی گھنٹے لگی رہنے والی آگ کیا کر سکتی تھی۔ اس کا احساس اسے تھا۔

سالار سے بالآخر آدھی رات کے قریب اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ آواز سے اسے اتنا تھکا ہوا لگ رہا تھا کہ امامہ نے اس سے زیادہ دیر بات کرنے کے بجائے سونے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ لیکن وہ خود ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ آگ عمارت میں لگائی گئی تھی۔ وہاں پولیس کو ابتدائی طور پر ایسے شواہد ملے تھے اور یہ معمولی سی بات امامہ کی نیند اور حواس کو باطل کرنے کے لیے کافی تھی۔

وہ صرف سالار کا اسکول نہیں تھا۔ وہ پورا پروجیکٹ اب ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا تھا جس کی مین ٹرسٹی سالار کی فیملی تھی۔

اور اس پروجیکٹ کو یک دم اس طرح کا نقصان کون پہنچا سکتا تھا؟

یہی وہ سوال تھا جو اسے ہولا رہا تھا۔

سب کچھ پھر جیسے چند ہفتے پہلے والی اسٹیج پر آگیا تھا۔

وہ اگلے دن رات کو گھر پہنچا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے علاوہ دوسرا کوئی تاثر نہیں تھا' وہ اگر کچھ اور دیکھنا چاہتی تھی تو مایوس ہوئی تھی' وہ نارمل تھا اسے جیسے حوصلہ ہوا تھا۔

"بلڈنگ کے اسٹرکچر کو نقصان پہنچا ہے جس کمپنی نے بلڈنگ بنائی ہے۔ وہ کچھ ایگزامن کر رہے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ شاید بلڈنگ گرا کر دوبارہ بنانی پڑے۔"

کھانے کی ٹیبل پر اس کے پوچھنے پر اس نے امامہ کو بتایا تھا۔

"بہت نقصان ہوا ہو گا؟" یہ احمقانہ سوال تھا' لیکن امامہ حواس باختہ تھی۔

"ہاں!" جواب مختصر تھا۔

"اسکول بند ہو گیا؟" ایک اور احمقانہ سوال۔

"نہیں۔ گاؤں کے چند گھر فوری طور پر خالی کروائے ہیں اور کرائے پر لے کر اسکول کے مختلف بلاکس کو شفٹ کیا ہے وہاں پر۔ Luckily ابھی کچھ دنوں میں سمر بریک آجائے گی تو بچوں کا زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے بتاتا رہا۔

"اور پولیس نے کیا کہا؟" ادھر ادھر کے سوال کے بعد امامہ نے بالآخر وہ سوال کیا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔

"ابھی تو انویسٹی گیشن اسٹارٹ ہوئی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

سالار نے گول مول بات کی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دن اسلام آباد میں وہ اپنی فیملی کے ہر فرد سے اس کیس کے Suspects (مشتبہ افراد) میں امامہ کی فیملی کو شامل کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا کرتا رہا تھا۔ وہ بہت مشکل صورت حال تھی۔ اس پروجیکٹ کو چلانے میں بہت سے لوگوں کے عطیات استعمال ہو رہے تھے اور اس نقصان کے متاثرین بہت سے تھے۔

کئی سال سے آرام سے چلنے والے اس اسکول کا کوئی دشمن پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اب...

امامہ سے زیادہ وہ خود یہ دعا کر رہا تھا کہ یہ آگ اتفاقی حادثہ ہو... مگر چند گھنٹوں میں ہی آگ کے اسکیل اور صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پلان شدہ آتش زدگی تھی اور اگلے چند گھنٹوں میں کچھ اور شواہد بھی مل گئے تھے۔ امامہ سے یہ سب شیئر کرنا حماقت تھی۔ وہ پچھلے تجربے کے بعد اس طرح کی کسی دوسری پریشانی میں کم از کم اسے نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" تیسرا احمقانہ سوال۔

"سب کچھ دوبارہ بنانا پڑے گا اور بس۔" جواب اتنا ہی سادہ تھا۔

"اور فنڈز... وہ کہاں سے آئیں گے؟" یہ پہلا سمجھ دارانہ سوال تھا۔

"endowment fund ہے اسکول کا... اس کو استعمال کریں گے۔ کچھ انویسٹمنٹ کی ہے میں نے' وہاں سے رقم نکلواؤں گا۔ وہ اسلام آباد کا پلاٹ بیچ دوں گا... فوری طور پر تو تھوڑا بہت کر ہی لوں گا۔ اتنا کہ اسکول کی بلڈنگ دوبارہ کھڑی ہو جائے۔"

"پلاٹ کیوں؟" وہ بری طرح بدکی تھی۔ امامہ نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ پلاٹس نہیں پلاٹ کہہ رہا تھا۔

"اس سے فوری طور پر رقم مل جائے گی مجھے... بعد میں لے لوں گا' ابھی تو فوری طور پر اس میس سے نکلنا ہے مجھے۔"

"تم وہ حق مہر کی رقم لے لو' آٹھ دس لاکھ کے قریب ویڈنگ پر ملنے والی گفٹ کی رقم بھی ہو گی اور اتنے ہی میرے اکاؤنٹ میں پہلے سے بھی ہوں گے... پچاس ساٹھ لاکھ تو یہ ہو جائے گا اور..." سالار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔"

"قرض لے لو مجھ سے... بعد میں دے دینا۔"

"نو۔" اس کا انداز حتمی تھا۔

"میرے پاس بے کار پڑے ہیں' سالار! تمہارے کام آئیں گے تو۔" اس نے پھر امامہ کی بات کاٹ دی۔

"I said no (میں نے کہا' نہیں)" اس نے اس بار کچھ ترشی سے کہا تھا۔

"میرے پیسے اور تمہارے پیسے میں کوئی فرق ہے؟"

"ہاں ہے..." اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"وہ حق مہر اور شادی پر گفٹ میں ملنے والی رقم ہے... میں کیسے لے لوں تم سے...؟ میں بے شرم ہو سکتا ہوں... بے غیرت نہیں ہو سکتا۔"

"اب تم خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو اور..."

سالار نے اس کی بات کاٹی "کون جذباتی ہو رہا ہے؟ کم از کم میں تو نہیں ہو رہا۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی "میں تمہیں قرض دے رہی ہوں سالار۔"

"Thank you very much but I don't need" (بہت شکریہ' مگر مجھے اس کی ضرورت

نہیں ہے) مجھے قرض لینا ہو گا تو بڑے دوست ہیں میرے پاس۔"
"دوستوں سے قرض لو گے بیوی سے نہیں؟"
"نہیں۔"
"میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں سالار۔"
"ایموشنلی کرو فنانشلی نہیں۔"
وہ اسے دیکھتی رہ گئی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کس طرح قائل کرے۔
"اور اگر میں یہ رقم ڈونیٹ کرنا چاہوں تو۔" اسے بالآخر ایک خیال آیا۔
"ضرور کرو اس ملک میں بہت سی charitics (خیراتی ادارے) ہیں۔ تمہارا پیسہ ہے' چاہے آگ لگادو۔ لیکن میں یا میرا ادارہ نہیں لے گا۔" اس نے صاف لفظوں اور حتمی انداز میں کہا۔
"تم کبھی مجھے کچھ ڈونیٹ کرنے نہیں دو گے؟"
"ضرور کرنا۔ لیکن فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔"
وہ ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔
وہ بے حد اپ سیٹ اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ اس کے لیے وہ دو پلاٹ اس کے گھر کی پہلی دو اینٹیں تھیں اور وہ پہلی دو اینٹیں اس طرح جانے والی تھیں۔ یہ چیز اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ تکلیف کا باعث وہ احساس جرم بھی تھا جو وہ اس سارے معاملے میں اپنی فیملی کے انوالو ہونے کی وجہ سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں اس رقم سے جیسے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی جو اس کی فیملی نے کیا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ سالار نے اس کی اس سوچ کو اس سے پہلے پڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
آنے والے دنوں میں بھی وہ سالار کو وہ رقم لینے پر مجبور کرتی رہی تھی' لیکن وہ ایک بار بھی یہ جرات نہیں کر سکی تھی کہ پولیس کی انویسٹی گیشن کے حوالے سے سالار سے کچھ پوچھتی.... وہ دونوں جانتے بوجھتے اس حساس ایشو پر گفتگو سے اجتناب کر رہے تھے اور یہ امامہ کے لیے ایک نعمت متبرقہ سے کم نہیں تھا۔



"جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں نہ ہی کوئی انوالومنٹ ہے؟"
اس کے سامنے بیٹھا وسیم بڑی سنجیدگی سے اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا "اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب ابو کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا کچھ نہ کیا ہو میں نے گھر میں ایسا کچھ نہیں سنا۔"
وسیم نے ہاشم مبین کا بھی دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔ وہ سالار کے سامنے اپنی فیملی کا دفاع کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ وسیم کے سامنے نہیں... اسے یقین تھا' یہ جو بھی کچھ ہوا تھا۔ اس میں اس کے اپنے باپ کا ہی ہاتھ تھا۔
"ابو سے کہنا' یہ سب کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ سالار کو کیا نقصان ہو گا یا مجھے کیا نقصان ہو گا۔ ایک اسکول ہی جلا ہے پھر بن جائے گا۔ ان سے کہنا' وہ کچھ بھی کرلیں ہمیں فرق نہیں پڑتا۔"
وسیم اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے امامہ سے مدھم آواز میں کہا۔
"میں ابو سے یہ سب نہیں کہہ سکتا۔ میں بہت بزدل ہوں' تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں۔"
چند لمحوں کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے' جب سے وہ دوبارہ ملنا شروع ہوئے تھے' آج پہلی بار وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سراہ رہا تھا یا اعتراف کر رہا تھا۔

"تمہارے جانے کے بعد اتنے سالوں میں بہت دفعہ کمزور پڑا میں بہت دفعہ کشمکش کا بھی شکار ہوا اور شک و شبہ کا بھی۔ بہت دفعہ دل چاہتا تھا۔ زندگی کے اس غبار کو میں بھی ختم کرنے کی کوشش کروں جس نے میری بینائی دھندلائی ہوئی ہے لیکن میں بہت بزدل ہوں۔ تمہاری طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

"اب آجاؤ۔" امامہ کو خود احساس نہیں ہوا اس نے یہ بات اس سے کیوں کہہ دی اور کہنی چاہیے تھی کہ نہیں۔

وسیم نے اس سے نظریں نہیں ملائیں پھر سہلاتے ہوئے کہا۔

"اب اور بھی زیادہ مشکل ہے جب اکیلا تھا تو اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ اب تو بیوی اور بچے ہیں۔"

"ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ میں اور سالار۔ کچھ بھی نہیں ہوگا تمہیں۔ تمہاری فیملی کو ہم ایک بار کوشش تو کرو۔"

امامہ بھول گئی تھی اس نے وسیم کو کیا ڈسکس کرنے کے لیے بلایا تھا اور وہ کیا ڈسکس کرنے بیٹھ گئی تھی۔

"انسان بہت خود غرض اور بے شرم ہوتا ہے امامہ! یہ جو ضرورت ہوتی ہے یہ صحیح اور غلط کی سب تمیز ختم کر دیتی ہے کاش میں زندگی میں مذہب کو پہلی Priority (ترجیح) بنا سکتا۔ مگر مذہب پہلی Priority (ترجیح) نہیں ہے میری۔" وسیم نے گہرا سانس لیا تھا جیسے کوئی رنج تھا جس نے بگولہ بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

"میں تمہاری طرح فیملی نہیں چھوڑ سکتا مذہب کے لیے۔ تمہاری قربانی بہت بڑی ہے۔"

"تم جانتے بوجھتے جہنم کا انتخاب کر رہے ہو صرف دنیا کے لیے؟ اپنے بیوی بچوں کو بھی اسی راستے پر لے جاؤ گے کیونکہ تم میں صرف جرأت نہیں ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہہ دینے کی۔"

وہ اب بھائی کو چیلنج کر رہی تھی۔ وہ یک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا یوں جیسے بے قرار تھا۔

"تم مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہو؟"

"آزمائش سے بچانا چاہتی ہوں۔ آزمائش تو وہ ہے جس میں تم نے خود کو ڈال رکھا ہے۔"

اس نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھالی۔ "میں صرف اسی لیے تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔"

وہ کہتے ہوئے اس کے روکنے کے باوجود اپارٹمنٹ سے نکل گیا تھا امامہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم کو پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھ کر اسے جیسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ وسیم سے تعلق توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور وہ اسے اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔



"وسیم میرا فون نہیں اٹھا رہا۔" امامہ نے اس رات کھانے پر سالار سے کہا تھا۔ سالار کو وہ بہت پریشان لگی تھی۔

"ہو سکتا ہے مصروف ہو۔" سالار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ ناراض ہے۔"

اس بار سالار چونکا تھا۔ "ناراض کیوں ہوگا؟"

امامہ نے اسے اپنی اور وسیم کی گفتگو سنا دی۔ سالار گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی اس سے اس طرح کی گفتگو کرنے کی۔ بالغ آدمی ہے وہ۔ بزنس کر رہا ہے۔ بیوی بچوں والا ہے۔ اسے اچھی طرح پتا ہے اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے اور اس کے لیے کیا صحیح ہے۔ تم لوگ

آپس میں ملتے رہنا چاہتے ہو تو مذہب کو ڈسکس کیے بغیر ملو۔" سالار نے اسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سمجھایا۔
"بات اس نے شروع کی تھی وہ نہ کرتا تو میں کبھی نہ کرتی۔" امامہ نے جیسے اپنا دفاع کیا۔
"اور خود بات شروع کرنے کے بعد اب وہ تمہاری فون کال نہیں لے رہا تو بہتر ہے اب تم انتظار کرو سکون سے، جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو کرلے گا وہ تمہیں کال۔"
سالار کہہ کر دوبارہ کھانا کھانے لگا۔ امامہ اسی طرح بیٹھی رہی۔
"اب کیا ہوا؟" سالار نے سلاد کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے اس کی خاموشی نوٹس کی۔
"میری خواہش ہے وہ بھی مسلمان ہو جائے اس گمراہی کی دلدل سے نکل آئے۔"
سالار نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا پھر بڑی سنجیدگی سے اسے کہا۔
"تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی زندگی ہے اس کا فیصلہ ہے۔ تم اپنی خواہش اس پر impose (لاگو) نہیں کرسکتیں۔"
"impose تو کر بھی نہیں رہی میں۔" وہ پلیٹ میں چمچ بے مقصد ہلاتے ہوئے دل گرفتہ ہوئی تھی۔
"کبھی کبھی دل چاہتا ہے انسان کا وہ چیزوں کو جادو کی طرح ٹھیک کرنے کی کوشش کرے۔" سالار نے اس کی دل گرفتی محسوس کی پھر جیسے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ "زندگی میں جادو نہیں چلتا۔ عقل چلتی ہے یا قسمت اس کی عقل کام کرے گی اور قسمت میں لکھا ہو گا تو وہ اپنے لیے کوئی اسٹینڈ لے گا ورنہ میں یا تم کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھاتا جا رہا تھا۔
"اور تم دوبارہ کبھی اس سے اس مسئلے پر خود بات نہیں کرو گی نہ ہی اسکول کے حوالے سے کسی گلے شکوے کے لیے اسے بلاؤ گی۔ میں اپنے مسئلوں کو ہینڈل کرسکتا ہوں اور وسیم کچھ نہیں کرسکتا۔"
وہ کہہ کر کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔ امامہ اسی طرح خالی پلیٹ لیے بیٹھی رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی میں اچانک اتنی بے سکونی کہاں سے آگئی تھی۔ وہ fairytale (پریوں کی کہانی) جو چند ماہ پہلے سالار کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور جو اس کے پیروں کو زمین پر ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ اب وہ پریوں کی کہانی کیوں نہیں رہی تھی۔ اس میں پریشانیوں کا جنگل کیسے اگ آیا تھا یا شاید یہ اس کے ستارے تھے جو ایک بار پھر گردش میں آئے ہوئے تھے۔



اسکول کی بلڈنگ کے اسٹرکچر کو واقعی نقصان پہنچا تھا سب کچھ جیسے square one پر آگیا تھا۔ یہ سالار کے لیے حالیہ زندگی کا پہلا بڑا ذاتی مالیاتی نقصان تھا چند گھنٹوں میں سب کچھ راکھ ہو جانے کا مطلب اسے زندگی میں پہلی بار سمجھ میں آیا تھا اور اس پر سب سے بدترین بات یہ تھی کہ اس سارے ایشو میں اس کے سسرال کے ملوث ہونے پر کم از کم اس کی فیملی میں سے کسی کو شبہ نہیں تھا لیکن اسے ثابت کرنا مشکل نہیں تقریباً ناممکن تھا، گاؤں کا کوئی فرد ملوث ہوتا تو پولیس ابتدائی تفتیش کے بعد کسی نہ کسی کو ضرور پکڑ لیتی مگر اس آتش زدگی میں وہاں کے کسی شخص کی انوالومنٹ ظاہر نہیں ہوئی تھی اور جتنے پروفیشنل طریقے سے ایک ہی وقت میں مختلف کیمیکلز کے استعمال سے عمارت کے مختلف حصوں میں وہ آگ لگائی گئی تھی وہ کسی عام چور اچکے کا کام نہیں تھا۔ اگر مقصد اسے نقصان پہنچانا تھا تو اسے بے حد نقصان ہوا تھا اگر مقصد اسے چوٹ پہنچانا تھا تو یہ پیٹ پر ضرب لگانے جیسا تھا۔ وہ دوہرا ہوا تھا منہ کے بل نہیں گرا تھا۔
"اسے چھوڑ دو سالار!" وہ دوسرے ویک اینڈ پر پھر اسلام آباد میں تھا اور طیبہ اس بار جیسے گڑگڑا رہی تھیں۔ وہ اس سب سے اس بار مزید خائف ہو گئی تھیں۔
"تمہیں شادی کا شوق تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب چھوڑ دو اسے۔"

"آپ کو اندازہ ہے کہ آپ مجھے کتنی تکلیف پہنچاتی ہیں جب آپ مجھ سے اس طرح کی بات کرتی ہیں۔"
سالار نے ان کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔
"تم نے دیکھا نہیں انہوں نے کیا کیا ہے؟"
"ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔" اس نے پھر ماں کی بات کاٹی تھی۔
"تم عقل کے اندھے ہو سکتے ہو ہم نہیں۔۔۔ اور کون ہے دشمن تمہارا امامہ کی فیملی کے سوا؟" طیبہ برہم ہو گئی تھیں۔
"اس سب میں امامہ کا کیا قصور ہے؟"
"یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آئی یہ بات؟"
"نہیں آئی۔۔۔ اور نہیں آئے گی۔ میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا' آج بھی کہہ رہا ہوں اور آئندہ بھی یہی کہوں گا۔۔۔ میں امامہ کو "ڈی وورس" نہیں کروں گا۔ کم از کم اس وجہ سے تو نہیں کہ اس کی فیملی مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے۔۔۔ آپ کو کوئی اور بات کرنی ہے تو میں بیٹھتا ہوں۔ اس ایشو پر مجھے نہ آج نہ ہی دوبارہ بات کرنی ہے۔"
طیبہ کچھ بول نہیں سکی تھیں۔ وہ وہی کچھ کہہ رہا تھا جو سکندر کی زبانی وہ پہلے سن چکی تھیں' لیکن انہیں ذرا سی خوش فہمی تھی کہ وہ شاید اس بار کسی نہ کسی طرح اس کو اس بات پر تیار کر سکیں جس کے بارے میں سکندر کو کوئی امید نہیں تھی۔ سکندر اس وقت وہاں نہیں تھے۔ وہ آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھنے کے بعد واپس بیڈ روم میں آیا تو امامہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے گاؤں لے کر نہیں گیا تھا' لیکن اسلام آباد میں ویک اینڈ کے بعد اگلے دو دن ہونے والی کانفرنس کی وجہ سے ساتھ ہی لے آیا تھا۔
وہ اپنا لیپ ٹاپ نکال کر کچھ کام کرنے لگا تھا' جب اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ جس چینل پر تھی وہاں مسلسل اشتہار چل رہے تھے اور وہ صوفہ پر بیٹھی انہیں بے حد یکسوئی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ عام طور پر مسلسل چینل سرفنگ میں معروف رہتی تھی۔ اشتہارات کو دیکھنا بے حد حیران کن تھا۔ سالار نے وقتاً" فوقتاً" دو تین بار اسے اور ٹی وی کو دیکھا تھا اس نے دس منٹ کے دوران اسے ایک بار بھی چائے کا مگ اٹھاتے نہیں دیکھا تھا جو اس کے سامنے ٹیبل پر پڑا تھا اور جس میں سے اب بھاپ اٹھنا بند ہو گئی تھی۔
اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس صوفہ پر آکر بیٹھ گیا۔ امامہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ پکڑ کر ٹی وی آف کر دیا۔
"تم نے میری اور ممی کی باتیں سنی ہیں کیا؟" وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ جن یا جادوگر نہیں تھا' شیطان تھا اور اگر شیطان نہیں تھا تو شیطان کا سینئر منسٹر ضرور تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا بے کار تھا۔ اس نے گردن سیدھی کر لی۔
"ہاں۔ چائے بنانے گئی تھی میں اور تم دونوں لاؤنج میں بات کر رہے تھے میں نے کچن میں سنا سب کچھ۔"
اس نے سر جھکائے کہا وہ اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ طیبہ کے مطالبے نے چند لمحوں کے لیے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ آخری چیز جو وہ تصور کر سکتی تھی' وہ یہی تھی کہ کوئی سالار سے اسے چھوڑنے کے لیے کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی اتنے صاف الفاظ میں' اتنے ہتک آمیز انداز میں۔
"تم جب یہاں آتے ہو وہ یہ کہتی ہیں تم سے؟"
ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے سالار سے پوچھا جو اسے تسلی دینے کے لیے کچھ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔
"نہیں۔ ہر بار نہیں کہتیں۔۔۔ کبھی کبھی وہ اوور ری ایکٹ کر جاتی ہیں۔" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔
"میں اب اسلام آباد کبھی نہیں آؤں گی۔" اس نے یک دم کہا۔

"لیکن میں تو آؤں گا اور میں آؤں گا تو تمہیں بھی آنا پڑے گا۔" الفاظ سیدھے تھے لہجہ نہیں۔ اس نے سالار کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

"تم اپنی ممی کی سائیڈ لے رہے ہو؟"

"ہاں۔ جیسے میں نے ان کے سامنے تمہاری سائیڈ لی۔"

وہ اس کے جواب پر چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا تھا پھر سالار نے کہا۔

"زندگی میں اگر کبھی میرے اور تمہارے درمیان علیحدگی جیسی کوئی چیز ہوئی تو اس کی وجہ میرے پیرنٹس یا میری فیلی نہیں بنے گی' کم از کم یہ ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں۔"

وہ پھر بھی خاموش رہی تھی۔

"کچھ بولو۔"

"کیا بولوں؟"

"جب تم خاموش ہوتی ہو تو بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔"

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"مجھے لگتا ہے تم پتا نہیں اس بات کو کیسے استعمال کرو گی میرے خلاف۔۔۔"

"کبھی" اس نے جملہ مکمل کرنے کے بعد کچھ توقف سے ایک آخری لفظ کا اضافہ کیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی' لیکن خاموش رہی۔ سالار نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم میری بیوی ہو امامہ۔۔۔ وہ میری ماں ہیں۔۔۔ میں تمہیں شٹ اپ کہہ سکتا ہوں' انہیں نہیں کہہ سکتا۔ وہ ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہیں اور ماں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں' جب تم ماں بنو گی تو تم بھی اسی طرح ری ایکٹ کرنے لگو گی۔ انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا' مجھ سے کہا۔ میں نے اگنور کر دیا۔ جس چیز کو میں نے اگنور کر دیا۔ اسے تم سیریسلی لو گی تو یہ حماقت ہو گی۔"

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی' جب وہ خاموش ہوا تو اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"میرے لیے سب کچھ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے لیے ایک کے بعد ایک مسئلہ آ جاتا ہے۔ مجھ سے شادی اچھی نہیں ثابت ہوئی تمہارے لیے۔ ابھی سے اتنے مسئلے ہو رہے ہیں تو پھر بعد میں پتا نہیں۔"

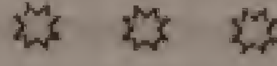
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شادی ایک دوسرے کی قسمت سے نہیں کی جاتی۔ ایک دوسرے کے وجود سے کی جاتی ہے' اچھے دنوں کے ساتھ کے لیے لوگ فرینڈشپ کرتے ہیں شادی نہیں۔

ہم دونوں کا Present' Past' Future "(حال' ماضی' مستقبل) جو بھی ہے' جیسا بھی ہے ایک ساتھ ہی ہے اب۔۔۔ اگر تم کو یہ لگتا ہے کہ میں یہ expect (توقع) کر رہا تھا کہ تم سے شادی کے بعد پہلے میرا پرائز بانڈ نکلے گا' پھر مجھے کوئی بونس ملے گا پھر میری پروموشن ہو گی۔ اور پھر میں لوگوں کے درمیان بیٹھ کر بڑی خوشی سے یہ بتاؤں گا کہ میری لائف میرے لیے بڑی لکی ہے۔۔۔ تو سوری مجھے ایسی کوئی expectatians (توقعات) نہیں تھیں' جو کچھ ہو رہا ہے وہ untimely (بے وقت) ہو سکتا ہے میرے لیے۔ unexpected (غیر متوقع) نہیں ہے میں تمہارے لیے کس حد تک جا سکتا ہوں' کتنا سنسیئر ہوں۔ وہ وقت بتا سکتا ہے اس لیے تم خاموشی سے وقت کو گزرنے دو۔ یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ جاؤ دوبارہ چائے بنالاؤ' پیتے ہیں۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کوئی چیز اس کی آنکھوں میں امڈنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کو زندگی میں کہاں کہاں سے تحفظ دیتا ہے۔ کہاں کہاں سے دیواریں لا کر کھڑی کر دیتا ہے انسان کے گرد۔۔۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کے سائے میں رہتی تھی تو اسے یقین تھا اس سے زیادہ عزت، زیادہ تحفظ کوئی اسے دے ہی نہیں سکتا کم از کم شادی جیسے رشتے سے وہ ذمہ داری کے علاوہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھے ہوئے تھی۔ اب اگر وہ اس شخص کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تو وہ تحفظ کے نئے مفہوم سے آگاہ ہو رہی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امامہ!" سالار نے اس کے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے اس سے نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلاتے اور اپنی ناک رگڑتے ہوئے اٹھ گئی اس کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔



سالار نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا تھا۔ یہ امامہ نہیں جانتی تھی۔ اسکول کی تعمیر دوبارہ کیسے شروع ہوئی تھی اسے یہ بھی نہیں پتا تھا، لیکن اسکول دوبارہ بن رہا تھا، سالار پہلے سے زیادہ مصروف تھا اور اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور طوفان کسی تباہی کے بغیر گزر گیا تھا۔



"مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" سالار نے دو ٹوک انکار کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن مجھے ہے۔" امامہ اصرار کر رہی تھی۔
"یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔" سالار نے اسے بچوں کی طرح بہلایا۔
"کوئی بات نہیں ایک بار دکھانے سے کیا ہو گا؟" اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
"تم کیا جاننا چاہتی ہو اپنے مستقبل کے بارے میں۔۔۔؟ مجھ سے پوچھ لو۔"

سالار اسے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں تھا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد امامہ کو پتا نہیں وہ پامسٹ کہاں سے یاد آ گیا تھا۔
"ویری فنی" اس نے مذاق اڑایا تھا۔ "اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرے کا کیسے ہو گا؟"
"کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟" سالار نے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں اس سے پوچھتے ہیں۔" امامہ کا اصرار بڑھا تھا۔
"دیکھو ہمارا "آج" ٹھیک ہے کافی ہے۔ تمہیں "کل" کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ اب بھی رضامند نہیں ہو رہا تھا۔
"مجھے ہے کل کا مسئلہ۔" وہ کچھ جھلا کر بولی تھی اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح کے رد عمل کا اظہار کرے گا۔
"کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔۔۔ تمہیں پتا ہے میری کولیگز کو اس نے ان کے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا، بھابھی کی بھی کتنی کزنز آئی تھیں اس کے پاس۔۔۔" امامہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔
"بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟" سالار نے جواباً پوچھا تھا۔
"نہیں۔" وہ اٹکی۔
"تو؟"
"تو یہ کہ ان کو انٹرسٹ نہیں ہو گا۔ مجھے تو ہے۔ اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ یک

دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"دکس دن؟" سالار نے جیسے ٹالا۔

"ابھی۔"

وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا' لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تم دکھالو ہاتھ۔"

"تم نہیں دکھاؤ گے؟" اس کے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں بتائے گا وہ پامسٹ۔ وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہوگا۔" امامہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔

"مثلاً" سالار نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"مثلاً" اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی۔ اگر میری ہوگی تو تمہاری بھی تو ہوگی۔"

"ضروری نہیں ہے۔" وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"ہو سکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بڑی بری گزرے تمہارے ساتھ۔"

"تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہوگی۔" امامہ نے کندھے اچکا کر بے نیازی دکھائی۔

"تم عورتیں بڑی سیلفش (خود غرض) ہوتی ہو۔" سالار نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت کی۔

"تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔ ہم کون سا مری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے؟"

امامہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔

"ہاں ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم عورتوں پر۔ عزت کی زندگی راس نہیں آتی شاید اس لیے۔" وہ چند لمحوں بعد بڑبڑایا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے ہم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟" امامہ ہمیشہ کی طرح فوراً" برامان گئی تھی۔

"ہم شاید جنرلائز کر رہے تھے۔" سالار اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔

"نہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو۔"

"تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کے پاس نہیں جاتے۔" سالار نے بے حد سہولت سے اسے موضوع سے ہٹایا۔

"نہیں میں کب ناراض ہوں' ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" امامہ کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔

"ویسے تم پوچھو گی کیا پامسٹ سے؟" سالار نے بات کو مزید گھمایا۔

"بڑی چیزیں ہیں۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا' مگر تب تک وہ پامسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

کرسی ایک طرف رکھے اس پر بیٹھا وہ بغیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پامسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا' لیکن اسے امامہ کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پامسٹ اب امامہ کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے نہ ہی الہامی۔۔۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں' بہرحال مقدر بنانا' سنوارنا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا' پھر اس نے جیسے حیرانی سے اس کے ہاتھ پر کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک بیری پر کچھ میسجز دیکھنے میں مصروف تھا۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔" پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" امامہ نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

"آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟" بلیک بیری پر اپنے میسج چیک کرتے کرتے سالار نے نظر اٹھا کر پامسٹ کو دیکھا' اس کا خیال تھا یہ سوال اس کے لیے تھا' لیکن پامسٹ کا مخاطب اس کی بیوی تھی۔

"ہاں!" امامہ نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ کو اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔

"اوہ۔ اچھا۔" پامسٹ پھر کسی غور و خوض میں مصروف ہو گیا تھا۔

"آپ کے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار' کامیاب۔۔۔ دوسری شادی۔"

پامسٹ نے امامہ کا ہاتھ پکڑے اسے دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ امامہ کا رنگ اڑ گیا تھا اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت تھا۔

"آپ کو یقین ہے؟" امامہ کو لگا جیسے پامسٹ نے کچھ غلط پڑھا تھا اس کے ہاتھ پر۔

"جہاں تک میرا علم ہے اس کے مطابق تو آپ کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں اور دوسری لکیر پہلی لکیر کی نسبت زیادہ واضح ہے۔"

پامسٹ اب بھی اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سالار نے امامہ کے کسی اگلے سوال سے پہلے جیب سے والٹ اور والٹ سے ایک کرنسی نوٹ نکال کر پامسٹ کے سامنے میز پر رکھا' پھر بڑی شائستگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینک یو۔ بس اتنی انفارمیشن کافی ہے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں' ہمیں جانا ہے۔"

اسے اٹھ کر وہاں سے چلتے دیکھ کر امامہ نہ چاہنے کے باوجود اٹھ کر اس کے پیچھے آئی تھی۔

"مجھے ابھی اور بہت کچھ پوچھنا تھا اس سے۔" اس نے خفگی سے سالار کے برابر میں آتے ہوئے کہا۔

"مثلاً"؟" سالار نے کچھ تیکھے انداز میں کہا۔ وہ فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی۔

"اس نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔" امامہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا' لیکن جب وہ پارکنگ میں آگئے تو اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سالار سے کہا۔

"It was your choice" (یہ تمہارا اپنا انتخاب تھا) سالار نے کچھ بے رخی سے کہا تھا۔ "اس نے تمہیں نہیں بلایا تھا' تم خود گئی تھیں اس کے پاس اپنا مستقبل دیکھنے۔۔۔"

"سالار! تم مجھے چھوڑ دو گے کیا؟" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں یک دم کہا۔

"یہ نتیجہ اگر تم نے پامسٹ کی پیش گوئی کے بعد نکالا ہے تو مجھے تم پر افسوس ہے۔" سالار کو غصہ آیا تھا اس پر' امامہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

"ایسے ہی پوچھا ہے میں نے۔"

"تمہیں پہلے کم وہم تھے میرے بارے میں کہ کسی پامسٹ کی مدد کی ضرورت پڑتی۔" سالار کی خفگی کم نہیں ہوئی تھی۔

"دوسری شادی تو وہ تمہاری Predict (پیش گوئی) کر رہا ہے۔ ایک کامیاب خوش گوار ازدواجی زندگی اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم مجھے چھوڑ دو۔"

سالار نے اس بار چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ان کی گاڑی اب مین روڈ پر آچکی تھی۔

"میں تو تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔" امامہ نے سالار کو دیکھے بغیر بے ساختہ کہا۔

"پھر ہو سکتا ہے میں مر جاؤں اور اس کے بعد تمہاری دوسری شادی ہو۔" سالار کو یک دم اسے چڑانے کی سوجھی۔

امامہ نے اس بار اسے خفگی سے دیکھا۔

"تم بے وقوفی کی بات مت کرو۔"

"ویسے تم کر لینا شادی اگر میں مر گیا تو... اکیلی مت رہنا..." امامہ نے کچھ اور برا مانا۔

"میں کچھ اور بات کر رہی ہوں تم کچھ اور بات کرنا شروع ہو جاتے ہو... اور تمہیں اتنی ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سالار کے مشورے نے اسے ڈسٹرب کیا تھا اور یہ اس کے جملے کی بے ربطی میں جھلکا تھا۔ سالار خاموش ہوا۔ امامہ بھی خاموش تھی۔

"تم اصل میں یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے کہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو تم دوسری شادی کر لینا۔" وہ کچھ لمحوں کے بعد یک دم بولی تھی۔ وہ اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا تھا۔

"تو کیا میں نہ کروں؟" سالار نے جان بوجھ کر اسے بڑی سنجیدگی سے چھیڑا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اسے بڑے پریشان انداز میں دیکھا۔

"مجھے پامسٹ کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ پچھتائی تھی۔

"تم مجھ سے سود کے بارے میں سوال کرتی ہو اور خود یہ یقین رکھتی ہو کہ اللہ کے علاوہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کی قسمت کا حال پتا ہو سکتا ہے؟" وہ صاف گو تھا اور ہمیشہ سے تھا مگر اس کی صاف گوئی نے امامہ کو کبھی اس طرح شرمندہ نہیں کیا تھا جس طرح اب کیا تھا۔ گھڑوں پانی پڑنے کا مطلب اسے اب سمجھ آیا تھا۔

"انسان ہوں، فرشتہ تو نہیں ہوں میں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔

"جانتا ہوں اور تمہیں فرشتہ کبھی سمجھا بھی نہیں میں نے، مارجن آف error دیتا ہوں تمہیں، لیکن تم مجھے نہیں دیتیں۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور وہ بہت کم کوئی غلط بات کرتا تھا۔ امامہ کو یہ اعتراف تھا۔

"زندگی اور قسمت کا پتا اگر زائچوں، پانسوں، اعداد، لکیروں اور ستاروں سے لگنے لگتا تو پھر اللہ انسان کو عقل نہ دیتا، بس صرف یہی چیزیں دے کر دنیا میں اتار دیتا۔"

وہ گاڑی چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ شرمندگی سے سن رہی تھی۔

"جب مستقبل بدل نہیں سکتے تو اسے جان کر کیا کریں گے۔ بہتر ہے غیب، غیب ہی رہے۔ اللہ سے اس کی خبر کے بجائے اس کا رحم اور کرم مانگنا زیادہ بہتر ہے۔"

وہ بول ہی نہیں سکی تھی۔ سالار بعض دفعہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا، یہ یقین اور یہ اعتماد تو اس کا

اثاثہ تھا۔ یہ اس کے پاس کیسے چلا گیا تھا۔
اس رات امامہ کو پہلی بار یہ بے چینی ہوئی تھی۔ وہ ساتھی تھے۔ رقیب نہیں تھے 'پر اسے چند لمحوں کے لیے سالار سے رقابت ہوئی تھی۔ وہ ایمان کے درجوں میں اس سے بہت پیچھے تھا۔ وہ اسے پیچھے کیسے چھوڑنے لگا تھا۔



وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا وہ وہاں ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے اور اپنی شادی کے سات ماہ بعد وہاں عمرہ کے لیے آئے تھے۔
احرام میں ملبوس سالار کے برہنہ کندھے کو دیکھتے ہوئے امامہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد وہ خواب یاد آیا تھا۔
سالار کے دائیں کندھے پر کوئی زخم نہیں تھا 'لیکن اس کے بائیں کندھے کی پشت پر اب اس ڈرنا کف کا نشان تھا جو ہاشم مبین نے اسے مارا تھا۔
"تم نے پہلے کبھی مجھے اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا۔" وہ امامہ کے منہ سے اس خواب کا سن کر شاکڈ رہ گیا تھا۔ "کب دیکھا تھا تم نے یہ خواب؟"
امامہ کو تاریخ 'مہینہ 'دن 'وقت 'سب یاد تھا۔ کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ اس دن جلال سے ملی تھی۔۔۔ اتنے سالوں کے لاحاصل انتظار کے بعد۔۔۔
سالار گنگ تھا 'وہ وہی رات تھی جب وہ یہاں امامہ کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ اس آس میں کہ اس کی دعا قبول ہو جائے۔۔۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی دعا قبول ہو رہی تھی۔
"اس دن میں یہاں تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ کو بتایا تھا۔ اس بار وہ ساکت ہوئی۔
"عمرہ کے لیے؟"
سالار نے سر ہلایا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی 'صرف اسے دیکھتی رہی۔
"اس دن تم یہاں نہ ہوتے تو شاید۔۔۔"
ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا تھا 'مگر بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔
"شاید؟" سالار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ یوں جیسے چاہتا تھا وہ بات مکمل کرتی۔۔۔ وہ کیسے کرتی۔ اس سے کہتی یہ کہہ دیتی کہ وہ اس دن یہاں نہ ہوتا تو شاید جلال اس سے ایسی سرد مہری 'ایسی بے رخی نہ برتتا۔۔۔ وہ سب کچھ نہ کہتا جو اس نے کہا تھا۔ وہ اس کے اور جلال کے بیچ میں اللہ کو لے آیا تھا اور اس کے لیے سالار کو یقیناً" اللہ نے ہی چنا تھا۔
ایک گہرا سانس لے کر اس نے سب کچھ جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی 'لیکن سالار کی باتیں اس کی سماعتوں سے چپک گئی تھیں۔
"اتنے سالوں میں جب بھی یہاں آیا 'تمہارے لیے بھی عمرہ کیا تھا میں نے۔"
وہ بڑے سادہ لہجے میں امامہ کو بتا رہا تھا۔ اسے رلا رہا تھا۔
"تمہاری طرف سے ہر سال عید پر قربانی بھی کرتا رہا ہوں میں۔"
"کیوں؟" امامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔
"تم منکوحہ تھیں میری۔۔۔ دور تھیں 'لیکن میری زندگی کا حصہ تھیں۔"
وہ رو گئی تھی۔ اس کے لیے سب کچھ اسی شخص نے کرنا تھا کیا؟
اسے سالار کے حافظ قرآن ہونے کا پتا بھی اسی وقت چلا تھا 'وہ جلال کی نعت سن کر مسحور ہو جاتی تھی اور اب

وہاں حرم میں سالار کی قرات سن کر گنگ تھی۔

"ایسی قرات کہاں سے سیکھی تم نے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"جب قرآن پاک حفظ کیا تب۔ اب تو پرانی بات ہوگئی ہے۔" اس نے بڑے سادہ لہجے میں کہا۔

امامہ کو چند لمحوں کے لیے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"تم نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی نہیں بتایا۔" وہ شاکڈ تھی۔

"تم نے بھی کبھی نہیں بتایا اتنے مہینوں میں۔"

"پتا نہیں کبھی خیال نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ حفاظ ہی ہیں۔ میرا حافظ قرآن ہونا ان کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟"

آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا امامہ کی آنکھوں میں۔ جلال کو پیڈسٹل پر بٹھائے رکھنے کی ایک وجہ اس کا حافظ قرآن ہونا بھی تھا۔ اور آج وہ جس کی بیوی تھی' حافظ قرآن وہ بھی تھا۔ بہت سی نعمتیں پتا نہیں اللہ کس نیکی کے عوض عطا کرتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ دلوں میں کیسے رہتا ہے۔ وہ سنتی آئی تھی' وہ دلوں کو کیسے بوجھ لیتا ہے' وہ دیکھ رہی تھی۔ بس سب کچھ "کن" تھا اللہ کے لیے۔ بس ایسے۔ اتنا ہی سہل۔ آسان۔ پلک جھپکنے سے پہلے۔ سانس آنے سے پہلے۔

اللہ سامنے ہوتا تو وہ اس کے قدموں میں گر کر روتی۔ بہت کچھ "مانگا" تھا' پر یہ تو صرف "چاہا" تھا۔

وہ اتنا کچھ دے رہا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا' وہ ایک بار پھر بھاگ کر حرم میں چلی جائے جہاں سے کچھ دیر پہلے آئی تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟"

وہ اس کے آنسوؤں کی وجہ نہیں جان پایا۔ وہ روتے روتے ہنسی۔

"بہت خوش ہوں اس لیے۔ تمہاری احسان مند ہوں اس لیے۔ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر پا رہی اس لیے۔"

وہ روتی' ہنستی اور کہتی جا رہی تھی۔

"بے وقوف ہو اس لیے۔" سالار نے جیسے خلاصہ کیا۔

"ہاں وہ بھی ہوں۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شاید پہلی بار سالار کی زبان سے اپنے لیے بے وقوف کا لفظ سن کر خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے امامہ نے آنکھیں بند کیں پھر آنکھیں کھول کر حرم کے صحن میں خانہ کعبہ کے بالکل سامنے برابر میں بیٹھے سالار کو دیکھا جو بہت خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔

فبای آلاء ربکما تکذبن۔

"اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

"تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ۔ تم اس پر بہت پچھتاؤ گی۔ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

نو سال پہلے ہاشم مبین نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"ساری دنیا کی ذلت' رسوائی' بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔" انہوں نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ مارا تھا۔

"تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔"

امامہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ایک وقت آئے گا جب تم دوبارہ ہماری طرف لوٹو گی۔۔۔ منت سماجت کرو گی۔۔۔ گڑگڑاؤ گی۔۔۔ تب ہم تمہیں دھتکار دیں گے۔۔۔ تب تم چیخ چیخ کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔۔۔ کہو گی کہ میں غلط تھی۔"
امامہ اشک بار آنکھوں سے مسکرائی۔
"میری خواہش ہے بابا۔" اس نے زیر لب کہا۔ "کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے آؤں اور آپ کو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے۔ میرے چہرے پر کوئی ذلت کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لیے تماشا نہیں بنایا۔ نہ دنیا میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں کسی رسوائی کا سامنا کروں گی۔ اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو صرف اس لیے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیر کامل ہیں میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان کوئی دوسرا نہیں۔ ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے میری آنے والی زندگی میں بھی کبھی اپنے ساتھ شرک کروائے نہ ہی مجھے اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو لا کھڑا کرنے کی جرأت ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی بھر مجھے سیدھے راستے پر رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتی۔"
سالار نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت ختم کرلی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ رکا' پھر سجدے میں چلا گیا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوتے رک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا ختم کی۔ سالار نے ایک بار پھر اٹھنا چاہا اور اٹھ نہیں پایا۔ امامہ نے بہت نرمی سے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
"یہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ جس سے محبت ہوئی' وہ نہیں ملا۔ ایسا پتا ہے کیوں ہوتا ہے؟" رات کے پچھلے پہر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بھیگی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔
"محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے جب میں نے جلال سے محبت کی تو پورے صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں' وظیفے' منتیں۔ کیا تھا جو میں نے نہیں کیا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔"
وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں تھا' اس کے گھٹنے پر دھرا تھا۔
"پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری محبت سے زیادہ صدق تھا۔"
سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے' سالار نے دوبارہ امامہ کے چہرے کو دیکھا۔
"مجھے اب لگتا ہے کہ مجھے اللہ نے بڑے پیار سے بنایا ہے۔ وہ مجھے ایسے کسی شخص کو سونپنے پر تیار نہیں تھا جو میری قدر نہ کرتا' ناقدری کرتا' مجھے ضائع کرتا اور جلال وہ میرے ساتھ یہی سب کرتا۔ وہ میری قدر کبھی نہ کرتا۔ نو سال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتادی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھا دیا اور پھر اس نے مجھے سالار سکندر' کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔"
وہ بے حس و حرکت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس اعتراف اس اظہار کے لیے کون سی جگہ چنی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی اور احترام سے چومتے ہوئے باری باری اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔
"مجھے تم سے کتنی محبت ہوگی۔ میں یہ نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ مگر میں جتنی زندگی بھی تمہارے

ساتھ گزاروں گی۔ تمہاری وفادار اور فرماں بردار رہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے میں زندگی کے ہر مشکل مرحلے' ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں۔ میں برے دنوں میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے جتنی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اسی نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر اتاری' جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لیے سالار نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لیے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی؟ اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیسی بھاری ذمہ داری اپنے لیے لے بیٹھا تھا' اسے اس عورت کا کفیل بنا دیا گیا تھا جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبویا' جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔

اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پارسائی اور تقویٰ' کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"سالار! تم سے ایک چیز مانگوں؟"

امامہ نے جیسے اس کی سوچ کے تسلسل کو روکا تھا۔ وہ اس وقت حرم کے صحن سے باہر نکلنے ہی والے تھے۔ سالار نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس سے کیا مانگنے والی تھی۔

"تم ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ پڑھو۔" سالار کو اندازہ نہیں تھا' وہ اس سے یہ مطالبہ کرنے والی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا۔

"آخری خطبہ؟ وہ بڑبڑایا۔

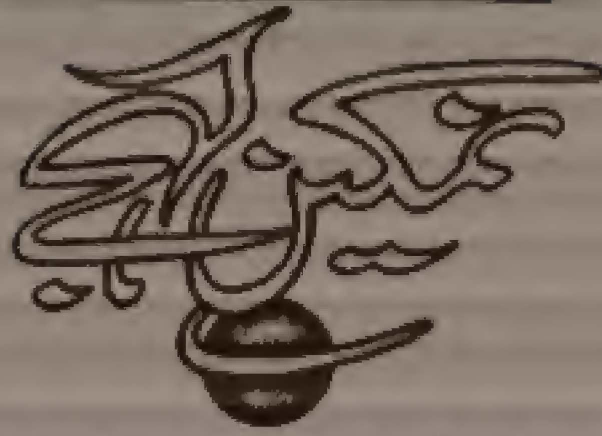
"ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے جبل رحمت کے دامن میں دیا تھا' اس پہاڑ پر جس پر چالیس سال بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حوا بچھڑ کر ملے تھے اور بخشے گئے تھے۔"

امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ ایک جھماکے کے ساتھ سالار کو پتا چل گیا تھا' وہ اسے آخری خطبہ کیوں پڑھوانا چاہتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



قرۃ العین خرم ہاشمی



"اچھا۔ اب بس بھی کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پہ سوار کرلیتی ہو۔ گھنٹوں جلتی کڑھتی رہتی ہو۔ خود بھی پریشان رہتی ہو اور مجھے بھی پریشان کرتی ہو۔"

جنید نے ادھر سے ادھر غصے سے چکر لگاتی اور چیزوں کو پٹختی شانزے سے کہا اور اس کا نازک سا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس صوفے پہ بٹھالیا۔ شانزے منہ بسورتی ہوئی جنید کے پاس صوفے پہ بیٹھ گئی۔ آج اتوار کا دن تھا۔ جنید بہت آرام اور پرسکون انداز میں ٹی وی لاؤنج کے صوفے پہ نیم دراز ٹاک شو دیکھنے میں مگن تھا۔ مگر شانزے کے خراب موڈ کا اندازہ اسے کل رات ہی ہوگیا تھا۔ کل رات عالیہ آپا کے گھر سے واپسی پر سے ہی وہ بہت چپ چپ تھی اور گھر آتے ہی وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"آئندہ میں اپنی کسی نند کے گھر نہیں جاؤں گی۔ آپ نے ملنا ہے تو سو بار ملیں اپنی بہنوں سے۔ مگر مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔"

شانزے نے غصے سے کہتے ہوئے ڈریسنگ روم کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ جنید گہری سانس لے کر ست روی سے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے' ایسا ہی ہونے لگا تھا۔ خاندان میں ہونے والی کسی بھی دعوت سے واپسی پہ شانزے یہ ہی اعلان کرتی تھی اور اس کا موڈ بھی کئی دن آف رہتا تھا۔ رات کافی ہوچکی تھی۔ جنید نے اس وقت خاموشی ہی میں بہتری سمجھی مگر صبح بھی شانزے کو اسی موڈ میں دیکھ کر چپ نہ رہ سکا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر آرام سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ جنید کی ہمدردی پاکر شانزے کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایسی ہی تھی بہت حساس اور جذباتی سی۔

"جنید! ہماری شادی کو تین سال ہوچکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا رویہ آپ کی ساری فیملی کے ساتھ کتنا اچھا اور دوستانہ رہا ہے' مگر پھر بھی!"

شانزے نے نم لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میں جانتا ہوں یار! تم سب سے کتنا پیار کرتی ہو سب کا خیال رکھتی ہو۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہماری پرسکون زندگی میں یہ تلاطم کیوں آگیا ہے۔ پہلے تو سب تم سے اتنا پیار کرتے تھے۔ پھر اب۔" جنید نے الجھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ روبینہ بھابھی ہم سے زیادہ امیر ہیں اور یہ کہ شاید میرے بچے نہیں ہیں تو آپ کے گھر والوں کا رویہ بدل گیا ہے۔" شانزے نے لب کاٹتے ہوئے کہا تو جنید "لاحول ولا" کہہ کر رہ گیا۔

"نہیں شانزے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ ایسی چھوٹی سوچ نہیں رکھتے ہیں۔ تم بلاوجہ کے فضول وہم مت پالو۔"

جنید نے سنجیدگی سے اس کی بات کی نفی کی تھی۔

"اور ویسے بھی ہماری رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں۔ خیر چھوڑو اور اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ تمہاری امی سے ملنے چلتے ہیں' واپسی پہ ڈنر باہر ہی کریں گے۔"

جنید نے شانزے کا دھیان بٹانے کے لیے پروگرام ترتیب دیا تھا اور حسب توقع میکے جانے کا سن کر شانزے کا موڈ خوش گوار ہوگیا تھا اور وہ تیار ہونے چلی



گئی۔ جبکہ جنید سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو ان کی خوش گوار زندگی میں اکثر تلخی گھولنے لگا تھا۔ شانزے کی نظر سے دیکھا جائے تو سب سچ ہی لگ رہا تھا' مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ "نظر" جو دیکھتی ہو وہ سچ بھی ہو اور اگر سچ بھی ہو تو ہر نظر کے دیکھنے کا انداز اپنا ہوتا ہے۔ زاویہ الگ ہوتا ہے۔

اور سچ جو بعض اوقات بہت سی پرتوں کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ جس تک صرف غیر جانب داری اور ذہانت سے ہی پہنچا جاتا ہے اور جنید نے بھی غیر جانب داری سے حالات کا تجزیہ کرنے کی ٹھانی تھی۔



جنید' پانچ بہن' بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ فریدہ باجی سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بعد ریحان بھائی' پھر عالیہ آپا اور ان سے چھوٹے اسد بھائی تھے۔ جنید کے ماں' باپ کا بہت سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ سب بہن' بھائی اپنی اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش اور مگن تھے۔ تین سال پہلے جنید کی شادی بھی بہت دھوم دھام اور ارمانوں سے شانزے سے ہوئی تھی۔

شانزے خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دوستانہ مزاج بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے جلد ہی سب سے گھل مل بھی گئی تھی۔ مخلص اور حساس سی شانزے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جاتی تھی اور اداس بھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے شانزے کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی دونوں نندوں کا رویہ اس کے ساتھ بدلنے لگا ہے۔ بڑی دونوں جٹھانیوں کے ساتھ بہت محبت اور پرجوش انداز سے ملنے والی شانزے سے بہت ریزدہ ہو کر ملنے لگی تھیں۔

ابھی کل ہی کی بات ہے عالیہ آپا اور ان کے شوہر عمرہ کر کے واپس آئے تھے اور عمرے سے واپسی پہ انہوں نے بہت شان دار سی دعوت میں سارے خاندان والوں کو بلایا تھا۔ شانزے نے بہت جوش اور خوشی سے ان کے گھر جانے کی تیاری کی تھی۔ ان کے لیے بہت خوب صورت کپڑے بھی لیے تھے۔ وہاں جانے تک سب کچھ ٹھیک ہی رہا۔ مگر جب فریدہ باجی اور عالیہ آپا نے ہر مہمان کے سامنے ریحان بھائی کی بیوی غزالہ یا اسد کی بیوی روبینہ کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں' تو شانزے کا منہ بن گیا۔ شانزے کے لائے گفٹس کسی بھی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ مگر دونوں نندوں نے شانزے کا نام کم ہی لیا تھا۔ جبکہ غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی کے لائے گفٹس اور خلوص کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔

شانزے یہ سب پچھلے کافی عرصے سے نوٹ کر رہی تھی کہ جس طرح شروع کے پہلے سال میں دونوں بڑی نندیں اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ پیار کرتی تھیں۔ اب اس میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ جو شانزے سے برداشت نہیں ہو رہی تھی اور وہ منفی سوچوں میں گھری تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا اندازہ اسے بھی نہیں ہوتا تھا۔



"شانزے نے مجھے آنے سے پہلے فون کر دیا تھا۔ میں تو کھانے کی تیاری کرنا چاہ رہی تھی' مگر شانزے نے منع کر دیا کہ تم لوگوں کا آج باہر ڈنر کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر پھر بھی میں نے اپنی شانزے کی پسند کی کافی چیزیں تیار کر لی ہیں۔" شانزے کی امی نے چائے کی ٹرالی میں رکھے مختلف لوازمات پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جنید! یہ گاجر کا حلوہ لو۔ خاص تمہارے لیے بنایا ہے۔ شانزے کو میٹھے سے زیادہ نمکین چیزیں پسند ہیں۔ ابھی بھی دیکھو دہی بھلوں پہ کتنا چاٹ مسالا ڈال کر کھا رہی ہے۔"

نزہت بیگم نے مسکرا کر سی سی کرتی شانزے کو دیکھا تھا۔ جنید اچھی طرح سے شانزے کی پسند کو جانتا تھا۔ چائے کی ٹرالی میں زیادہ تر لوازمات نمکین ہی تھے۔

ایک بھرپور دن گزار کر دونوں واپس گھر آئے تو شانزے کا موڈ بہت اچھا ہو چکا تھا۔

جنید نے شکر ادا کیا اور شانزے کو اچھی سی چائے بنانے کا کہہ کر آفس سے لائی فائلز کھول کر بیٹھ گیا۔ شانزے گنگناتی ہوئی کچن میں چلی گئی تھی۔



"جنید! آپ دیکھ لیجیے گا آج بھی وہاں غزالہ بھابھی یا روبینہ بھابھی کی تعریفیں ہو رہی ہوں گی۔"

فریدہ باجی کے گھر کی طرف رواں دواں شانزے نے جنید سے کہا تھا۔ جو دھیان سے گاڑی چلاتا ہوا شانزے کی باتوں پہ ہوں ہاں ہی کر رہا تھا۔ فریدہ باجی کی بڑی بیٹی مناہل جو بیس سال کی تھی۔ اس کی منگنی اس کے تایا کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔ منگنی کی تقریب گھر کے بڑے سے لان میں ہی ارینج کی گئی تھی۔ خاندان کے سب ہی قریبی لوگ مدعو تھے۔ منگنی کا فنکشن بہت خوش اسلوبی سے سرانجام پایا تھا۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ جنید نے فریدہ باجی کے پاس جا کر گھر جانے کی اجازت لی۔ جہاں پہلے ہی غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی موجود تھیں اور انہیں مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ ہر کام میں مدد کی پیش کش بھی کر رہی تھیں۔ فریدہ باجی اتنی محبت اور میٹھے بول سن کر ہی سیراب ہو گئی تھیں۔

"ٹھہرو شانزے! میں نے تم لوگوں کے لیے کھانا پیک کروایا ہے۔ خاص کر پیٹھے کا حلوہ' جنید بہت شوق سے کھاتا ہے۔"

فریدہ باجی نے جنید کے اجازت لینے پر جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"رہنے دیں فریدہ باجی! میں میٹھا اتنے شوق سے نہیں کھاتی ہوں اور جنید بھی آج کل ڈائٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ نہیں کھائیں گے۔ فضول میں ضائع جائے گا۔"

شانزے نے فوراً" منع کرتے ہوئے کہا اور فریدہ باجی کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھے بغیر سب کو خدا حافظ کہتی مڑ گئی' مگر جنید نے یہ سب بہت غور سے دیکھا تھا۔

"فریدہ باجی جلدی سے میرے لیے پیک کیا ہوا حلوہ دیں۔ میں ڈائٹنگ کو کچھ دن چھوڑ بھی سکتا ہوں' اتنے مزے دار حلوے کے لیے۔"

جنید نے شانزے کی بات کا اثر ضائع کرنے کے لیے' ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو فریدہ باجی سرشار سے قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

جنید نے گہری سانس لی تھی اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکریہ ادا کرنے لگا تھا۔ جس نے اسے اپنی "نظر" سے دیکھنے اور درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا کی تھی۔



"دیکھا آپ نے' آج بھی ہر طرف غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ مگر میں نے بھی اب پروا کرنی چھوڑ دی ہے۔"

شانزے لباس تبدیل کر کے کچن میں آئی تو جنید کو سبز چائے کا قہوہ چھینٹتے ہوئے دیکھا۔ کافی عرصہ اکیلے رہنے کی وجہ سے جنید کو بہت سے گھریلو کام کرنے آ گئے تھے اور کشمیری چائے تو وہ بہت اچھی بناتا تھا۔ شانزے کو بہت پسند تھی۔ اس کے ہاتھ کی چائے' مگر جنید بہت موڈ میں ہوتو تب ہی بناتا تھا۔ ورنہ صاف منع کر دیتا تھا اور آج اسے کچن میں مصروف دیکھ کر شانزے کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

سرد رات کے اس پہر کشمیری چائے کا بھی اپنا مزا تھا۔

کچھ دیر میں ہی گرم گرم' خوش گوار مہک اور رنگ والی چائے شانزے کے سامنے تھی۔ شانزے نے بے تابی سے گھونٹ بھرا۔ پھر ایک دم سے ناگوار منہ بنا کر رہ گئی تھی۔

"میری چائے میں لگتا ہے آپ چینی ڈالنا بھول

گئے ہیں۔" شانزے نے سامنے والی کرسی پر براجمان جنید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شوگر پاٹ (چینی دان) اٹھانے لگی۔

"چینی نہیں، نمک ڈالا تو ہے تمہاری چائے میں، لگتا ہے کم ہے، میں اور ڈال دیتا ہوں۔" جنید نے کہتے ہوئے نمک دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"نہیں جنید! نمک، تھوڑا ہی بہت ہے۔ زیادہ ڈالیں گے تو یہ پینے کے قابل نہیں رہے گی۔" شانزے نے جلدی سے اسے روکتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر شانزے! تمہیں نمکین چیزیں زیادہ پسند ہیں نا۔ میٹھے کی نسبت، کشمیری چائے میں بھی تم چینی اور نمک دونوں ہی ڈالتی ہو۔" جنید نے یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں۔ مگر۔ نمک ایک حد تک ہی برداشت ہوتا ہے۔" شانزے نے جھنجلا کر جواب دیا تھا۔

"اور نمکین لہجے۔؟" جنید نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ شانزے ٹھٹک گئی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" شانزے نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"شانزے! شاید تم نے کبھی اس بات پہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ تم سے محبت کرنے والے لوگ اب تمہیں دیکھ کر یا تم سے بات کرتے وقت محتاط کیوں رہتے ہیں؟ اس لیے کہ اپنے جذباتی پن اور ناسمجھی کی وجہ سے تم اکثر بہت سخت اور روکھے لہجے میں جواب دیتی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم سب کے ساتھ مخلص ہو۔ ان کے لیے ہر کام خوش دلی سے کرتی ہو۔ مگر تمہارے لہجے کا تیکھاپن، تمہارے کیے سب اچھے کاموں پہ پانی پھیر دیتا ہے۔ کیا سچ میں ایسا ہی نہیں ہے؟"

جنید نے گم صم سی بیٹھی شانزے سے پوچھا تھا۔ تو وہ گہری سوچ سے باہر آتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ میں شروع سے ہی ایسی ہوں۔ مما نے مجھے بہت بار سرزنش بھی کی کہ لڑکیوں کو بہت سوچ سمجھ کر اور نرمی سے بات کرنی چاہیے۔ خاص کر سسرالی رشتوں کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے۔" شانزے نے فراخ دلی سے اپنی خامی کو تسلیم کیا تھا۔ جس کی وجہ سے جنید کی نظروں میں وہ یک دم ہی بہت اوپر ہو گئی تھی۔ خالص اور سچے دل کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، جن کے دل کینہ اور بغض سے پاک ہوتے ہیں۔

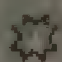
"جنید! اسی وجہ سے سب مجھ سے کترانے لگے ہیں نا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی بہت سمجھ داری اور تحمل کے ساتھ معاملات کو ہینڈل کرتی ہیں۔ ناگوار بات کو بھی اپنے لہجے کی نرمی میں سمو کر پیش کرتی ہیں کہ اگلا بندہ سمجھ بھی جائے اور اسے برا بھی نہ لگے۔ مگر وہ مجھ سے عمر اور تجربے میں بڑی بھی تو ہیں۔ مجھے سیکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر اب میں ایسا کیا کروں کہ سب پہلے کی طرح مجھ سے پیار کرنے لگیں۔" شانزے نے بے چارگی سے پوچھا تھا۔

"کچھ خاص نہیں! صرف اپنی چائے میں چینی ڈال کر دیکھو۔ دونوں کے مناسب تناسب سے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جنید نے شانزے کی چائے میں چینی ڈالتے ہوئے کہا۔ شانزے نے چائے کا گھونٹ لیا، تو خوش گواریت کے احساس کے زیر اثر مسکرانے لگی۔ "نمکین ذائقے ہوں یا نمکین رویے، ایک حد سے زیادہ دونوں ہی برداشت نہیں ہوتے ہیں اور ان کی تلخی کو کم کرنے کے لیے رویوں کی مٹھاس بہت ضروری ہوتی ہے۔ مجھے سمجھ آگئی ہے؟" شانزے نے مزے سے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"کیا سمجھ آئی ہے؟" جنید نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"یہ ہی کہ رشتوں کی مٹھاس لینے کے لیے، لہجوں میں سے نمک کو کم کرنا پڑے گا۔ دونوں مناسب تناسب سے ہوں گے تو زندگی کا ذائقہ بہت خوش گوار ہو جائے گا۔" شانزے نے مسکرا کر جواب دیا۔۔۔ تو جنید نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔



سحر ساجد

وہ پاگل سی

ایک بیچارہ سا... عام سا' نہ امیر نہ غریب... نہ خوب صورت نہ بدصورت... نہ گورا نہ کالا... نہ بہت لمبا نہ بہت چھوٹا... یعنی ہر لحاظ سے درمیانہ سا لڑکا ... مگر اس درمیانے سے لڑکے کو محبت جیسی عام بیماری بڑے ہی عام انداز میں لاحق ہو گئی تھی... اور وہ سخت نالاں ہے... بھئی بہت ہی نالاں ہے محبت سے؟

ارے! نہیں... تو پھر کس سے؟

ان ہی سے جو... خیر چلیے! آپ بھی سنئے اور فیض یاب ہوئیے۔ تو نعمان عابد کی کہانی۔

☆ ☆ ☆

"نعمان عابد کا خط ایک مشہور ڈائجسٹ کی مدیرہ کے نام۔

دیکھیے! میں اتنے غصے میں ہوں کہ سلام کرنا بھول گیا ہوں اور وہ بھی جان بوجھ کر آپ کے ڈائجسٹ میں جتنی بھی مصنفین ہیں۔ خواتین مصنفین" مجھے ان سے اتنی سخت اور انتہائی شدید قسم کی شکایت ہے' کہ میں ان کے خلاف ایف آئی آر کٹوا سکتا ہوں فوجی عدالت تک جا سکتا ہوں' مقدمہ درج کروا سکتا ہوں۔ یہ تو اب اسے میری شرافت ہی مانیے جو میں آپ کو مطلع کر رہا ہوں اور آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرا خط شائع کیا جائے' ورنہ ایف آئی آر... آگے آپ سمجھدار ہیں۔ (فوں فاں کرتے ہوئے بے حد سرخ چہرے اور مزید سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ)

میرا دل چاہتا ہے کہ ان خواتین مصنفین کے قلم




ناولٹ

سیاہی کی قلت کا شکار ہو جائیں۔ معذرت کے ساتھ مگر میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔

غضب خدا کا۔ خدا کی پناہ۔

کیا ان کو معلوم ہے' یہ اپنے قلم کے ذریعے کرتی کیا ہیں؟

کیا وہ جانتی ہیں؟ کیا انہیں معلوم ہے؟ انہیں کیا خبر؟ انہیں کیا معلوم؟۔۔۔

وہ قلم کے پہاڑ ہوتے ہیں جو مجھ جیسے مسکینوں پہ ٹوٹ پڑتے ہیں۔۔۔ دکھ کا ٹنوں انبار ہوتا ہے جس کے نیچے ہم جیسے کئی پستے ہیں۔۔۔ کرب والم کا ایک دریا ہوتا ہے جس میں اپنے جیسے کئی بھائی تو ضرور ہی غرق ہوتے ہوں گے۔

اور یہ لکھاری! ان کو بھی اپنے قلم کا سارا کمال۔ ذہن کی تمام تر صلاحیتیں اور الفاظ کی تمام گانٹھوں کی گرہیں اسی وقت کھولنی یاد آتی ہیں' جب یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ہیرو کو بیان کرتی ہیں۔

یہ صفات۔۔۔ مگر حلیہ ہے کہ مکمل ہونے میں ہی نہیں آرہا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں۔۔۔ مرد حضرات بھی فدا ہو جائیں۔۔۔ اور اپنی انگلیوں کو چبا لینے میں ذرا بھی تردد کا مظاہرہ نہ کریں۔

"خبردار۔۔۔ خط کو بند مت کریں۔ ردی کی ٹوکری کا پیٹ پہلے ہی بہت بھرا ہوا ہے۔ پورا پڑھیے مدیرہ صاحبہ! ورنہ ایف آئی آر۔۔۔ (آنکھیں نکالتے ہوئے دھمکی اسٹائل میں)

ہاں! تو یہ ہیرو نامی مخلوق۔۔۔ مجھے بتایا جائے کیا یہ مریخ سے امپورٹ کیا جاتا ہے یا اس سلسلے میں چاند والوں سے رابطہ کیا جاتا ہے؟

اف۔۔۔ اف' اف اور پھر سے اف۔

کیا اسپائیڈر مین۔۔۔ سپر مین' آئرن مین۔ بیٹ مین اور کیا کیپٹن امریکا؟ اور نا معلوم کون کون سے مین۔۔۔ ماننا پڑے گا بھئی یہ ان ہی مصنفین کا کمال ہے سارے مینوں (Man کی اردو جمع ورژن) کو سمیت ان کی خوبیوں کے۔ یہ صرف ایک ہیرو میں جمع ضرب اور پھر تقسیم کر کے دکھاتی ہیں۔ رہا مائنس۔۔۔ نا نا نا۔۔۔ اس کا تو سوچنا بھی نہیں۔۔۔ مائنس' نفی یا پھر نگیٹو اس کا ہیرو سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔۔۔ نہیں ہو سکتا اور پھر سے نہیں ہو سکتا۔" بندہ خدا! انسانوں کی ہی مخلوق ہے نا وہ؟

اور رہی بات پرسنالٹی کی۔۔۔ لیس جی۔ ادھر تو سمجھئے اخیر ہو گئی انت ہو گئی۔ ایسی آفت شخصیت۔۔۔ جو آج تک آنکھ نے دیکھی اور نہ ہی اس کو یہ شرف کبھی حاصل ہو سکے گا۔

قد یہ چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ اور سات فٹ سے بچتا ہوا۔۔۔ اتنا کہ عالم چنا اپنی قبر میں کانپ کر رہ جائے۔۔۔ (اس کا ریکارڈ جو ٹوٹتے ٹوٹتے بچا)

شکل و صورت ایسی کہ ٹام کروز' بریڈپٹ کی رکھ کر پٹائی کرنے کو دل چاہے۔ حمزہ علی عباسی کو تو دریا برد کردو ۔۔۔ اور فواد خان۔۔۔ اسے تو گولی سے اڑا دو۔

وہ ڈیشنگ' سمیشنگ (Smashing) اور پتا نہیں اور کون کون سے (انگ) وہ تو صرف ہیرو کے لیے ہی بنے ہیں۔

اور اسی پہ سجتے ہیں۔

اور معلوم نہیں وہ کون سی دنیا ہے جو یہ ٹام کروز شروز پہ مرتی ہے (واضح رہے کہ شروز میں بریڈپٹ' حمزہ علی عباسی اور فواد خان شامل ہیں)

"ہے۔۔۔ ہے خبردار۔۔۔ ہوشیار۔ طوالت کا بہانہ ہرگز ہرگز نہیں چلے گا۔ ورنہ ایف آئی آر (تھانے دارانہ اسٹائل) اب بات ہو جائے ذہانت و فطانت کی' وہ ذہانت اور ایسی فطانت۔۔۔ کہ شرلاک ہومز شرما جائے 007 جیمز بونڈ منہ چھپاتا پھرے ٹرانسپورٹر کا فرینک بغلیں جھانکے اور عمران علی (عمران سیریز) کو تو تھپڑ لگانے کو دل چاہے۔

کیا غضب کا ٹیلنٹڈ دماغ پایا ہے ہیرو صاحب نے کہ نیوٹن کے دماغ کو میوزیم سے باہر پھنکوانے کو دل چاہے۔ آنکھوں سے بولتا ہوا۔۔۔ لفظوں سے جادو جگاتا ہوا۔ حرکتوں سے بچھاڑتا ہوا اور مسکراہٹ سے

لڑکیوں کی کثیر تعداد کو فنا کرتا ہوا۔

یہ مجھے ہیرو کم کوئی جانور زیادہ لگتا ہے۔ جراسک پارک کا ڈائنوسار نہ ہو تو۔۔۔ کیسی فینٹسی۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔ (گال پیٹتے ہوئے خالص اماں رشیدن کے اسٹائل میں) اور پھر سے توبہ توبہ۔۔۔ وہ فینٹسی کہ باربی کی ساری موویز کو آگ لگا دو۔ ایسی جادو نگری۔۔۔ کہ ہیری پوٹر فلمز کی سی ڈیاں (C.D کی اردو جمع ورژن) توڑ ڈالو۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ سارے الفاظ آپ کو بے حد بُرے محسوس ہو رہے ہوں گے، مگر کاش کہ آپ میرا دل دیکھ پاتیں۔ کاش کہ آہ! میرا معصوم سا چھوٹا سا بے چارہ سا دل (نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے) اور اور جب یہ محترم ہیرو صاحب (اچانک ہی جلالی غصہ عود کر آیا) رومینس پہ آئے تو کیا رومیو تو کیا جیک ڈاوسن (ٹائی ٹینک کا ہیرو) ان سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہمارے محترم ہیرو صاحب۔ آنکھیں پھٹ جائیں اور دل شق ہو جائیں۔ خواتین قارئین کے۔

اور کاش کہ دانت ڈریکولا جیسے ہو جائیں جو پینے کو خون نہیں۔۔۔ سیاہی مانگے وہ بھی ان خواتین لکھاریوں کے قلم کی (مجھ جیسے سارے بھائیوں کی مشترکہ خواہش) اور ابھی تو میں نے ان جگہوں کا ذکر خیر تو کیا ہی نہیں۔ جو ان مصنفین کے ناولز میں لکھی جاتی ہیں۔

وہ۔۔۔ وہ جگہیں کہ الامان والحفیظ۔۔۔ ایفل ٹاور۔۔۔ نیاگرا فال اور وہ دریائے سین کا مشہور پل۔

بندہ پوچھے۔۔۔ یہ ایفل ٹاور کی جگہ یہ اپنا مینار پاکستان نہیں ہو سکتا تھا کیا؟ چلو مانا کہ ایفل ٹاور۔۔۔ مینار پاکستان سے ذرا سا ہی لمبا ہے۔ مگر یہ بھی کوئی بات ہے جس کی بنا پہ مینار پاکستان کو رومانٹک پلیس نہ مانا جائے۔۔۔ اور اس نیاگرا فال کی جگہ کراچی کا سمندر بھی تو ہو سکتا ہے نا۔۔۔

اور یہ سطور پڑھتے ہوئے مدیرہ بحر حیرت میں غوطہ زن ہو کر اس قدر مشترک کی تلاش میں ہے جو کہ فال (آبشار) اور سمندر میں ہے)

اور۔۔۔ اور (غصے سے کف اڑاتے ہوئے)

اس کافر پل کی جگہ راوی کا پل نہیں ہو سکتا تھا کیا؟ ایک دم مسلمان ان جگہوں پہ جاتے ہوئے اور محبوبہ کو لے جاتے ہوئے میرے بھائیوں کی چیخیں نکل جائیں۔ کراہیں ابل پڑیں۔۔۔ جسم کی چولیں ہل جائیں اور بال ایک رات کیا چند گھنٹوں میں ہی سفید ہو جائیں۔

اتنا خرچہ؟

اب ہر کوئی بزنس ٹائیکون۔۔۔ وزیر، شذیر۔۔۔ انڈسٹری کا مالک تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ کوئی مجھ جیسے غریب سفید پوش۔۔۔ پردہ پوش بھی تو ہوتا ہے۔۔۔ ہیں کہ نہیں؟

خبردار (دانت پیستے ہوئے) جو خط کو غیر ضروری سمجھا ورنہ ایف آئی آر (گردن اکڑا کر سخت تنبیہی انداز)

اب آپ خود انصاف کریں۔۔۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ کیا واقعی ہی یہ ظلم نہیں؟

آہ! میرا دل۔۔۔ وہ درد سے پھٹا جا رہا ہے اور آہ!۔۔۔ آہ! میری جیب وہ مجھ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر روتی ہے اور آخر میں آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ خدارا مجھ پہ اور میرے جیسے کئی دوسروں پہ رحم کیا جائے۔

میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں اور اسی احترام کے ساتھ یہ عرض ہے کہ خدارا۔۔۔ خدارا ایسی مخلوق کو ڈائجسٹ میں ہرگز ہرگز جگہ نہ دی جائے اور آخر میں

(آخر یہ آخر ہو گا کب؟ مدیرہ اب دانت پیستے ہوئے سوچ رہی ہیں) ایک خواہش عرض ہے کہ۔

کاش میں ڈریکولا ہوتا۔۔۔ ایسا ڈریکولا جو کہ پینے کو خون نہیں۔۔۔ سیاہی۔ اب تک تو آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔۔۔ تو پھر اللہ حافظ۔ والسلام

ایک انتہائی مجبور۔۔۔ ہیروز کا ستایا ہوا۔

اور مت غمگین کمار اہوا۔
نعمان عابد!
خصوصی نوٹ!
(اگر شائع کیا جائے۔ وہ بھی پورے کا پورا ورنہ....
ایف آر... نہیں فوجی عدالتیں...!

☼ ☼ ☼

یہ ایک کالج کا منظر ہے۔
کالج کی پتھریلی روش... جس کے دونوں کناروں پہ اونچے اونچے ہرے بھرے سرسبز درخت ہیں اور ان درختوں سے ذرا پرے... روش کے دونوں اطراف

میں خوب صورت لش ہری گھاس گراس کے لان ہیں... جن میں پھولوں کی کیاریاں ہی پھولوں کے بوجھ سے نڈھال دکھائی دیتی ہیں۔
اگر اس پتھریلی روش پہ ناک کی سیدھ میں (اور پطرس کے مطابق اگر ناک ٹیڑھی ہو تو حامل ہذا کو ہر قصور سے مستثنیٰ مانا جائے)
چلتے جائیں تو آپ آڈیٹوریم کے سامنے جا رکیں گے... اگر آپ گھوم کر پیروں کو ذرا سی تکلیف دے کر آڈیٹوریم کی پچھلی طرف پہ جائیں تو وہاں موجود سیڑھیوں پہ آپ کو ایک لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دے گی۔
نرم و نازک سی... کسی شاعر کے خواب سی... ذرا میٹھی سی اور بہت ساری نمکین... اس کا منہ بری طرح سے لٹکا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہے۔ اور وہ عجیب غمناکی کی تصویر بنا ہوا ہے۔
وہ لڑکی غم کی پینٹنگ نظر آتی ہے اور دکھ کی تو گویا عملی تفسیر ہے۔
اس کا سانس جیسے اندر ہی اندر گھٹ رہا ہے۔ اور وہ بار بار گہرے گہرے سانس لے کر تنفس کو بحال کرنے کی اپنی بہترین کوشش میں ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہیں مگر آنسو آنکھوں سے باہر نہیں آپا رہے ہیں۔
اور وہ سخت تکلیف میں ہے۔

آنسو جیسے اس کے دل پہ گر رہے ہیں اور اس کے دل کو کاٹ کاٹ کر خون ہونے کا سبب بن رہے ہیں۔
وہ خلاؤں میں گھور رہی ہے اور اپنے کسی غیر مرئی نکتے کی تلاش میں ہے، جس کو وہ مزید گھور سکے۔
اس خوب صورت سی غمگین لڑکی کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی موجود ہے۔
وہ اس غمگین لڑکی کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے... بے حد ہمدردی سے اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کا تسلی دینے کا ایک انداز ہے مگر... تسلی کسی بھی طرح وقوع پذیر نہیں ہو پا رہی ہے۔
"نائلہ!" بالآخر اس غمگین لڑکی نے اپنے ساتھ موجود لڑکی کو مخاطب کیا تھا۔
"تمہیں معلوم ہے! میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ سب سے بڑا غم کیا ہے؟"
یاد رہے کہ یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ تھوڑی سی میٹھی اور نمکین سی... لڑکی... خود زندگی کا سب سے بڑا دکھ اور سب سے بڑا غم نظر آ رہی تھی۔
"کیا ہوا ہے؟" نائلہ نے بھی انوکھے سے لہجے میں پوچھا۔
وہ چند لمحے ضبط کی آخری منزلوں کو عبور کرتے ہوئے۔ اسے دیکھتی رہی۔ اور پھر اس نے ہونٹ دباتے ہوئے سر جھکایا تھا۔
"میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ..." ذرا سا توقف... شاید اس کے گلے میں آنسو اٹکے تھے۔
"کہ... عالم شاہ مر گیا (جو چلے تو جاں سے گزر گئے کا ہیرو)

اور اب وہ نیم مجنوں حالت میں دور... بہت ہی دور آسمان کی وسعتوں میں کچھ کھوج رہی تھی (شاید عالم شاہ کی روح کو)

☼ ☼ ☼

"صبیح نے پچھلے دو دن سے کھانا نہیں کھایا..."
"کیوں؟" وہ صبیح کے ابو تھے جو اس اطلاع پہ چونکے

تھے۔

"وہ اس کے کسی ناول کا ہیرو... مر مرا گیا ہے۔"

یہ صبح کی امی تھیں جنہوں نے یہ اطلاع کافی چڑچڑے انداز میں پہنچائی تھی۔ اور اس اطلاع پہ صبح کے ابو نے ایسا منہ بنایا تھا کہ جیسے قتل انہیں ہی کروانے ہوں۔

"ہے کدھر؟ بلاؤ اسے۔"

"رہنے دیں۔ کون سا اثر ہونا ہے اس پہ..."

"افوہ! کھائے گی نہیں تو مزید حالت خراب ہو گی، بلاؤ اسے... بات کرتا ہوں میں۔" وہ کچھ جھنجھلا کر بولے تھے۔

تھوڑی دیر بعد... صبح ان کے کمرے میں موجود تھی۔

جاوید صاحب خاموشی سے اسے اندوہناکی اور غمناکی کی تصویر بنے ہوئے دیکھتے رہے تھے پھر ایک گہرا سانس بھر کر انہوں نے اس پر سے نظریں ہٹائی تھیں۔ ان کی بیٹی کچھ ایسی ہی جذباتی تھی۔

"ادھر آؤ... صبح بچے... میرے پاس آؤ۔" انہوں نے بڑے ہی پیار سے پکارا تھا بلکہ پچکارا تھا۔

اور لیں جی... صبح نے منہ بسورنا شروع کر دیا ہے۔

"کیا ہوا؟ میرے بچے! کیوں ایسی حالت بنائی ہے۔" اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جاوید صاحب نے اسے ساتھ لگایا تھا اور بس۔

"ابو!..." وہ جاوید صاحب کے گلے لگ کر اس بے ساختہ انداز میں روئی تھی کہ عرصہ دراز کے بعد شبنم کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

"بس... بس میرے بچے! بتاؤ تو سہی۔"

"عا... عا... عا..." ہچکیاں...

"عالم..." ہچکیاں... "عالم شاہ۔" پھر سے ہچکیاں... "عالم شاہ... مر گیا ابو!" اور وہ رونا کہ خدا کی پناہ...

اور جاوید صاحب... اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو وہ اپنی ہنسی روکنے کی بہترین کوشش میں سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔

"بس... بس میری جان جانا تو سب کو ہے۔ ایک نہ ایک دن، چلو وہ ذرا جلدی چلا گیا۔ بھری جوانی میں ہی سہی... بس کیا کریں۔ موت جوانی تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔ چل میرے بچے چپ ہو جاؤ شاباش۔" اور اس کا دھواں دار قسم کا رونا بتدریج کم ہو رہا تھا۔ اور...

پھر تھوڑی دیر بعد وہ ان سے الگ ہو کر اپنی آنکھیں اور ناک صاف کر رہی تھی... واضح رہے کہ ہچکیاں لیتے ہوئے۔

"چلو میرا بیٹا! اب کھانا کھا لو شاباش! تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو اس کی روح کو تکلیف ہو گی نا۔"

جاوید صاحب نے بھی اسے وہاں پہ ہی لا کر مارا تھا... جہاں پہ وہ مر سکتی تھی۔

"دل نہیں کر رہا ابو!" حسب توقع جواب۔

حسب عادت جاوید صاحب نے قہقہوں کے جم غفیر کو اپنے اندر ہی روکا تھا اور کس طرح روکا تھا... بک ہا... نہ ہی پوچھیے۔

"تھوڑا سا... اپنے ابو کی خاطر، کیا اب مرے ہوئے کی خاطر تم زندوں کو بھول جاؤ گی..." ایموشنل بلیک میلنگ... ماں باپ کا عظیم اور مشہور زمانہ ہتھیار۔

"ابو..." وہ تڑپ کر بولی تھی اور ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ وہ تڑپی کس بات پہ تھی۔ زندوں والی بات پہ؟

ارے نہیں... مرے ہوئے والی بات پہ...

"میں کھانا کھا لیتی ہوں... مگر آپ اسے مرا ہوا نہ کہیے۔ وہ زندہ رہے گا۔ میرے دل میں، کچھ لوگ اس طرح سے مرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں۔"

"واہ... واہ۔" جاوید صاحب عش عش کر اٹھے تھے۔

اس کے فلسفے پہ... نامعلوم کس ناول کا اثر تھا۔ چلو جو بھی تھا۔ وہ کھانا کھانے پہ تیار ہو گئی تھی۔ اتنا ہی بہت تھا۔

✩ ✩ ✩

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا باپ ہے اور کیسی بیٹی ہے۔ بیٹی کا تو خیر لڑکیوں کی اسی قوم سے تعلق تھا، جو کہ ڈائجسٹ، ناولز وغیرہ پڑھتے ہوئے کھانا جلا دیتی ہیں، ہاتھ جھلسا لیتی ہیں جن کو ناولز پڑھتے ہوئے امی کی ایمپلی فائر جیسی آواز بالکل بھی سنائی نہیں دیتی اور جب زور سے دھپ پڑتی ہے تو پھر پتا چلتا ہے وہ دور سے آتی آواز۔۔۔ اتنی بھی دور نہیں تھی۔

وہ ہی قوم۔۔۔ جو کہ ڈائجسٹ، ناولز کو اس طرح سے گم ہو کر پڑھتی ہے، پاس سے بارات گزر جائے۔ بمعہ ڈھول تاشے۔۔۔ شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑے۔۔۔ زلزلہ آجائے یا سیلاب بہہ جائے۔۔۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

وہ ہی قوم جو کسی کالج، کلاس فیلو حتی کہ محلے فیلو کے پاس موجود نیا ڈائجسٹ یا ناول دیکھ کر کسی لسوڑھے جیسی بھکاری بن جاتی ہے۔ اور سونے پہ سہاگہ اس میں بالکل بھی شرم محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہی قوم جو کتابوں کے اندر ناول / ڈائجسٹ چھپا چھپا کر پڑھتی ہے، وہ ہی قوم جن کی رال چکن کڑاہی، بریانی، شوارما یا کبابوں پہ نہیں ٹپکتی۔

وہ ہر اس ناول، ڈائجسٹ پہ لپکتی ہے جو کہ انہوں نے نہ پڑھا ہو۔

اور وہ ہی قوم جو کہ ناول، ڈائجسٹ کو اس طرح سے چٹ کر کے پڑھتی ہے کہ بیچاری دیمک شرمندہ ہو جائے۔

یہ ساری قوم ایسی ہوتی ہے کہ "عالم شاہ میرا ہے" والے جملے پہ آپس میں اس طرح سے لڑتی ہے کہ بات بال نوچنے کی نوبت تک جا پہنچتی ہے۔

اور وہ قوم۔۔۔ جو کہ ہیرو، ہیروئن کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو۔۔۔ بلا کسی توقف کے بہاتی ہے۔ ہاں تو۔۔۔ بیٹی تو ایسی ہی تھی اور ایسی قوم کی سردار کہلانے کا حق محفوظ رکھتی تھی۔ اور ابا جان؟

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ صبح اکلوتی ہو گی یا پھر چار پانچ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہو گی یا پھر یہ کہ وہ گھر بھر میں سب سے چھوٹی ہو گی۔

تو عرض یہ ہے کہ آپ کے سارے مفروضات غلط ہیں۔ صبح کی دو بہنیں اور تین بھائی تھے۔ اور وہ گھر بھر کی لاڈلی بھی نہیں تھی۔



عالم شاہ کی وفات کو پانچ چھ ماہ گزر چکے ہیں اور اب وہ کافی بہتر حالت میں ہے کھاتی پیتی بھی ٹھیک ہے اور سوتی بھی ہے اور کبھی۔۔۔ کسی بات پہ ہنس بھی دیتی ہے۔ صد شکر کہ اس نے یہ ناول اپنی اشاعت کے کافی عرصے بعد پڑھا تھا۔

صبح کو یہ مطالعے کی لت، اپنے ابا جان سے لگی تھی۔ ان کے گھر میں باقاعدہ ڈائجسٹ آتے تھے۔ ابا جان کا لائبریری کارڈ بھی تھا۔ جو ان سے زیادہ صبح کے زیر استعمال تھا۔ اور اس کا اپنا کالج لائبریری کارڈ۔۔۔ وہ تو پوچھیے ہی نہ۔۔۔ سال میں دو دفعہ بنتا تھا۔ ایک دفعہ تعلیمی سال کے آغاز میں اور دوسری دفعہ تعلیمی سال کے درمیان میں۔

اتوار بازار کا اسپیشل دورہ۔۔۔ صرف ناولز کی خاطر کیا جاتا۔۔۔ نہ صرف یہ وہاں آدھی قیمت پہ پرانے ناولز بیچ کر نئے ناول خریدے جاتے۔۔۔ یہ ابا اور صبح کی مشترکہ ہابی تھی۔ ابا کی گھر بھر میں اسی وجہ سے صبح سے ہی زیادہ بنتی تھی۔

وہ دونوں ہی محبت میں بچت کے ضرور ہی قائل تھے۔ واضح رہے کہ کتابوں کی محبت۔

آج کل اس کا دل پہلے کی نسبت کافی حد تک بہل چکا تھا اور وہ اک نیا ناول پڑھ رہی ہے۔ اور وہ بھی بھلا کون سا۔

"امر بیل"۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔

اور ابھی جب کالج وین اسے اس کے گھر والی لین کے باہر اتار کر گئی تھی۔ تو اس سے بالکل بھی صبر نہیں

ہو رہا تھا اتنا بھی نہیں کہ وہ گھر پہنچ جائے۔ کیونکہ وہ آخری صفحات پر تھی۔

عمر جہانگیر کو گولی لگ چکی ہے اور محض گولی لگنے پر ہی وہ سارا دن کالج میں ضبط کر کر کے روتی رہی ہے اور اب جبکہ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو۔

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر "امر بیل" برآمد کیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا

اور جب یہ یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔ سو وہ چلتے ہوئے ناول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے۔ اسے پڑھتے ہوئے۔ اس طرح سے چلتی جا رہی تھی کہ سامنے کنکریٹ کی بنی دیوار بھی آجاتی نہ۔ تو اس میں سے بھی وہ پار گزر جاتی۔

ایویں ہی... بے دھیانی میں ہی سہی' وہ بے حد آہستگی سے چل رہی تھی۔ کیونکہ وہ بے حد تیزی سے صفحات الٹ الٹ کر پڑھ رہی تھی۔

اور دور سے وہ ایسا پیارا لائق بچہ دکھتی تھی کہ جو امتحان ہال میں بس داخل ہونے ہی والا ہو اور جس کو دیکھتے ہی لڑکیوں کی امائیں اور لڑکوں کے باپ اشارے کر کر کے اور طعنے دے دے کر اپنے اپنے بچوں کی مت مار دیں کیونکہ! ناول کے اوپر کور چڑھا ہوا تھا۔ اور وہ کسی ٹیکسٹ بک جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ ہاہاہا

ہاں! تو وہ ناول میں غرق ہو کر چلتی ہوئی تیزی سے صفحات الٹتی جا رہی تھی کہ۔ اچانک ایک زوردار آواز آئی۔ دھڑام۔ اور ناول اس کے ہاتھوں سے نیچے گرا تھا۔ اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کتاب پکڑنے کے سے انداز میں لیے ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ ناقابل یقین تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی تھی اور سانس... نامعلوم وہ کدھر تھا۔ تھا بھی یا نہیں' کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

وہ شدید صدمے میں تھی۔

جس کے بعد انسان پتھر ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور وہ ایسے زلزلے کی زد میں بھی تھی۔ جس کے بعد انسان ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ جاتا ہے' بکھر جاتا ہے۔

مگر سوال اٹھتا ہے کہ کیوں؟

"عمر جہانگیر بھی مر گیا تھا۔"

آنسوؤں کا ریلا تیزی سے آنکھوں کی جانب بڑھا تھا اور پھر آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے شفاف گالوں پہ بہنے لگے تھے۔

سڑک پہ کوئی نہیں تھا۔ بخدا کوئی نہیں تھا مگر نامعلوم وہ کہاں سے آن وارد ہوا تھا۔

"مس... خاتون... سنئے پلیز کیا ہوا؟ اینی پرابلم...

نیڈ ہیلپ ہیلو پلیز۔"

وہ اس کے پاس سے ہو کر گزر جانا چاہتا تھا' مگر اس کی تشویش ناک حالت نے اس کے قدم ہی پکڑ لیے تھے۔

صبح نے اتنی آوازوں پہ... عجیب زومبی اسٹائل میں گردن گھما کر اسے دیکھا کہ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہوا تھا۔

"عمر جہانگیر... عمر جہانگیر۔" ہچکیوں کا طوفان۔

"کیا ہوا عمر کو؟" وہ بے چارہ سمجھا کہ عمر جہانگیر اس کا کوئی عزیز' رشتے دار ہے... کوئی بھائی شائی اور اگر صبح کو اس کی اس سوچ کا پتا چلتا تو وہ سب کچھ بھلا کر کم از کم ایک گھونسا تو اسے ضرور ہی مارتی۔

"مر گیا... عمر جہانگیر بھی مر گیا۔"

اس قدر تڑپ اور تڑپا دینے والے انداز میں کہا گیا تھا کہ سامنے موجود شخص واقعی ہی تڑپ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نہایت ہی ہمدردانہ جذبات ابھرے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ بری طرح سے بوکھلایا تھا۔

"عمر جہانگیر مر گیا۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے صبح جاوید کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح لہرا کر بل کھا کر گھٹنوں کے بل گری تھی۔

"میڈم! مس! دیکھیے سنبھالیے خود کو' آیئے! میں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ دیکھیے' کچھ تو بتایئے؟ یوں تو ایسے کیسے؟ خدارا خود کو سنبھالیے... کہاں رہتی ہیں آپ؟ افوہ کیا کروں؟..."

اور آخر میں کچھ بے چارگی سے اس نے ارد گرد

دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ محترمہ تو صرف عمر جہانگیر کو ہی روئے جارہی تھیں۔

"مر گیا... ایسے کیسے مر گیا۔ ایسے کیسے چھوڑ گیا۔"

وہ روتی جارہی تھی اور بولتی جارہی تھی۔

"دیکھیے... میں ایسے تو آپ کی ہیلپ نہیں کر پاؤں گا نا۔ سنبھالیے خود کو... کچھ تو۔"

مگر آج تو صبح جاوید نے جیسے نہ سنبھلنے کا عہد کر رکھا تھا... وہ مسلسل روئے جارہی تھی اور اس معصوم سے بیچارے سے شخص کو پریشان کیے جارہی تھی۔

ہاں نا! وہ معصوم سا بیچارہ سا نعمان عابد...



"یا اللہ! کیا کروں... کس سے پوچھوں اور کس کو بتاؤں' آخر کروں تو کیا کروں؟"

سخت پریشانی تھی اور قریب تھا کہ اسی پریشانی میں وہ اپنے ہی بال نوچ لیتا کہ... کہ اسے صبح کے بیگ میں سے جھانکتا موبائل نظر آیا تھا۔ اس کے گرنے کی وجہ سے وہ پاکٹ سے تقریباً" باہر ہی آگیا تھا اور بس گرنے کو بے تاب تھا۔

نعمان نے ڈرتے ڈرتے اور جھجکتے جھجکتے اس کے بیگ سے سیل نکالا... وہ اگر ہوش میں ہوتی تو اس حرکت پہ ایک تھپڑ تو ضرور ہی مارتی اسے... آخر کچھ تو کرنا تھا۔ وہ اتنی پیاری سی لڑکی اور وہ بھی روتی ہوئی پیاری سی لڑکی کو... یوں چھوڑ کر چلا جاتا... سخت طعنہ تھا... بھئی مردانگی پہ سخت طعنہ تھا۔

اس نے جلدی جلدی کانٹیکٹس کھولے اور ابو جان پہ رک گیا۔ خوش قسمتی کہ وہ لسٹ پہ ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ کال کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگائی اور سارا کچھ بتانے میں کال کرنے سے بھی زیادہ جلدی دکھائی دی تھی۔ اس کے ابو بھاگے بھاگے آئے تھے۔ یہ لین میں آخر گھر ہی تو تھا۔

"کیا ہوا... صبح میرے بچے... کیا ہوا؟" پریشان ہونا بنتا تھا۔ وہ ہوئے بھی اور بری طرح سے ہوئے۔

قریب تھا کہ وہ اتنے پریشان ہو جاتے کہ خود بھی رو پڑتے... انہیں اس کے پاس گری ہوئی کتاب نظر آئی تھی (تب تک وہ عمر عمر کا ورد کرنا بند کر چکی تھی) انہوں نے ایک نظر بلکتی ہوئی روتی سسکتی صبح پہ ڈالی اور دوسری اس کتاب پہ۔

"کسی ٹیسٹ' شیسٹ میں فیل ہونے پہ یہ حالت تو نہیں ہوتی تھی... اس کی تو؟"

اک انہونی کے خیال کے تحت انہوں نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا کور ہٹایا اور... اور۔

ان کا دل چاہا اس قدر "ہائے وائے" مچانے پہ رکھ کر صبح بچے کو تھپڑ دے ماریں مگر... کیا کرتے یہ بچہ ان کا اپنا ہی بچہ تھا۔

وہ اٹھے... اس کی حالت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے۔

"بیٹے! آپ کا بہت شکریہ! آپ نے واقعتاً مدد کی۔"

وہ اب اس سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"کیا! عمر جہانگیر کوئی رشتے دار تھا۔ قریبی رشتے دار؟" ہاتھ ملاتے ہوئے' ایک نظر صبح پہ ڈالتے ہوئے افسوس سے ذرا سا رک کر اس نے پوچھا تھا۔

"ارے...!" جاوید صاحب بے ساختہ ہنسے۔

"کچھ نہیں برخوردار... کچھ بھی نہیں' بس خیر کبھی آنا گھر تو بتاؤں گا تمہیں کہ عمر جہانگیر کون ہے اور اب کون تھا؟ اسی لین میں رہتے ہو؟"

اس کا ہاتھ ابھی تک جاوید صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ حیرت کے جھٹکوں کی مسلسل زد میں تھا۔ یوں جیسے فالٹ لائن اسی پہ سے ہو کر گزرتی ہو۔

بٹی کے عمل پہ باپ کا ردعمل کافی حیران کن تھا۔

وہ رو رہی تھی۔ باپ حال احوال پوچھنے میں مگن تھا۔ وہ بے سہارا زمین پہ پڑی تھی۔ اور باپ اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

"یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟"

"جی... جی وہ رشید صاحب کا بھانجا ہوں میں ادھر۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا سمجھ گیا۔ خیر ضرور آنا گھر' تمہارا شکریہ چائے پہ ادا کروں گا۔" وہ اب وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

"جی! میں آؤں گا ضرور آؤں گا۔ افسوس کرنے عمر صاحب کا۔۔۔ ابھی اجازت دیجیے۔"

اور بس اس کے کہنے کی دیر تھی کہ۔۔۔

"ہاہاہا۔۔۔" وہاں ایک جناتی قہقہہ ابل پڑا تھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ اب کی بار جاوید صاحب قہقہوں کے جم غفیر کو روک نہیں پائے تھے۔

"آنا۔۔۔ بھئی ضرور ہی آنا۔"

"جی۔۔۔ جی۔" اور وہ بھاگ گیا۔ اب کی بار۔ واقعی ہی میں۔۔۔ جی' جی کہتے ہوئے اور اس مہذب انداز میں کہ اس کا بھاگنا کم از کم بھاگنا نہ لگے۔

اس پہ سے توجہ ہٹی تو جاوید صاحب نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ اور ایک بے اختیار۔۔۔ اک یخ سانس ان کے منہ سے خارج ہوئی تھی۔

وہ اب بے حد تھکے تھکے سے انداز میں سسک رہی تھی۔ یوں جیسے غم سہ سہ کر کوئی تھک جائے اور رو رو کر آنسو خشک جائیں۔

"اس کو یہ کتاب دی کس نے؟ کتنا چھپایا تھا اس کو میں نے مگر۔۔۔ کتابوں کی تو گویا ایسی دشمن ہے کہ خود کتابیں پناہ مانگتی پھریں اور لاحول کا ورد کرتی رہیں۔"

اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے بھی اٹھایا تھا۔

سیل وہ پہلے ہی نعمان سے لے چکے تھے۔ جاوید صاحب نے تسلی کے سے انداز میں اسے ساتھ لگایا اور گھر کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

اور وہ؟

وہ ان کے کندھے کے ساتھ گھسٹتے ہوئے جا رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کا کونا زمین پہ گھسٹ رہا تھا اور وہ عمر جہانگیر کے غم میں ضوفشاں کی طرح غم زدہ دکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس واقعے کو دو دن گزر چکے ہیں اور سب ہی بہن بھائی (بظاہر) اس کے غم میں برابر کے شریک تھے (کیونکہ اگر اسے چھیڑنے کی غلطی کی جاتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے۔۔۔ جیسے آپ نے شیر کی کچھار میں منہ دے دیا ہو یا پھر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہو یا پھر یہ کہ "آ بیل مجھے مار" والی بات کر دی ہو) گھر میں سوگواری کی فضا تھی۔

کھانے کا بائیکاٹ تھا اور کالج سے پورے ایک دن کی چھٹی کی گئی تھی۔ دوسرے دن کی ابو ہرگز ہرگز اجازت جو نہیں دیتے تھے مختلف بہانوں تمہارا دل بہل جائے گا' تم اچھا محسوس کرو گی وغیرہ وغیرہ سے اسے بہلا کر پھسلا کر بھیج دیتے تھے۔ چاہے زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے وہ چپ چپ۔۔۔ اداس اور ویران سی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں۔۔۔ کاجل بھی نہیں ڈالا گیا۔ پورے دو دن سے' حالانکہ دو باتوں سے اس کی موت واقع ہونے کا شدید خطرہ رہتا ہے۔

نمبر ایک۔۔۔ اگر اسے پڑھنے کو کتاب نہ ملے۔

نمبر دو۔۔۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل نہ ڈالے (وہ بھی بیٹ مین اسٹائل میں)

ایسی سوگواری کی فضا میں اور خاموشی کے سے ماحول میں ایک چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی تھی۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ صبح کی نہیں۔ وہ گھنٹی کی آواز تھی۔

دروازے پہ رشید صاحب بمعہ اپنے بھانجے کے موجود تھے۔ ذرا سا گھبراتے ہوئے اور بہت سا پریشان۔

"جاوید صاحب! خیریت ہے۔۔۔ بچہ بتا رہا تھا کہ کوئی فوتگی ہو گئی ہے آپ کے کسی رشتے دار کی۔ کل سڑک پہ آپ کی بچی۔"

شومئی قسمت کہ دروازہ جاوید صاحب نے ہی کھولا تھا اور رشید صاحب انہیں دیکھتے ہی شروع ہو گئے تھے۔

جاوید صاحب نے کچا کھا جانے والے انداز میں

بھانجے کو دیکھا۔ وہ بے چارا سا معصوم سا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ اندر آیئے۔ پلیز اندر تشریف لایئے۔"

"ماموں آپ جائیں میں۔"

"ارے نہیں برخوردار۔۔۔ تمہارا تو شکریہ ادھار ہے' تم کہاں جا سکتے ہو۔"

اس سہمے ہوئے کو مزید سہمایا گیا تھا اور کندھے سے پکڑ کر اس کی "راہ فرار" کی تمام کوششوں پہ ٹھنڈا پانی نہیں۔۔۔ برف کی بالٹی ہی گرادی گئی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ۔۔۔

رشید صاحب کو تو یہ کہہ کر ٹرخا دیا گیا کہ کوئی دور دراز کا رشتہ دار تھا۔ بس بچی خود پہ قابو نہیں رکھ سکی وغیرہ۔ وغیرہ۔

اور معلوم ہے رشید صاحب نے جواب میں کیا کہا۔

"چلیے! جنازہ نہ سہی۔ فاتحہ خوانی ہی کر لیتے ہیں" تو یوں وہاں "عمر جہانگیر" کی روح کے ایصال ثواب کے لیے۔ فاتحہ خوانی کی گئی۔

رشید صاحب تو فاتحہ پڑھ کر اٹھ کر چلے گئے اور فاتحہ خوانی کرتے ہوئے جو حالت' جاوید صاحب کی ہو رہی تھی۔ اف۔۔۔ اب کی بار قہقہوں کا جم غفیر پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ تو اسے چائے کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کے بہانے سے روک لیا گیا تھا۔

"برخوردار! بات یہ ہے کہ۔۔۔"

پھر یہاں سے شروع کر کے۔۔۔ جاوید صاحب نے عالم شاہ سے ہوتے ہوئے "عمر جہانگیر" تک لا کر بات ختم کی تھی۔ وہ آج کی جنریشن کا تھا۔ بات سمجھ سکتا تھا۔ اور اسے کلیئر کر دیا تھا کہ آخر محترم عمر جہانگیر کون تھے؟

وہ دم بخود ہوا۔۔۔ ساکت ہوا اور پھر بے اختیار ہنس دیا۔ اور ہنستا رہا۔

"کمال ہے۔۔۔ کوئی اتنا بھی پاگل ہو سکتا ہے کیا؟"

"نہیں!۔۔۔" جاوید صاحب نے بے ساختہ ٹھنڈا سانس بھرا (کیونکہ صبح کے معاملے میں صرف ٹھنڈے سانس سے کام نہیں چلتا تھا) "ون پیس اونلی دن پیس۔"

اب کے اسے چائے پکڑاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اور وہ نعمان عابد۔۔۔ وہ پھر سے بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اب کی بار ذرا قہقہہ لگا کر۔



وہ رشید صاحب کی علالت کی وجہ سے ان کے ہاں مقیم تھا۔ رشید صاحب کے بچے ابھی چھوٹے تھے اور حال ہی میں وہ بائی پاس کے بعد بستر سے اٹھے تھے۔ اس وجہ سے ان کی بہن نے (جو کہ اسی شہر میں تھی) نعمان کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ ان کے ہاں آئے اس کا پہلا دن تھا اور پہلے دن ہی ایسی کوئی "حسینہ ــــــ" "اگر ٹکرا جائے تو۔ دل کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ وہ آپ سمجھ سکتے ہیں؟

اور یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ روز اسی وقت گھر سے جاب کے لیے نکلتا تھا جب اس کی وین آتی تھی اور بس۔۔۔ لیں جی! ہو گیا آغاز خاموش محبت کا مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ کس مصیبت کا آغاز ہوا تھا۔

وہ برے طریقے سے پھنسنے والا تھا۔ بے حد برے طریقے سے۔



"تمہارا رشتہ آیا ہے!"

اس سے پہلے کہ وہ خالصتاً "ہیروئن والی "کیا؟" ذرا چیخ نما آواز میں کہتی۔ اماں بول پڑی تھیں۔

"زیادہ ہیروئن بننے کی ضرورت نہیں ہے' وہ بھی میرے سامنے۔ باپ کو دکھانا یہ چوچلے۔" بے زاری سے کہتے ہوئے انہوں نے سخت انداز میں اسے گھورا تھا۔ صبح نے برا سا منہ بنایا تھا۔ سارے سین کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔

"کس کا ہے چڑ پوزل؟"

"رشید صاحب کے بھانجے نعمان کا۔۔۔"

"کیا؟" وہ اب اپنے کیا کو دبا نہیں سکی تھی۔ "وہ تو

ذرا بھی ہیرو نہیں دکھتا۔" وہ بے چاری سی پچی۔ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"جتنے بھی ہیرو ہیں نا! اب خیر سے۔۔۔ شادی شدہ ہو چکے ہیں۔ رہ گیا حمزہ علی عباسی تو وہ اب کیا تمہیں گھاس ڈالے گا؟" اماں بھی تو آخر صبح کی اماں تھیں۔

"ٹی وی، فلموں کے ہیروز کی بات نہیں کر رہی میں۔" وہ بدمزہ ہوئی۔

"تو جن ہیروز کی بات کر رہی ہو نا تم، وہ بھی اپنی اپنی ہیروئنوں (ہیروئن کی جمع کا اردو ورژن) کے ہیں۔ تمہارا کوئی نہیں۔ کچھ تو مر مرا چکے ہیں اور جو بچے، انہوں نے اپنی اپنی ہیروئنوں کو ہی سنبھالنا ہے ہم کس کی آس میں ہو؟ کیا سالار امامہ کو چھوڑے گا۔ یا حیدر ایمن کو۔" اماں کو سخت ہی تپ چڑھی تھی۔

"اماں!" وہ ٹھٹکی۔

"تمہارے ابو ہاں کرنے والے ہیں بس۔۔۔ کچھ کہنا ہے تو ان سے جا کر کہو۔"

"کیا۔۔۔؟" یہ کیا اس طرح سے ادا کیا گیا کہ عرصہ دراز تک لوگ "میرا" کی ایکٹنگ بھلا کر اسے یاد رکھنے والے تھے۔



تو پھر یوں ہوا کہ۔۔۔

ابو سے بات کر کے اس نے نعمان سے ایک ملاقات کی اجازت لے لی تھی۔ اور وہ بھی۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ اکیلے میں، وہ الگ بات کہ یہ ملاقات گھر کے ڈرائنگ روم میں ہونا طے پائی تھی۔ جس کے باہر اس کے سارے بہن بھائی کان لگا کر تو ضرور ہی کھڑے ہوں گے۔

تو وہ دن آیا۔۔۔ ملاقات کا دن۔ نعمان خوشی خوشی تیار شیار ہو کر گیا تھا اور صبح نے مرے مرے ہاتھوں سے آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!"

"کیسی ہیں آپ؟"

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اور وہ سٹپٹا گیا (اتنا بے باک سوال؟ نعمان کے خیال میں۔)

صبح نے اس کے سٹپٹانے پہ بے حد مایوس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ یعنی کہ وہ ذرا بھی Daring نہیں تھا۔ ہیروز کی پہلی خوبی ہی ناپید تھی۔ "آوہ!۔۔"

"آپ نے ملنا چاہا تھا مجھ سے، پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

"ہاں! ملنا تھا کیونکہ کچھ سوال کرنے ہیں مجھے۔"

"کون سے سوال؟" نعمان حیران ہو رہا تھا مگر ابھی تک اپنی حیرت پہ قابو پائے ہوئے تھا۔ "جی پوچھیے۔" اس طرح سے مسکرا کر کہا گیا کہ جیسے کہتا ہو "جی جان سے پوچھیے۔"

"پوچھوں؟"

"جی، جی ضرور۔"

"تیار ہو؟"

"بالکل۔۔۔ بالکل۔" وہ سمجھ نہیں پایا۔ اپنی طرف سے پوری تیاری کر کے آیا تھا وہ۔

"تو یہ بتاؤ اگر 15 کو 35 سے ضرب دی جائے اور پھر اس میں 95 جمع کر کے 12 مائنس کر لیا جائے اور پھر باقی رقم کو 2 پہ تقسیم کر دیا جائے تو کیا حاصل جواب ہو گا؟"

وہ منہ کھول کر صبح کو دیکھ رہا تھا۔ صبح بے طرح سے جھنجلائی۔ "بتاؤ نا۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔" وہ بوکھلایا اور بوکھلا کر بے ساختہ اپنی جیبیں کھنگالنے لگا تاکہ وہ سیل میں سے کیلکولیٹر نکال کر حساب کتاب کر کے جواب دے سکے۔

صبح پہلے تو حیرت سے اسے دیکھتی رہی تھی مگر جب وہ سیل نکال کر حساب کتاب کرنے لگا تو۔۔۔ تو اس کے ارمانوں پہ ٹھنڈی برف کی بالٹی گر گئی تھی۔ نہیں گلیشیر ٹوٹ پڑا تھا۔ حالانکہ کوئی بڑے فیگرز نہیں تھے، سادہ سی رقم تھی۔

"رہنے دو۔۔۔" بے حد مایوسی سے کہہ کر اس نے سانس خارج کی تھی۔

اب ہر کوئی سالار سکندر تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہر کوئی آبادی کے 25٪ حصے کو Belong نہیں کر سکتا نا۔ صبح نے سالار کو لسٹ سے باہر نکال دیا تھا۔ پھر جیسے خود کو تسلی کی تھپکی دی۔

"میں کر دیتا ہوں..." نعمان نے یوں کہا کہ جیسے اس کے منہ سے نکلا ہر حرف 'حرف لازم' تھا۔

"نہیں رہنے دو بس!..." وہ بیزار ہوئی۔ "اچھا! کرتے کیا ہو؟"

"ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ "ڈی' فارمیسی کر رکھی ہے میں نے..."

صبح تو اس جواب پہ رونے والی ہو گئی تھی۔ کتنی چڑ تھی نا اسے دوائیوں سے اور وہ تو حیدر مسعود کی طرح بزنس مین بھی نہیں تھا۔ اب یہ زیادتی تھی ایک کھلی زیادتی حالانکہ نومی بیچارے نے تو اپنی طرف سے اسے امپریس ہی کیا تھا۔

"ہائٹ؟"

"5-7"

ایک آدھ انچ کی کمی کے ساتھ اتنی ہائٹ تو اس کے ناولز کی ہیروئین کی ہوتی تھی۔ اور اب صبح دکھی ہونا شروع ہو چکی تھی۔ لیکن امید کا دامن بہر حال تھامے ہوئے تھی۔

"اچھا! او کھے پینڈے لمبیاں نے راواں عشق دیاں گا کر سناؤ..."

اور اس بے چارے کا منہ دوسری دفعہ بے اختیار کھل گیا تھا۔ اب کی بار تھوڑا زیادہ ہی۔

"مجھے گانا نہیں آتا... میں تو باتھ روم سنگر بھی نہیں۔" اس نے بے ساختہ تڑپ کر کہا تھا۔

گیں جی... ڈوب گئی... ڈوب ہی گئی صبح جاوید بحر رنج میں... تو وہ سعد سلطان بھی نہیں تھا۔

"یہ انتخاب ہے ابو کا؟" وہ چند لمحے نم آنکھوں کے ساتھ اس انتخاب کو دیکھتی رہی۔ وہ کوئی ایک تو ہوتا اور وہ بے چارہ اس کی نم آنکھوں کو دیکھ کر بوکھلاتا رہا... مگر پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

صبح نے کچھ سوچا۔ سر اٹھا کر اس انتخاب کو دیکھا۔ پھر کچھ دیر سوچا اور پھر سے اس انتخاب پہ نظریں جما دیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر بار بار بلاوجہ ہی گلا صاف کرتا رہا... چینی سے پہلو بدلتا رہا... مگر کہہ کچھ نہیں پایا۔

صبح نے ایک بخ سانس بھرا اور پھر سے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

"فرض کرو میں اور تم شدید سردی کی رات میں کہیں باہر روڈ پہ ہیں کہ اچانک بارش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے صرف اک شال لی ہوئی ہے۔ جبکہ تم نے جیکٹ پہن رکھی ہے۔ تو کیا تم مجھے سردی سے بچانے کے لیے... اپنی جیکٹ اتار کر دو گے؟" بڑی ہی آس سے پوچھا گیا۔ دراصل اس کا رومانس لیول چیک کیا گیا تھا۔

اور وہ نعمان عابد... جو ابھی تک اس کے سوالوں کے جواب ٹھیک طرح سے دے نہیں پایا تھا تو اب کی بار اسے ایسا لگا کہ... وہ اسے ضرور ہی متاثر کر سکے گا۔ ... اب کی بار تو ضرور ہی... اس نے مسکرا کر اور قدرے دلچسپی سے صبح کو دیکھا۔

صبح کو بے اختیار ڈھارس ہوئی۔

"میں تمہیں کیوں جیکٹ دوں گا؟ میں تمہیں اتنی ٹھنڈ میں... صرف ایک شال میں باہر تھوڑی لے کر جاؤں گا... میں گھر سے نکلتے ہی تم سے کہوں گا کہ سوئٹر پہن لو اور پھر بھی تم نے نہیں پہنا تو میں خود تمہارا سوئٹر کیری کر لوں گا..."

"ہو گیا رومانس؟ پڑ گئی ٹھنڈ... کھل گیا نا منہ؟" صبح کے لیے بس یہ آخری دھچکا تھا۔

وہ کھلے منہ اور بے حد شاک کی حالت اور رنج و غم کی سی کیفیت کے ساتھ اس انتخاب کو دیکھ رہی تھی' وہ تو اسے ایک جیکٹ دینے کا روادار نہیں تھا جاذب سلطان خاک بنتا۔

"مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔" بالکل قطعی انداز میں اس نے نعمان سے کہا تھا۔

"کیوں؟" وہ بے طرح سے گھبرایا اور پھر بوکھلایا۔

"تم سالار سکندر کی طرح ذہین نہیں ٹھیک ہے۔ میں نے کمپرومائز کیا۔ تم حیدر مسعود کی طرح بزنس مین نہیں ۔۔۔ میں نے پھر بھی قبول کر لیا۔ تم سعد سلطان کی طرح گا نہیں سکتے۔ اٹس اوکے۔ چلو اب ہر بندہ گا بھی نہیں سکتا۔ صبر شکر کر لیا میں نے۔ تمہاری ہائٹ اس کو تو میں نے آنکھیں بند کر کے نظر انداز کیا۔ سمجھو کہ جبر کیا اور اب۔ اب یہ کیا؟ جاذب سلطان کی طرح کیا تم تو اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔"

یہ واضح رہے کہ شرم کی وجہ سے وہ یہ نہیں کہہ پائی تھی کہ جاذب سلطان کی طرح رومانٹک ہ؟"

"یہ قابل قبول نہیں ۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔ ہرگز ہرگز بھی نہیں اور ابھی تو میں نے پرسنالٹی کی بات چھیڑی ہی نہیں' یاد رہے۔"

ایک ابرو اچکا کر ۔۔۔ ذرا سی سنجیدگی اور بہت ساری خفگی کے ساتھ وہ تیکھا تیکھا بول رہی تھی۔ اور وہ جو اس کی بات اچھے خاصے موڈ میں سن رہا تھا۔ تو اب سنتے سنتے موڈ خراب کر چکا تھا۔

رقیب' ایک بھی ہو تو وہ "روسیاہ" کہلاتا ہے اور یہاں تو رقیبوں کی ایک فوج جمع تھی۔ مرد بچہ تھا' موڈ تو بگڑنا ہی تھا۔

"کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ یہ "سالار سکندر" "حیدر مسعود" "سعد سلطان" اور "جاذب سلطان" کون ہیں؟"

(لیں جی! ۔۔۔ خود ہی مارلی ۔۔۔ اس مرد بچے نے اپنے ہی پاؤں پہ خود ہی کلہاڑی مارلی)

"تم ناول نہیں پڑھتے؟" اس تکلیف کے ساتھ پوچھا گیا تھا کہ جو تب محسوس ہوتی ہے جب پیٹ میں گھونسا پڑتا ہے۔ اور وہ بھی بہت زور کا ۔۔۔

"نہیں ۔۔۔" وہ بے ساختگی میں بول اٹھا ۔۔۔ ہائے اور کلہاڑی۔

"آآآ ۔۔۔" اور بس اس کا منہ "آ" کے انداز میں ہی کھلا رہ گیا تھا اور وہ ہاتھ کی انگلیاں اس کھلے منہ پہ رکھے زندگی کا سب سے عظیم اور سب سے بدترین حیرت کا جھٹکا کھا کر بے ساختہ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس انداز میں دیکھ دیکھ کر اسے بھی حیران کر رہی تھی۔

اور اب اگر اس کی شادی اپنی محبت سے نہ ہوتی تو کوئی افسوس نہیں تھا۔ اسے یاد رکھنا چاہیے تھا کہ جو لڑکی سڑک پر گر کر "عمر جہانگیر" کے لیے ہائے وائے ڈال کر رو سکتی ہے ۔۔۔ تو وہ اور کیا کیا کر سکتی ہے اسے یاد رکھنا چاہیے تھا۔ قصور اب اس کا اپنا ہی تو تھا۔ سو بھگتے اب۔



اسے لگا کہ شادی سے انکار ناول نہ پڑھنے کی بنیاد پر ہوا تھا اور اس جیسے آدمی کو محسوس بھی یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

وہ آدمی جو کہ اخبار کو بھی پورا ہفتہ لگا کر ختم کرتا ہو۔ وہ کہاں سمجھ سکتا تھا ان "فیلنگز" کو جن کی بنا پہ انکار ہوا تھا' وہ سمجھتا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی وجہ تو نہیں تھی کہ ختم نہ کی جاسکے۔

وہ اتنا تو ضرور ہی پڑھا لکھا تھا کہ اردو' پڑھ لیتا تو ناول کیوں نہیں؟ آخر کیوں نہیں ۔۔۔ سو پہلی فرصت میں وہ ایک بک شاپ پہ چلا گیا۔ اور جاتے ہی اس نے بھلا کیا کہا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم اسلام ۔۔۔"

"مجھے کچھ کتابیں چاہئیں ۔۔۔؟"

"جی! کون کون سی ۔۔۔ نام بتایئے۔"

"نام ۔۔۔؟" اسے جھٹکا لگا۔ "وہ تو نہیں معلوم۔"

اب کے جھٹکا کھانے کی باری دکان دار کی تھی۔

"آپ کتابیں ہی خریدنے آئے ہیں نا؟" اس نے عینک کے اوپر سے اسے مشکوک انداز میں گھورا تھا۔

"ہاں ۔۔۔ لینی تو کتابیں؟ آ ۔۔۔ ہاں نہیں ناول ہیں ..." بڑبڑاتے' بڑبڑاتے وہ یکدم پُرجوش ہو کر بولا تھا۔

"او بھائی ۔۔۔ ناول بھی بنا نام کے نہیں ہوتے ۔۔۔"

دکان دار اب کے ذرا بیزار ہوا تھا۔ یہ کیسا کتابوں کا شوقین تھا؟

''اچھا!'' اس کا منہ لٹک گیا اب کیا حوالہ دے؟ ہاں۔۔۔ ہاں۔ وہ نام کون سے نام تھے جو صبح نے لیے تھے۔

''حیدر سلطان۔ سالار مسعود جاذب سکندر اور سلطان سعد یا پھر شاید سعد سلطان۔۔۔ ان۔۔۔ ان ناموں والے ناولز ہیں؟''

رک رک کر اور سوچ سوچ کر بولتے ہوئے وہ دکان دار کے لیے ایک لطیفہ بن رہا تھا۔ چلتا پھرتا اس نے بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا تھا۔ اس نے مطلوبہ ناولز اس کے سامنے رکھنے شروع کر دیے تھے۔

آخر تو وہ بک سیلر تھا کیا اتنا بھی نہ جانتا۔ ناموں کی گڑبڑ ضرور تھی۔ مگر آخر کو وہ بک سیلر تھا۔

''لیں جی! اب کے نعمان عابد صاحب کا منہ ہونقوں کی طرح سلوموشن میں کھلنا شروع ہو چکا تھا۔

اور ایسا بھلا کیوں ہوا؟

ان ناولز کی ضخامت کو دیکھ دیکھ کر۔

''محبوبہ کے لیے لے رہے ہو؟۔۔۔'' دکان دار نے اس ناولز کے بنڈل کے اوپر ہاتھ رکھ کر ذرا سے چھیڑنے کے سے انداز میں پوچھا۔

''جی۔۔۔؟''

''یا پھر یہ کہ محبوبہ کی محبت میں لے رہے ہو؟''

اور اب کی بار وہ بیچارہ ''جی'' کہنے لائق بھی نہ رہا تھا۔ کھسیا کر والٹ سے پیسے نکالنے لگا تھا۔

اور پیسے ادا کرتے ہوئے اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ اب بک لور تھوڑا ہی تھا جو کہ ہنس کر کتابوں کے لیے جیب خالی کر دیتا۔ کتاب خریدنا اس کے لیے دنیا کا سب سے غیر ضروری کام تھا۔ ان ناولز کا بل اسے کراہنے پہ مجبور کر رہا تھا اور وہ اپنی کراہوں پہ قابو پانے پہ مجبور ہو رہا تھا۔ آخر کو محبت جیسی واردات جو ہو چکی۔



تو قارئین کرام۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ۔۔۔ وہ شخص جو ایک دن کے اخبار کو پورا ہفتہ لگا کر ختم کرتا ہو۔ کسی ایسے شخص کو وہ چند ناولز پڑھنے پڑ جائیں تو اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

اسے اس کام کے لیے کئی سال درکار تھے اور اگر وہ کئی سال لگا دیتا تو صبح جاوید اسے کیا ملتی؟ ہاں البتہ! اس کے بچے ضرور اسے ماموں کہہ کر پکارتے تو اسے یہ کام کرنا تھا اور چند دنوں میں ہی کرنا تھا۔

اس نے شروعات چائے کے بالٹی جیسے بھرے کپوں سے کی تھی۔

افاقہ؟

چچ چچ چچ۔۔۔ نہیں ہوا۔

دوسرے سے تیسرے صفحے پہ ہی جمائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔۔۔ چوتھے پہ آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ پانچویں پہ الفاظ اس کے سامنے کتھک ڈانس پیش کرنے لگتے اور چھٹے پہ بس جی۔

چھٹے صفحے پہ وہ ڈھیر ہو جاتا۔ صبح کو یا تو وہ کتاب کے اوپر پایا جاتا یا پھر کتاب اس کے اوپر۔۔۔'' پھر چائے کو موقوف کر کے کافی کے مگ شروع کیے گئے۔

''افاقہ؟''

''چچ چچ چچ۔ کیسے ہو سکتا بھلا؟''

اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے تو وہ وقتاً ''فوقتاً'' آزماتا ہی رہا تھا۔ وہ یہ بھی کر چکا کہ سردی میں نہا کر ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ کر پڑھنے لگا مگر دوسرے دن ہی بخار اور زکام۔ اب بس یہ ہی ٹوٹکہ رہ گیا تھا کہ وہ سر کے بالوں کو رسی کی مدد سے پنکھے سے باندھ لیتا۔

ظاہر ہے۔۔۔ وہ اب ایسا نہیں کر سکتا تھا تو؟

تو یہ کہ زندگی میں پہلی بار وہ رونے پہ مجبور ہوا تھا۔

اسے مطالعے کی عادت تھی اور نہ ہی اس نے نصاب کی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب پڑھی تھی اس میں وہ حس ناپید تھی جو کہ کتاب پڑھنے پہ مجبور کرتی ہے۔'' صبح جاوید تمہیں تو اللہ ہی پوچھے۔۔۔ تم نے کیسے مرد بچے کو رونے پہ مجبور کر دیا۔''

ایسا تو ڈی فارمیسی کی کتابوں نے اس کے ساتھ نہیں کیا تھا اور یہ حال تو لمبے لمبے اوکھے اوکھے سے فارمولاز نے بھی نہیں کیا تھا جو یہ ناولز اس کے ساتھ کر رہے تھے۔

تب اس کا دل چاہتا۔ لات مارے اپنی محبت پہ۔۔۔ گولی مار کر اپنے ہی سینے میں دفن کر ڈالے۔

اور بھول جائے صبح کو اور شام کر ڈالے اپنی ہی زندگی کی۔

مگر اف کہ وہ صبح، جیسی صبح! جو کہ روز صبح اس کے راستے میں کسی کالی بلی کی طرح آجاتی اور اس کے ہر پلان ہر عہد کا ستیاناس کر کے رکھ دیتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی اور دل کسی بڑے ہی برے ضدی بچے کی طرح ایڑیاں مار مار کر رونے لگتا۔ ایسا ضدی بچہ جو لالی پاپ سے بھی نہ بہلتا ہو تو پھر ہے۔

کبھی کتاب اس کے اوپر پائی جاتی تو کبھی وہ کتاب کے اوپر پایا جاتا تھا۔



اور پھر قارئین!

اس نے وہ معرکہ مارا کہ آج تک کسی ہیرو، کسی عاشق کسی مجنوں، کسی فرہاد، کسی دیو داس نے نہ مارا ہو گا۔ یہ تخت چھوڑنے سے بھی مشکل تھا اور اس کے بجائے وہ نہر آسانی سے کھود لیتا۔ محبت میں اس نے ناولز کی ایک کثیر تعداد حفظ کر ڈالی تھی۔

محبت ہو تو ایسی۔۔۔ عاشق ہو تو ایسا۔۔۔ ناممکن کے نا کو ہٹا دینے والا۔

اس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ جان گیا۔ کہ حیدر، سالار، جاذب اور سعد کے اباؤں کا نام کیا کیا تھا؟

مگر نقصان بھی ہوا۔ اور وہ یہ ہوا کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کون سی فیلنگز تھیں جن کے تحت اسے انکار ہوا تھا۔ وہ جتنے اور ناولز پڑھتا اس کا غصہ، جھنجلاہٹ اور چڑچڑاہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ ناول لکھنے والوں میں ایک کثیر تعداد خواتین کی تھی اور وہ ڈائجسٹ کی دنیا سے بھی نابلد نہیں رہا تھا۔

اور بس۔۔۔ یہ وہی وقت تھا جب نعمان عابد عرف مصنفین کا مارا اور ہیروز کا ستایا ہوا۔۔۔ ایک خط لکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اور کس طرح سے غصہ نکال سکتا تھا۔ وہ یہ ہی کر سکتا تھا۔ سو اس نے وہ ہی کیا۔ اس کیفیت میں۔۔۔ وہ کیفیت جو کہ انسان کو خودکشی پہ مجبور کر دیتی ہے۔

اور ادھر صبح کے گھر میں کیا ہو رہا تھا بھلا؟ اماں کا غصہ اس سوا نیزے پہ تھا کہ جس کے بعد قیامت کا آنا اٹل تھا۔

وہ ابا ہی تھے جو اب تک انہیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ تو اسے مار مار کر سارا ہیرو نامہ 'ناک کے راستے باہر نکال دیتیں اور ابا۔ وہ اسے 'سمجھانے' 'پچکارنے اور منانے میں مصروف تھے۔ اور اس کوشش میں تھے کہ جلالی اباؤں 'والی ٹرک انہیں آزمانا نہ پڑے۔

مگر یہ صبح! اس کا ایک ہی رونا تھا۔ مجھے سالار 'حیدر' سعد 'جاذب جیسا کوئی ہیرو چاہیے (عمر جہانگیر اور عالم شاہ کا نام وہ مر کر بھی نہ لیتی۔ اسے بھری جوانی میں بیوہ ہو جانا منظور نہیں تھا)

اور پھر ایک دن کیا ہوا کہ۔۔۔

انہوں نے بڑے مان سے (اور کچھ جذباتی اداکاری کرتے ہوئے) اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔

"صبح! تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے لیے کسی غلط آدمی کا انتخاب کر سکتا ہے؟ بولو بچے! کیا ایسا کر سکتا ہوں میں؟ (وہ بھی آخر صبح کے ابو تھے بھئی) اور بس۔

جذباتی ہوتی ہیں نالڑکیاں اور وہ جو جذباتیت کا چلتا پھرتا اشتہار تھی 'کیسے نہ مانتی۔

اتنے مان سے جو ہاتھ اس کے سر پہ دھرا ہوا تھا۔ کیسے ہٹا کر اسے کیسے جھٹک دیتی آخر کو وہ جذباتیت کا ایک اشتہار تھی۔۔۔ وہ بھی چلتا پھرتا ہوا۔



تو قارئین۔۔۔ پھر سب کچھ سیدھا ہوتا چلا گیا تھا مگر شادی سے ایک ماہ پہلے۔۔۔ نعمان ’جاوید صاحب کے پاس آیا تھا اور اس نے جو کہا اس پہ جاوید صاحب منہ کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"کیوں برخوردار۔۔۔ یہ کتابی سی خواہش تمہیں کیوں محسوس ہونے لگی؟" وہ ذرا خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ وہ مسکرایا۔

"آپ بھول رہے ہیں ایسی کتابی خواہشات آپ کی بیٹی کو لاحق ہیں۔۔۔ وہ ایسی خواہشات کہ ہر ہر خواہش پہ اس کی نہیں مجھ بے چارے کی "آہ" نکلتی ہے۔ آپ نکاح کردیں۔۔۔ اس کی کچھ خواہشات تو پوری کرسکوں میں۔۔۔ اور دین و دنیا کا اعتراض بھی ختم ہوجائے۔"

اب کی بار وہ مرد بچہ۔۔۔ ذرا سا بے چارہ بچہ بنا تھا۔ اور جاوید صاحب نے خوش ہو کر اسے دیکھا تھا۔

ان کا انتخاب غلط نہیں تھا۔۔۔ بالکل بھی غلط نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

بمورخہ یکم جنوری 2015ء۔

موسم۔۔۔ ظاہر ہے سردی کا

وقت۔۔۔ رات دو بجے کا

موسم کی کیفیت۔۔۔ انتہائی شدید ٹھنڈ۔۔۔

ایسے میں رات دو بجے نعمان کا فون گدھے کی طرح بولنا شروع ہوتا ہے۔ وہ نیند میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا ہے مگر موبائل پھر بھی نہیں ملتا۔

وہ اپنی کوشش موقوف کرکے سونا چاہتا ہے مگر جب ’ گدھا محترم آپ کے کان کے نیچے ڈھینچوں شروع کردے تو کیا آپ سو سکتے ہیں؟ یقیناً "نہیں سو سکتے۔

"ہیلو؟" نیند کے نشے میں ڈوبا ہیلو۔ جو کہ نعمان کی طرف سے ادا ہوا تھا۔

"سنو۔۔۔"

"کون ہے؟"

اور کون نے بے حد خفگی سے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو فون کی پہلی بیل پہ ہی جان جاتا کہ یہ کر ‌یہ فارمولا زجیسا ڈل آدمی۔۔۔ ہونہہ۔

"صبح بول رہی ہوں۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"ہائیں۔۔۔ صبح۔۔۔ خیریت۔۔۔ اس وقت گھر پہ سب ٹھیک ہے۔ انکل تو ٹھیک ہیں۔ کیا آنٹی ٹھیک نہیں؟" ہڑبڑا کر کیے جانے والے سوال۔

ہو گیا نا بیڑا غرق۔۔۔ سارے رومانس کا۔۔۔ صبح جی بھر کے بدمزا ہوئی مگر حسب عادت ہمت نہ ہاری۔

"سب ٹھیک ہے۔ کیا تم میری بات سنو گے؟"

"ہاں بولو؟" اور اب تک نعمان کافی حد تک جاگ چکا تھا۔

"ابھی کیا تم مجھ سے ملنے آسکتے ہو؟" اور اس فرمائش پہ وہ بے ساختہ کراہا۔

"صبح یار! بہت ٹھنڈ ہے باہر۔۔۔ 3 پہ پہنچا ہوا ہے ٹمپریچر۔۔۔" بے اختیار وہ منمنایا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کی کتابی ’ناولٹی فرمائشیں پوری کرنی ہیں۔

"تم۔۔۔" صبح نے دانت پیس کر کہا اور فون پٹخ ڈالا تھا۔ اور اب وہ رو رہی تھی۔ زارو قطار۔۔۔ یہ تھا اس کا ہیرو جو کہ اپنی منکوحہ کی ذرا سی فرمائش نہیں پوری کر سکتا تھا۔

آہ! کہ اس کی فرمائشیں۔

☆ ☆ ☆

مورخا 2 جنوری 2015ء۔

موسم۔۔۔ ٹھنڈ

وقت رات دو بجے کا

اور حالت موسم۔۔۔ شدید سردی۔

اس کا موبائل الارم کی طرح اونچی آواز میں بجنے لگا۔ اس نے نیند میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔۔۔ سیل کو نہیں ملنا تھا۔۔۔ نہیں ملا۔

سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش موقوف کرکے اس نے سونا چاہا تو۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا بھلا جبکہ سیل فون کان کے نیچے الارم کی طرح۔۔۔ خیر اس نے فون اٹھایا اور نیند میں ڈوبی آواز میں بولی۔

"ہیلو!"

"تم سوئی ہوئی ہو...؟" دوسری طرف سے دنیا کا سب سے احمقانہ ترین سوال پوچھا گیا۔

"ہاں! سو رہی ہوں۔" اور پہلی طرف سے پوری کائنات کا بے تکا ترین جواب دیا گیا۔

"وہ کل تم نے کہا تھا کہ تم سے ملنے آ سکتا..."

"چلو کوئی بات نہیں پھر سہی..."

اور صبح کے پورے کے پورے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ کل کی خواہش آج پوری کر رہا تھا اور اگر اس طرح ہو نا رہا تو... ہو گئیں ساری حسرتیں پوری۔ بے ساختہ وہ تلملائی تھی۔

"تمہیں آج یاد آیا ہے۔" وہ سچ میں "غرائی" ہی تھی۔

"کل تو میں سو رہا تھا۔ مشکل تھا نکلنا... آج میں اسی لیے جاگ رہا تھا۔ تم نے فون نہیں کیا تو... میں نے کر لیا۔ سوچا پوچھ لوں میں آؤں؟"

ہائے ایسی معصومیت کہ صدقے واری ہو جانے کو دل چاہے۔ پہلے تو صبح کو غصہ آیا مگر جب اس نے کہا کہ "میں آؤں۔" تو صبح اس کے اس انداز پہ فدا ہوتے ہوتے بچی تھی۔ وہ اس کے لیے جاگ رہا تھا۔ محض اس لیے کہ کل اس نے فرمائش کی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی مسکرائی۔

"سوچ لو... ٹھنڈ ہے۔"

"کوئی بات نہیں... ٹھنڈ نے کیا کہنا ہے۔"

"نمونیہ نہ ہو جائے تمہیں؟" اس نے چھیڑا۔

"اچھا ہے! تمہاری محبت کا اور تمہاری محبت میں مارا کھلایا جاؤں گا۔"

"بکواس نہیں کرو... تم کوئی عالم شاہ تھوڑے ہی ہو۔" پتا نہیں کیوں مگر۔ اسے یوں اس کا مرنے 'مارنے کا ذکر کرنا اچھا نہیں لگا۔

"تو میں... آؤں؟"

"صبح نے تمہیں... تمہارے لیے معاف کیا۔" وہ کھلکھلائی۔

اور وہ فنا ہو گیا۔ اس انداز... اس ادا پہ اور اس ادائے دلربائی پہ وہ "فنا" ہی تو ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ اگلے روز اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ ابا جان سے اسے ساتھ لے جانے کی اجازت لینے۔ صبح کو وہ پہلے ہی مطلع کر چکا تھا۔ وہ انتظار میں بہت ہی بری طرح سے چکر کاٹ رہی تھی اور جیسے ہی اجازت ملی۔ وہ یہ جا... وہ جا...

اماں سکتے کے سے عالم میں اس کی بے حیائی ملاحظہ کرتی رہ گئیں۔

"ایسی تو تربیت نہیں کی تھی میں نے..." وہ چڑ کر بولیں۔

ابا ہنس پڑے اور بہن بھائیوں نے وہ جملے کسے کہ الامان۔

نومی نا معلوم کس دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔

سب اس کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔ گاڑی میں دھیمے سروں میں بجتا میوزک۔

اس کے کلون کی مہک۔

اس کی جذبے لٹاتی بلکہ اڑاتی نگاہیں۔ بہترین ڈنر سوٹ۔ یہ بھی نا معلوم کس دوست کا تھا۔ لبوں پہ ٹھہری دلکش سی مسکراہٹ۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔

ہائے! کتنے ایسے خواب تھے جو ہر رات اسے آیا کرتے تھے۔

مگر یہ کیا تھا؟ جو حقیقت ہوتے کے باوجود خواب کا سا سماں باندھ رہا تھا۔ حسرتیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں بھلا؟

سب ہیروئنز سے بالاتر محسوس کیا تھا خود کو۔ بے اختیار اسے اپنے آپ پر رشک آیا اور اس نے نعمان کو دیکھا بڑے ہی پیار سے اور... اور یا حیرت...

نعمان عابد کے چہرے پہ اسے کبھی سالار کا گمان ہوتا تو کبھی حیدر۔ کبھی اسے وہ جاذب لگنے لگتا تو کبھی سعد۔

یا حیرت! یہ بھی ہونا تھا۔ وہ بے دھیانی میں دیکھے گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

نعمان نے مسکرا کر اسے ذرا شرارت سے دیکھا اور وہ بری طرح سے سرخ ہوئی تھی۔

وہ گاڑی سے اترا اور گھوم کر اس کی طرف آیا تھا۔ اور صبح وہ مسمرائز ہو کر سیدھے ہاتھ پہ گال ٹکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت پینٹ کے اوپر V گلے والا سوئیٹر پہنے ہوئے تھا اور اچھا لگ رہا تھا۔ معمول سے زیادہ۔

اس نے صبح کی طرف کا دروازہ ذرا سا جھکتے ہوئے کھول کر ہاتھ سے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ یوں جیسے وہ اس کا شوہر نہیں 'شوفر' تھا۔ ہائے اللہ وہ مر ہی تو گئی تھی۔

صبح لال سرخ ہوتی باہر نکلی تھی۔

نعمان نے گاڑی لاک کی اور اس کے ساتھ چلنے لگا کہ اچانک۔

"ذرا ٹھہرو محترمہ! آپ کو میری جیکٹ پہننے کا بہت شوق تھا نا سو میں نے ایک جیکٹ گاڑی میں رکھی ہے۔"

وہ اس کی شال کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اور صبح کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ الگ سے جیکٹ لے کر آیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے کہا "تمہیں میری جیکٹ پہننے کا بہت شوق تھا نا۔"

اور جب جیکٹ لا کر وہ اس کے کندھوں پہ ڈالنے لگا تھا۔ اف اسے لگا کہ آسمان پہ آتش بازی عین اسی وقت شروع ہوئی تھی۔ اور کتنی ہی گھنٹیاں بج بج اٹھی تھیں۔

"میں یہ والا سوئیٹر نہیں اتار سکتا ڈیر! پھر بال جو خراب ہو جائیں گے۔"

اس کے کندھوں پہ جیکٹ ڈالتے ہوئے وہ جھک کر کہہ رہا تھا اور وہ اس بات پہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اسے ذرا بھی تو برا نہیں لگا تھا۔

سب اچھا ہی اچھا دکھ رہا تھا اور اچھا ہی اچھا محسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔

ڈنر کے بعد وہ اسے گھر کے باہر اتار گیا تھا اور جب وہ ذرا سی مدہوشی میں گنگناتی ہوئی مسکرا مسکرا کر پرس

کی چین کو انگلیوں پہ لپیٹتی کھولتی ہوئی۔ انگلی کو شرما شرما کر دانتوں کے نیچے دباتی ہوئی۔ لڑکھڑا کر بے ترتیب چال سے چلتی ہوئی۔ اندر آئی تو آتے ہی۔

آتے ہی اماں کی چپل کا وار سیدھا اس پہ ہوا تھا۔ جو کہ اس کے آنے کی ہی منتظر تھیں۔

وہ ہڑبڑائی اور سارا نشہ ہرن۔ (یہ ہر قسم کا نشہ ہرن کرنے کا آزمودہ نسخہ ہے۔ ساری مائیں جان لیں۔)

"اف..." اگلا احساس تکلیف کا تھا۔ وہ اب تلملا کر اپنا بازو۔ دبا رہی تھی اور اماں کو خفگی سے دیکھ رہی تھی۔

"غضب خدا کا گیارہ بجنے کو ہیں... حد ہی ہو گئی بے شرمی کی۔ کیا سوچتے ہو گے کالونی والے... یہ تربیت کی ہے بچی کی۔"

"شوہر کے ساتھ گئی تھی... کسی ایرے غیرے کے ساتھ تو نہیں۔" اور بچی نے آنکھوں میں آنسو بھر لانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ مگر اماں ان کی خشک سالی" کو بھانپ چکی تھیں۔ آخر کو اماں تھیں۔ وہ بھی۔

"صبح! کیوں مجھے بے عزت کرواتا ہے۔ ایسی تربیت کی ہے میں نے تمہاری؟" اماں نے اب کے ذرا کے نرمی سے کہا تھا۔

"بے عزت ہونے والی کیا بات ہے اماں! اجازت لے کر گئی تھی نا۔ آپ دونوں کی کوئی غلط کام تو نہیں کیا نا میں نے... ہاں! دیر ہو گئی۔ اس کے لیے سوری۔"

پیار سے بات کرتے وہ ان تک آئی تھی اور ان کے سامنے جا کر دونوں کان پکڑ لیے تھے۔ اماں چند لمحے خفگی سے اسے دیکھتی رہیں۔ یوں جیسے کہ چیک کر رہی ہوں کہ اس کی بات میں کتنا ڈرامہ تھا۔

"آئندہ اتنی دیر نہ ہو..." پھر خفگی سے کہتے ہوئے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔ سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر چلو کوئی بات نہیں۔ سلسلہ تصورات... وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مدہوشی تو اب طاری نہیں ہو سکتی تھی کہ "چپل زدہ" مقام ابھی تک دکھ رہا تھا۔ تو مسکراتی ہوئی گنگناتی ہوئی پرس کی چین کو انگلی پہ لپیٹتی کھولتی ہوئی۔

آہ۔۔۔ یہ صبح جاوید بھی نا۔

☼ ☼ ☼

اس ایک ماہ میں اس نے پوری کوشش کی تھی صبح کی ہر نادلنی خواہش کو پورا کرنے کی۔ وہ جتنے پھول اسے بھجوا سکتا تھا۔ اس نے بھجوائے' حالانکہ ایسا کرتے ہوئے اسے آنٹی (صبح کی امی) سے سخت شرم محسوس ہوتی تھی مگر۔۔۔

یا تو وہ شرم رکھ لیتا یا پھر "صبح جاوید۔"

مہنگی مہنگی امپورٹڈ چاکلیٹس (جو اس نے خود بھی کبھی نہ کھائی تھیں) وہ اسے گفٹ کر چکا تھا۔

اور ناول۔۔۔ اس کا تو پوچھو ہی نا۔۔۔ وہ اتنے ناول خرید خرید کر اسے دے چکا تھا کہ بس دیوالیہ ہونے کو تھا۔

اعلا سے اعلا ریسٹورنٹ میں اسے لے کر جا چکا تھا' مگر یہ کام اس نے ایک دوبار سے زائد نہیں کیا تھا۔ واضح رہے۔

کتنی ہی دفعہ ٹھنڈ میں اس کے ساتھ آئس کریم کھانے کے بعد وہ "زکام" کو بھگت چکا تھا۔ اور یاد رہے کہ یہ نومی کے لیے تارے توڑ لانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ اور اس پہ ستم یہ ہوا کہ۔۔۔ صبح محترمہ کی برتھ ڈے بھی اسی ایک ماہ میں آئی تھی۔

صبح نے بذات خود ٹھنک ٹھنک کر اسے بتایا تھا اور اس طرح سے بتایا تھا کہ وہ جان گیا برتھ ڈے کتنا اسپیشل ہونا چاہیے اور رومانٹک بھی۔

وہ بے ساختہ کراہا تھا۔۔۔ بھی ویڈنگ ڈے باقی تھا۔ وہ سوچ کر مزید کراہا۔

مگر اپنی تمام کراہوں کو دباتے ہوئے اس نے صبح کے لیے بے حد خوب صورت سونے کی نازک سی رنگ خریدی تھی۔ جو کہ برتھ ڈے والے دن اس پیار اور چاہ سے پہنائی گئی تھی کہ بے اختیار صبح جاوید عش عش کر اٹھی اور پھر سے اس پہ فدا ہوتے ہوتے بچی تھی۔

محبوب کے کسی نے ایسے بھی نخرے اٹھائے ہوں گے؟

محبت میں اس طرح کے کام بھی کسی نے کیے ہوں گے بھلا؟

وہ پاگل سی۔۔۔ صبح جاوید۔۔۔

اور وہ۔۔۔ اس کے لیے پاگل سا نعمان عابد۔

☼ ☼ ☼

تو مہندی والا دن آ گیا۔

وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے خود پہ پرفیوم اسپرے کر رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل فون بول اٹھا تھا۔

اس نے اٹھا کر دیکھا تو۔۔۔ تو صبح کی کال تھی۔

"صبح کالنگ" کے الفاظ دیکھ کر اس کی سانس جہاں تھی وہیں پہ رک گئی تھی۔ یہ ہرگز ہرگز بھی نیک شگون نہیں تھا۔ اس وقت یہ کال۔

"ہیلو!" ذرا محتاط انداز میں کہا گیا۔

"کیا کر رہے ہو۔" دوسری طرف سے شوخ انداز۔

"تیار ہو رہا تھا" محتاط لہجہ برقرار تھا۔

"اچھا!" وہ بلا سبب کھلکھلائی۔ اور وہ بلا سبب "سہم" کر رہ گیا۔

"سنو!"

"بولو!"

"کیا تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہ مجھے اس پیلے رنگ میں دیکھو۔ قسم سے بڑا جچ رہا ہے۔ مجھ پر' اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ سب سے پہلے تم دیکھو مجھے۔۔۔ دوسرا کوئی بھی نہیں۔۔۔"

"ہو گیا نا وقوع پذیر۔۔۔ برا شگون۔" اس نے تھک کر سانس خارج کی کہ اب سانس لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

"صبح! ذرا ابھی تھوڑی دیر بعد آنا تو ہے نا میں نے۔۔ تو تب دیکھ لوں گا نا۔ دیکھو' آج کے دن۔۔۔ اچھا تو نہیں لگتا نا۔۔۔ اور پھر میں کس بہانے سے اکیلا آؤں گا اور کس طرح سے گیٹ سے اندر داخل ہو پاؤں گا۔ کیا یہ کہہ کر صبح سے ملنا ہے۔ کتنی بری بات ہے نا۔۔۔؟ تمہاری اماں تو میری ہڈیوں کا سوپ بنا کر پیش کر دیں گی

آج کے مینیو میں۔۔۔ جانتی ہو نا' پہلے ہی کتنی مشکل سے مانی ہیں۔ مہندی کے اکٹھے فنکشن کے لیے۔۔۔"

وہ کتنی بے چارگی سے بول رہا تھا۔ "آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے اور صبح۔۔۔ وہ اس کے بات ختم کرتے ہی پھر سے کھلکھلائی۔ ایویں ہی۔۔۔ بلا سبب ہی۔ وہ الگ بات کہ اس وقت نومی کو اس کی ہر ہر کھلکھلاہٹ خطرے کا بھدا سائرن محسوس ہو رہی تھی۔

"تم سامنے والے گیٹ سے تھوڑا آؤ گے۔ تم بیک یارڈ سے آنا۔ قسم سے آج مجھے بیک یارڈ کی اہمیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا ہے۔" اس کی بے چارگی کو تو محسوس ہی نہیں کیا گیا تھا۔

"صبح۔۔۔ یار!"

"میں انتظار کر رہی ہوں۔۔۔" لاڈ سے کہہ کر اس نے فون بند کیا بلکہ آف ہی کر ڈالا تھا۔ اب وہ کسی اور کو فون کر کے یہ کہنے سے تو رہا۔

"صبح سے بات کروا دیں۔۔۔" اس کی تو بہنیں بھی اسے آج کے دن اپنی درگت نہیں بنوانی تھی۔

"اف۔۔۔" بے ساختہ اس نے اپنے بنے بنائے سلیقے سے سنوارے گئے بال نوچ تھے۔

کاش! کہ میں "ازمیرٹ" ہوتا۔۔۔ کاش۔۔۔ کہ۔ بڑی شدت سے خواہش اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک مہندی کا سین ہے۔ اسٹیج پہ صوفے کی بجائے جھولا رکھا گیا ہے اور جھولا جیسمین کے پھولوں سے۔۔۔ سجایا گیا ہے۔

اسٹیج پہ چڑھنے کے لیے دو تین اسٹیپ ہیں اور ہر اسٹیپ کے دونوں اطراف گولڈن رنگ کے گھڑے رکھے ہوئے ہیں جن کو مہندی کی نسبت سے پہلے پھولوں کے ہار سے سجایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اسٹیج پہ لائٹس اور پھولوں سے جو زیبائش کی گئی ہے۔ وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ابھی ابھی اس جھولے پہ نومی آکر بیٹھا ہے اور یاد رہے کہ وہ اینٹی الرجی انجکشن لگوا کر آرہا ہے۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ اسے پھولوں سے الرجی ہے۔

"ہا۔۔۔"

لیں جی۔۔۔ وہ دلہن بھی دوستوں کے جھرمٹ میں آ چکی ہے۔ اور اس کو دیکھ دیکھ کر نومی محترم دل کو سنبھالنے کی اپنی پوری کوشش میں ہیں۔

کیا غضب تھا۔۔۔ جو اس نے ڈھایا تھا اور ڈھا رہی تھی۔۔۔ مگر یہ کیا؟۔۔۔

دلہن کا منہ اتنا سوجا ہوا ہے کہ وہ کپا سا محسوس ہو رہا ہے اور ایسا کیوں ہے بھلا؟ کیونکہ دولہا صاحب ایک ازمیرانہ سی (ازمیرٹ جیسی) حرکت کر چکے ہیں۔۔۔ وہ اس کو سب سے پہلے' دیکھنے نہیں آیا تھا' وہ محبت' میں حماقتوں کا قائل نہیں تھا کم از کم۔

"یار! موڈ تو ٹھیک کرو۔۔۔ ورنہ یاد رکھو۔۔۔ میں نے مہندی کا فنکشن تمہاری کسی فرمائش پہ دوبارہ نہیں کروانا۔ کہ تب میرا موڈ خراب تھا۔"

اس نے سرگوشی کی۔۔۔ دلہن نے منہ اور پھلا لیا۔

"صبح۔۔۔ یار پلیز' ایونٹ خراب نہ کرو۔ اب ہر فرمائش تو پوری نہیں کر سکتا نا میں!" وہ زچ ہوا۔

اور صبح بے ساختہ پانی پانی ہو گئی تھی۔ اسے ٹھیک وقت پہ ٹھیک احساس ہوا۔ کیا۔۔۔ کیا تھا جو وہ کر چکا تھا اس کے لیے۔

"سوری۔۔۔" مگر نخرے سے کہا گیا۔

"ہا۔۔۔" ایک سکھ بھرا سانس تھا۔ اور اس کے بعد۔۔ سارے فنکشن میں صبح کی مسکراہٹ دائیں سے بائیں گال تک پھیل رہی تھی۔ اتنی کہ اماں بار بار اسے دانت اندر رکھنے کی تنبیہہ کر کر کے تھک چکی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ کب اسے چپل زدہ کیا جا سکے۔

ہاں۔۔۔ یہ صبح جاوید بھی نا۔۔۔

☼ ☼ ☼

تو قارئین کرام۔۔۔ شادی کا دن آچکا ہے۔ وہ غضب تھا جو کل دلہن نے ڈھایا تھا اور آج وہ "قیامت" تھی جو کہ صبح برپا کر چکی تھی۔

"بندے کو اتنا بھی خوب صورت نہیں لگنا چاہیے۔"

نومی بار بار یہ ہی سوچ رہا ہے۔ وہ خود اسٹیج سے اُتر کر صبح تک گیا ہے، جبکہ وہ اسٹیج سے کئی فٹ فاصلے پہ تھی۔

اور صبح۔۔۔؟ کاش کہ وہ زور سے چیخ مار کر اپنی خوشی کا اظہار کر سکتی۔ کاش کہ وہ اپنے دو پیروں پہ اچھل سکتی۔ کاش اے کاش کہ۔۔۔

مگر ایسا صرف اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ اس کی کمر رات سے اماں کا دھمو کا کھائے ہوئے تھی۔

اور اب تو وہ لوگوں کی شرم بھی نہ کرتیں۔ سو بس اسی لیے۔ وہ سر جھکا کر نومی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیے اسٹیج کی طرف چلتے ہوئے مسکرائے جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رخصتی کا منظر ہے۔ اماں صبح کے گلے لگ کر اس طرح سے روئی ہیں کہ صبح کو پہلی بار محسوس ہوا ہے کہ اماں کو اس سے کتنی شدید محبت ہے۔ اور وہ خود بھی رو پڑی ہے۔

"اماں! اب اتنا تو نہ رلائیں۔ میک اپ خراب ہو جائے گا۔"

سسکتے ہوئے 'اماں سے لپٹے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کی گئی تھی۔

اور اماں کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا تھا۔ وہ نہیں بدل سکتی تھی۔

انہیں اور رونا آیا تھا۔

انہوں نے بڑی ہی شدت کے جذبات کے ساتھ اس کا ماتھا چوما تھا کہ صبح میک اپ پر خرچ کیے جانے والے پیسوں کو بھلا کر بے طرح رو اٹھی تھی۔

اور اب یہ صبح کی سسرال میں لہنتوی کا منظر ہے۔ وہ روئی روئی سی ہے۔۔۔ اور کچھ ڈری ڈری سی بھی ہے۔ اتنے سارے اپنوں کو چھوڑ کر اتنے سارے انجان لوگوں کے بیچ آگئی ہے۔ صرف ایک شخص کے لیے۔۔۔ کہ وہ واحد اپنا ہے ان انجان لوگوں میں۔۔۔ اس کا سر بھی درد کر رہا ہے اور اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔

(یاد رہے کہ عموماً "دلہنوں کی بھوک اُڑ جاتی ہے) دولہا اور دلہن کو واقعی دروازے پہ لا کر روک دیا گیا ہے۔۔۔ وہ رو کنے کو ابھی سمجھنے کی کوشش میں تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔

اور پھر ایک دو منٹ کے بعد روشنی کا جھماکا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈھیروں آوازیں اور کوئی چیز یکدم ۔ اس کے اوپر گرنے لگی تھی۔

وہ ایک دفعہ تو ڈری۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے مسکرا اٹھی۔ اور گردن اٹھا کر بے ساختہ اوپر دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی۔ وہ چیختی آوازیں نومی کے کزنز اور بہن بھائیوں کی تھیں۔ جو اسے ویلکم ہوم کہہ رہی تھیں۔ اور ایک دم اوپر گرنے والی چیز پھولوں کی پتیاں تھیں۔ جسے چھت پر سے کسی نے گرایا تھا۔

اور پھر بڑے ہی ڈرامائی انداز میں داخلی دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے اور اور۔۔۔

بے ساختہ' بے تحاشا خوشی کے تحت اس نے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پہ رکھے تھے۔۔۔ اور اس کا منہ "آ" کے انداز میں کھلا ہوا تھا۔ خوشی۔۔۔ حیرت۔۔۔ بے یقینی۔

اس نے سب کچھ بالائے طاق رکھ کر نومی کو دیکھا۔ اور جس وارفتگی سے دیکھا۔ نومی فنا ہو کر رہ گیا تھا۔

راہداری میں جلتے ہوئے چراغوں کی قطاریں تھیں۔ وہاں صرف ان ہی چراغوں کی روشنی تھی۔ ان کی دو کزنز جن کے ہاتھ میں پھولوں سے بھرا ایک ٹوکرا تھا اور ان دونوں نے اسے مخالف اطراف سے تھام رکھا تھا۔

"بیٹا! بسم اللہ کیجیے۔۔۔" نعمان کے ابو نے اس سے کہا تھا۔

اس نے دایاں پاؤں اٹھایا اور زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے اس گھر کے اندر قدم رکھا تھا۔ ان دونوں کے قدم رکھنے کی جگہ کو قدم رکھنے سے پہلے ہی پھولوں سے بھر دیا جاتا تھا۔

یہ کیا تھا؟ اللہ یہ کیا تھا؟

صبح نے انگلی کو دانتوں سے کاٹ کر یقین کرنا چاہا مگر

پھر یاد آیا کہ انگلی بھی اپنی تھی اور درد بھی خود کو ہی ہونا تھا۔ اس کی ساس نے گھر میں پاؤں رکھتے ہی صدقہ و خیرات کی کمی کیا تھا۔

ایسا استقبال... اف...

اسے اپنی شادی سالوں تک یاد رہنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد رسموں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ وہ ہنستی رہی مگر نا معلوم کیوں نومی کو لگا کہ وہ جیسے زبردستی ہنس رہی ہے۔ اور جیسے کہ وہ کسی چیز کو ضبط کر رہی ہے۔ وہ سمجھا تھکاوٹ ہے۔ مگر یہ تھکاوٹ نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اسے کچھ دیر بعد ہوا تھا۔

جب اسے کمرے میں لے جایا گیا تو وہاں ایک اور خوشی کا جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ کمرہ کینڈلز اور پھولوں کی آرائش سے بہت ہی اعلیٰ طریقے سے سجا ہوا تھا۔

اور یاد رہے کہ آج نومی نے اینٹی الرجی انجکشن نہیں انجکشنز لگوائے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ چھینکتا ہوا پایا گیا ہے۔ اسے یوں چھینکتا دیکھ کر اس نے نظریں اٹھا کر نومی کو دیکھا۔ اور اس طرح دیکھا کہ نومی چھینکنا بھول کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی ایسا تاثر جس نے فوراً" نومی کو اس کے پاس آنے پہ مجبور کیا تھا۔

"کیا ہوا صبح؟ کیا بات ہے؟ کچھ برا لگا؟" اس کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے۔ اس نے کہا تھا۔ اور صبح بس... اسی چیز کی کمی تھی۔

وہ رو پڑی... وہ اب کی بار آنسوؤں کو آنکھوں میں قید نہیں کر پائی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پہ اپنا ماتھا ٹکا کر رو پڑی تھی۔

"صبح... کیا ہوا... یار کیا بات ہے۔" اس کا سر دونوں ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے وہ پریشان ہوا۔ اس کا پریشان ہونا بنتا بھی تھا۔

صبح کے ہونٹ کپکپائے اور آنسو اور تیز رفتاری سے بہہ نکلے... جنہیں اس نے ہاتھ سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ مگر سچ یہ تھا کہ وہ ہچکیاں روکنے کی کوشش میں تھی۔

"صبح! تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ اگر اماں سے ملنا ہے تو لے جاتا ہوں تمہیں گھر یوں تو مت روؤ یار۔"

مگر نہ جی۔ صبح کو تو آج ہی سارا "بحیرۂ عرب" اپنی آنکھوں سے بہا دینا تھا۔

نومی اب کچھ تھک کر' زچ ہو کر اسے روتا دیکھ رہا تھا اور اس کے رونے کی رفتار کم ہونے کے انتظار میں تھا۔ مگر وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور اسے ہلکا ہلکا تسلی کے سے انداز میں تھپتھپا بھی رہا تھا۔

"کوئی ایسے بھی محبت کرتا ہے۔ کوئی ایسے بھی چاہتا ہے کسی کو۔ کوئی محبت میں یوں بھی کرتا ہے بھلا؟" سر جھکائے' سسکتے ہوئے بالآخر وہ بول پڑی تھی۔

"تم... تم اس لیے رو رہی ہو؟" وہ حیران ہوا۔ صبح نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور وہ ہنس پڑا۔ "تم بھی نا صبح... بہت ہی پاگل سی ہو..."

"اور تم مجھ سے بھی زیادہ پاگل ہو... مجھ پاگل کی ہر پاگل خواہش جو پوری کی..." شوں شوں کرتے ہو کہا گیا۔

"تم سے محبت جو تھی اور محبت میں تخت چھوڑنا' نہریں کھودنا' صحرا بدر ہو جانا ہی عظیم کام نہیں ہیں... تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ "ناول" پڑھنا بھی ایک عظیم کام ہے۔"

اور وہ روتے روتے ہنس پڑی اور پانی میں آگ لگی... باخدا پانی میں آگ لگی۔ اس نے نرمی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے نم گالوں کی نمی کو ہلکے سے صاف کیا۔

صبح کی نظریں اپنے ہاتھ پہ تھیں جو ابھی تک اس نے بائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم نے مجھے جیت لیا... بس تم اچھے ہو۔ بہت اچھے..." اس ادا سے کہا گیا کہ جس پہ فدا ہونا بنتا ہے۔ نومی نے جھکی پلکوں کے ساتھ اس کے ہلتے لبوں کو سنا۔

اور وہ پھر سے سر جھٹک کر ہنس پڑا تھا۔ وہ سیدھے سیدھے اس سے یہ تو... کبھی بھی نہ کہتی۔ "مجھے تم

سے محبت ہے۔" اس کی زندگی کا ہر ہر ایونٹ خاص رہا تھا۔ اب یہ کیسے نہ ہوتا۔

☆ ☆ ☆

"سنو!"

"ہاں!"

"ہنی مون کے لیے کہاں جانا ہے؟"

اور وہ جو ابھی ابھی اماں کے گھر سے ہو کر آرہی تھی، اور اپنے جوتے اتار رہی تھی۔ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کتنا خرچا ہو گا؟" وہ پھر سے جوتے کھولنے اور انہیں اتارنے میں مصروف ہو گئی۔

"تیس۔ چالیس ہزار۔" اس کا ارادہ نادرن ایریاز کی طرف کا تھا۔ اسی حساب سے اس نے بتایا تھا۔ مگر وہ اس کے سوال پہ حیران ضرور ہوا تھا۔

جوتے اتار کر وہ اٹھ کر انہیں شوریک میں رکھنے گئی تھی۔

"اگر کچھ کہوں تو برا تو نہیں مانو گے!" اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ادے! یہ تکلفات اور مسمات صبح جاوید۔۔۔" وہ مصنوعی حیرانگی سے بولا۔

"نعمان!۔۔۔" اس نے خفگی سے گھورا۔

"کہیں تمہارا سوئٹزرلینڈ۔"

"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"تو؟"

"تمہیں معلوم ہے نا کہ میں Sickness Road کا شکار ہوتی ہوں اور۔۔۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم برا نہ مانو تو جو اماؤنٹ ہمیں ہنی مون پہ اڑانی ہے۔ وہ ہم کسی اچھے سے سوشل ویلفیئر ادارے کو دے دیتے ہیں۔۔۔ حسین لمحے تو دل کے محتاج ہوتے ہیں نا۔۔ اور نئی زندگی کی شروعات۔۔۔ ان کاموں سے ہونی چاہیے جن سے اللہ راضی ہوتا ہے۔" وہ جھجکتے جھجکتے کہہ رہی تھی۔

نعمان ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔

ایسی ایسی نادلنی سی خواہشات رکھنے والی کی۔۔۔ ایسی فقیرانہ سی خواہش۔

"یہ تم نے کہاں سے سیکھا صبح؟" کچھ حیرانگی سے کچھ پیار سے پوچھا گیا۔

"ان ہی کتابوں سے' ناولز سے جن سے مجھے عشق ہے۔۔۔ اور جن کی محبت گھٹی میں شامل ہے میری۔۔۔ اور جن کے بغیر میری موت واقع ہو جانے کا خدشہ ہے۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

اور پہلی بار نعمان عابد کو احساس ہوا کہ وہ کیا سیکھے ہوئے تھی۔۔۔ اور کتابیں کیا کیا سکھاتی ہیں۔

ٹھیک ہے' اس کو کسی ہیرو کی تلاش تھی اور وہ کوئی ہیرو' نہیں تھا مگر۔۔۔ صرف اس سے رشتہ جڑنے کی دیر تھی۔

صبح نے اس کے بعد کبھی بھی اس سے بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے صبر شکر کرنے والے انداز میں رشتہ قبول کیا تھا۔ مگر اس کے بعد کبھی بے وفائی یا کسی بہتر کی تلاش نہیں کی تھی' نہ کسی اور ہیرو کو کھوجا۔ ہیرو۔۔۔ کو ہیرو بنانے والی چیز' محبت' ہوتی ہے۔

یہ پرسنالٹی۔۔۔ ذہانت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تو سپورٹنگ کریکٹرز کی طرح سے ہوتے ہیں۔ جن کے بغیر کہانی بنتی ہے۔ نہ چلتی ہے۔

اور ہر وہ شخص ہیرو ہی ہے جو کسی سے ایسی پیور' خالص محبت کرتا ہے۔ ہر غرض' ہر مفاد' ہر آلائش سے پاک۔

چاہے وہ نعمان عابد ہو یا سالار' حیدر' جاذب یا سعد۔۔۔ یا ان لی طرح کے دوسرے کردار۔ ان سب کو محبت خاص بناتی ہے۔۔۔ جیسے نعمان عابد' بنا تھا۔ صبح جاوید کے لیے۔۔۔

محبت اور پیور' خالص محبت۔۔۔ یہ آج کے دور میں ناپید ہے۔

اور جس کے پاس یہ ہے یقین کریں وہ آئرن مین' سپرمین' اسپائڈر اور بیٹ مین سے بڑا مین ہے' ہے کہ نہیں۔۔۔؟

☆ ☆ ☆

نعمان عابد کا خط ایک ــــ مشہور ڈائجسٹ کی مدیرہ کے نام۔

نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ۔

"السلام علیکم!ــــ"

یقین کریں کہ میں اس وقت تشکر کے جذبات سے لتھڑا ہوا ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ان خواتین لکھاریوں کے قلم کو عقیدت سے آنکھوں سے لگالوں۔

کیا کمال ہے۔ بھئی کیا کمال ہے جو یہ اپنے قلم کے ذریعے کرتی ہیں۔ یہ وہ کام سرانجام دے رہی ہیں جسے بجا طور پہ صدقہ جاریہ کہنا چاہیے۔

مجھے حیرت ہے کہ ایک عورت ہونے کے ناتے سے جو ان پہ گھریلو ذمہ داریاں عائد ہیں' یہ ان کو بھی احسن طریقے سے سرانجام دیتی ہیں اور ساتھ ساتھ جس جانفشانی سے یہ "جہاد بالقلم" کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ یقین مانیے۔ دل عش عش کر اٹھا۔

اور بے ساختہ یہ خواہش ابھری کہ ان خواتین لکھاریوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کاش کہ میں ان کے قلم کے لیے سیاہی مہیا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتا اور کاش کہ میں ایک کاغذ ہوتا جو ان کے متبرک ہاتھوں کے نیچے ہوتا اور خود پہ بکھرنے والے موتی جیسے لفظوں پہ نازاں ہوتا۔

اے کاش کہ میں تیرے حسین ہاتھ کا ایک کاغذ ہوتا (وصی شاہ سے معذرت کے ساتھ)

میری مدیرہ محترمہ سے بھرپور سفارش ہے کہ ایسا ایک ادارہ قائم کیا جائے جو کہ ان خواتین لکھاریوں کے کام کی ترقی و ترویج کے لیے مخصوص ہو اور جس کے ذریعے سے ان خواتین لکھاریوں کے کام کو احسن طریقے سے سراہا جائے۔

میری یہ بھی گزارش ہے کہ اچھا اور معیاری کام کرنے والوں کو بونس بھی دیے جائیں۔ یہ جو کہانیوں میں ذہانت و فطانت سے بھرپور کردار ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ان ہی کے زرخیز دماغوں کا کمال ہوتا ہے۔ وہ ذہانت کرداروں کی نہیں ان کے اپنے ذہن کی ہوتی ہے۔ ایسی خوبصورتی سے کسی بھی منظر کو بیان کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ تو سب کچھ بیچ باچ کر ضرور ہی وہاں جایا جائے۔ ایسے ایسے شاہکار۔۔۔ کردار ۔۔۔ واللہ کہ عقل دنگ رہ جائے۔۔۔ اور وہ وہ سبق آموز کردار۔۔۔ واللہ۔۔۔ واللہ۔۔۔ الفاظ نہیں مل رہے کہ اب کیا کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ خط کی طوالت آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ اور میں کبھی بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہوں گا جو آپ کی پریشانی کا باعث ہوں۔

میں مدیرہ صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ وہ اس ڈائجسٹ کو اس قدر منظم اور احسن طریقے سے چلا رہی ہیں۔۔۔ یقیناً" وہ داد کی مستحق ہیں۔

اور آخر میں صرف ایک خواہش۔

کاش میں ان کے ہاتھ کا ایک کاغذ ہوتا۔ کاش اے ـــ کاش۔

آخری سطور لکھتے ہوئے میرا دل محبت و عقیدت کے ان جذبات سے لبریز ہے جیسے کسی بھی "بک لور" (کتابوں کا عاشق) کا ہو سکتا ہے۔۔۔ گو کہ مجھ میں وہ خاص حس ناپید ہے جو کتاب سے محبت اور اس کے مطالعے کے عارضے میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر پھر بھی میں واقعی بہت عقیدت و احترام محسوس کر رہا ہوں اور ان جذبات میں خود کو لتھڑا ہوا پا رہا ہوں۔

واسلام! نعمان عابد۔

ایک انتہائی خوش قسمت اور خواتین لکھاریوں کا فیض یافتہ۔

خصوصی نوٹ : (خط اگر آپ ردی کی ٹوکری کی نذر بھی کر دیں گی تو یقین کریں کوئی گلہ' کوئی دکھ' کوئی نہ ہوگا۔۔۔ شکریہ)

عرض مصنف : (باخدا یہ تحریر صرف اور صرف مزاح کی ایک کوشش ہے اور۔۔۔ برائے مہربانی اس کو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر پڑھا جائے۔۔۔ شکریہ)



غزالہ روشن

تجھ سا کوئی دوسرا

بارے ننھے میاں کے گھر والوں کو ان کی شادی کرنے کا خیال آ ہی گیا۔ نہ۔۔۔۔۔ یہ ننھے میاں ہرگز ننھے نہ تھے' بلکہ ماشاء اللہ چالیس سالہ "جوان" تھے جن کے شانوں پر تین' تین بہنوں کی شادی کرنے کا فریضہ یوں دھر دیا گیا تھا اور اس فریضے سے سبکدوش ہوتے اب اکرم عرف ننھے میاں چالیس برس کے ہو چلے تھے۔ گھر والوں کے لیے تو راوی اب بھی چین ہی چین لکھ رہا تھا' مگر برا ہو اس دنیا کا' جو کسی کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیتی اور اس سے بھی زیادہ عورتوں کی کتر کتر چلتی زبانوں کا' جو بانگ دہل کہنے لگی تھیں کہ بیٹے کی کمائی سے اب بیٹیوں کے گھر بھرنے کا ارادہ ہے' جب ہی تو شوکت جہاں بہو لانے کا نام نہیں لیتیں۔ اب تو چھوٹی والی کی شادی کو بھی سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب دوسروں کے بارے میں بات کرنا تو بڑا آسان ہے' مگر یہ ہی دوسرے جب آپ کے بارے میں بات کریں تو برداشت کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شوکت جہاں بھی ایک دن بھڑک ہی گئیں۔

"اے نوج! میں کا ہے نہ بہو لاؤں گی' ارے وہ تو ننھے کی خود ہی مرضی نہ تھی کہ بہنوں کے ہوتے بیاہ نہ کروں گا' نہ جانے آنے والی کیسی ہو' کس مزاج کی ہو۔ میری پیاری بہنوں کو تنگ نہ کرے۔"

حالانکہ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ ارشادات قطعاً" اکرم میاں کے نہ تھے کہ وہ بے چارے ہر جگہ' ہر شادی میں نکاح کے چھوارے اس امید پر بڑے ذوق و شوق سے کھاتے پائے جاتے تھے کہ سنا تھا اس طرح کھانے والے کی جلدی شادی ہو جاتی ہے' اور رہی بات ان کی معصوم بہنوں کو تنگ کرنے کی تو ان کی تین بہنیں اتنی ہی معصوم تھیں جتنی (چارلس اینجلز) کی تین اینجلز' ان فتنہ خیز اور شر انگیز بہنوں کو کوئی کیا تنگ کرتا' وہ خود ہی آنے والی کا ناطقہ بند کر دیتیں اور ننھے میاں کیا کسی کو کچھ کہتے' جبکہ وہ خود ہی گھر میں تیسرے درجے کے شہری تھے۔ اگر ان کی بیگم گھر والوں کو کچھ کہہ بھی دیتیں تو اگلے دن ننھے میاں بمعہ بیگم گھر سے باہر ہوتے۔ کچھ ایسی ہی "دبنگ" بہنیں تھیں ننھے میاں کی اور شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی ان کا عمل دخل برقرار تھا۔ سب سے بڑی بہن فرزانہ جو "گربہ کشتن روز اول" کی قائل تھیں کہ سامنے والے کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہ ملے۔ سامنے والا کیسا بھی ہو' ہرگز خاطر میں نہ لاؤ بلکہ فوراً" اس کی خامیاں' برائیاں گنوانا شروع کر دو' تاکہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تمہارے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ فی الحال تو یہ فارمولا وہ اپنے شوہر پر گزشتہ چھ سال سے آزما رہی تھیں اور اپنے شوہر کی شرافت کو اس فارمولے کی کامیابی سمجھتی تھیں۔

دوسری بہن شبانہ جو "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔" کی تفسیر بنی پھرتی تھیں' اب یہ الگ بات ہے کہ وہ اکثر و بیشتر دوسروں کے لیے دردِ سر ثابت ہوتیں' کیونکہ کسی کی مدد کرنا اور بات ہے' کسی کے کاموں میں بلاوجہ ٹانگ اڑانا الگ بات ہے۔ لوگوں کے کام بگاڑنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور اگر کوئی شامت اعمال ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا تو وہ "لو ایک تو ہم مدد کر رہے تھے" کہہ کر وہ لتے لیتیں کہ کہنے والا کان دبا کر اپنی راہ لیتا۔ ان کا سسرال گو کہ میکے سے اتنا قریب بھی نہ تھا۔ مگر گھر کا کوئی بھی معاملہ ہو۔ یہ جھٹ بس پکڑ میکے کے مسائل نپٹانے اور بقول محلے والوں کے

سیاپا ڈالنے پہنچ جاتیں۔

تیسرا اور آخری نمونہ نادرہ تھیں جن کی زبان کے جوہروں کے آگے کوئی نہ ٹک سکتا تھا۔ یہ نہ صرف زبان سے "پھول" جھاڑتی تھیں 'بلکہ ___ اسٹار پلس دیکھ دیکھ کے ان کے شیطانی دماغ کو بھی چار چاند لگ چکے تھے۔ محترمہ بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر تھیں اور اب تو وہ 'وہ سازشیں تیار کرتی تھیں کہ اہزیا والے بھی عش عش کر اٹھیں۔ محلے والے ان کو "پیار" سے "نادرہ فتنی" بلاتے تھے اور رہ گئیں ننھے میاں کی اماں تو وہ بھی بیٹیوں سے چنداں مختلف نہ تھیں۔ ان کی تینوں بیٹیاں ہی ان کی آنکھ 'کان اور زبان تھیں۔ خیر دیر آید درست آید' کے مصداق ان کو ننھے میاں کے سر پر سہرا سجانے کا خیال آہی گیا۔ دراصل شوکت جہاں کو یہ



دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ کہیں ننھے میاں خود ہی کسی کو پسند نہ کرلیں اور کسی دن گھر کے آنگن میں لا کھڑا کریں کہ یہ لو اماں! تمہاری بہو اور بہو اگر پیا من بھائی آگئی تو وہ تو سر چڑھ کر ناچے گی اور ساتھ ان سب کو بھی تگنی کا ناچ نچوائے گی۔ لہٰذا فوراً "نور چشموں کو فون کھڑکایا گیا کہ سب ساتھ آجاؤ' تاکہ بوا حمیدہ کے بتائے رشتوں پر غور کرلیا جائے۔ فون تو محض بہانہ تھا۔ تینوں کی تینوں بمعہ اپنے اپنے چھوٹے فتنوں کے ساتھ حاضر ہوگئیں اور رنچھوڑ لائن کی تنگ و تاریک گلیوں میں بنے اس دو کمروں کے مکان میں "ٹھنک ٹنک" سر جوڑ کے بیٹھ گیا۔ زور سارا اس بات پر تھا کہ بھابھی ایسی لائی جائے جو ساس نندوں کے سامنے سر نہ اٹھائے' زبان کے بجائے صرف ہاتھ چلائے (بھئی کام کرنے کے لیے) اور بس جی حضوری ہی کرتی رہے۔ لو بھلا کوئی یہ پوچھے کہ بہو چاہیے یا روبوٹ' مگر جناب بھڑوں کے چھتے کو کون چھیڑے۔ ان شرائط کے علاوہ ایک اور شرط بھی لگادی گئی تھی کہ لڑکی اگر جاب کرتی ہو تو بہت اچھا ہے' تاکہ اس کی کمائی سے بھی مستفید ہوا جاسکے۔ یہ آئیڈیا نادرہ فتنی کا تھا۔ مگر اس بات پر بوا حمیدہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ جاب کرنے والی لڑکی اوّل تو تمہارے گھر اور علاقے کے لیے ہاں نہیں کرے گی۔ دوسرا اگر شادی ہو بھی گئی تو بھی تم لوگ کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گی۔ بات سولہ آنے درست تھی۔ لہٰذا اس وقت بوا حمیدہ کی لائی گئی تصاویر دیکھی جارہی تھیں اور تینوں کو کوئی بھی لڑکی پسند نہیں آرہی تھی کیونکہ ایک تو کچھ لڑکیاں کافی خوش شکل تھیں اور خوب صورت بھابھی تو لانی نہیں تھی کہ اکلوتا بھائی کہیں اس کے حسن کا دیوانہ ہو کر بہنوں کو نہ بھلا بیٹھے' دوسرا کوئی بھی لڑکی کم عمر یعنی سولہ' اٹھارہ کی نہ تھی' جس کو دبا کر رکھنے میں آسانی ہوتی۔ آخر کار اکتا کر شبانہ نے تصویریں ایک طرف کریں اور اپنی کراری آواز میں بوا سے کہنے لگی۔

"بوا! یہ تم کیسی تصویریں دکھا رہی ہو؟ یہ کوئی لڑکیاں ہیں پکی پکی عمروں والی۔ ارے یہ تو آنٹیاں لگ رہی ہیں۔" اپنی بات کہہ کر خود ہی قہقہہ لگایا' جس میں دونوں بہنوں اور اماں نے بھی ساتھ دیا' مگر آگے بھی بوا حمیدہ تھیں' چمک کر بولیں۔

"اے بنو! یہ آنٹیاں دکھ رہی ہیں تو تمہارے بھائی کو بھی اب لوگ انکل ہی کہتے ہیں۔ کون سا چھنا کاکا ہے موا تمہارا بھائی۔ تم بہنوں کی شادیاں کرتے کرتے آدھا گنجا تو ہوگیا۔ بے چارا' اب اس کے لیے ہنکھوڑا جھولتی بچی کا رشتہ لانے سے تو رہی میں۔" یہ صاف گوئی سن کر تو تینوں بہنوں کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

"اب اتنا بڈھا بھی نہیں ہمارا بھائی۔۔۔" کہہ کر بوا کے لتے لیے جانے کا آغاز کیا ہی جانے والا تھا کہ شوکت جہاں بوا کے بگڑتے تیور بھانپ کر جلدی سے میدان میں کود پڑیں اور معاملہ رفع دفع کرانے کے لیے بولیں۔

"چل چھوڑ بوا' کوئی اور رشتے لے آئیو' یہ تو کچھ نہ آرہے ہیں۔" بوا نے برا سا منہ بنا کر تصویریں سمیٹ کر اپنے تھیلے نما پرس میں رکھیں اور بولیں۔

"اگلی دفعہ تب آؤں گی تمہارے ہاں' جب واقعی تمہارے مطلب کا کوئی رشتہ ہوا' ورنہ میں نہ آنے والی' اب تم کنجوسوں کے ہاں غضب خدا کا دھکے کھاتے آؤ' نہ تم لوگ چائے پانی کا پوچھتی ہو نہ آنے جانے کا کرایہ دیتی ہو۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ رشتہ طے ہوتے ہی پانچ ہزار روپے اور دو جوڑے لوں گی' ورنہ یاد رکھنا میں طلاقیں کروانے کی بھی بڑی ماہر ہوں اور یہ کم عمر لڑکی اور وہ بھی جاب کرتی ہوئی والی شرطیں تو بھول جاؤ بی بنو۔ غضب خدا کا بندہ کبھی خود بھی آئینہ دیکھ لے۔" بوا کا پارہ تو کراچی اور سبی کے درجہ حرارت کو بھی مات دینے لگا۔

"اری حمیدہ۔۔۔ بیٹھو تو۔۔۔ چائے بنواتی ہوں۔" شوکت جہاں نے بوا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ارے اپنے پاس رکھو اپنی چائے' مار لگتا ہے ایک ہی پتی کو بار بار جوش دے کے استعمال کرتی ہو' نہ رنگ' نہ خوشبو' نہ ذائقہ۔۔۔" بوا حمیدہ بکتی جھکتی

دروازہ پار کر گئی۔

" آئے ہائے' اماں.... تم کو بھی یہ ہی دلہن ملتی ہے ' ننھے کا رشتہ طے کرنے کے لیے؟ کتنی باتیں سنا کر گئی ہے۔ عمر کا لحاظ نہ ہوتا تو منہ توڑ دیتی۔" یہ نادرہ فتنی تھی۔

"ارے تو.... تو میرے ہاتھ میں بیس 'تیس ہزار رکھ دے تو میں بلالوں ان انگریزی بولنے والی پرکٹی رشتہ کرنے والی مائیوں کو' سب سے کم پیسے لیتی ہے بوا حمیدہ ' دو باتیں سن لیں تو کیا ہو گیا۔ باتیں چپک تھوڑی گئیں مجھ کو اور چلو نکلو تم سب اب یہاں سے اور ان فتنوں کو بھی تھوڑا تمیز سکھاؤ۔" آج تو شوکت جہاں کسی اور ہی جہاں میں تھیں' جو بیٹیوں کو یوں لتاڑ دیا تھا' مگر بیٹیاں بھی آخر انہی کا پرتو تھیں۔ فرزانہ ڈھٹائی سے بولی۔

"اوہو اماں.... تم تو بہو کے آنے سے پہلے ہی انگارے چبانے لگیں' مگر ہم تو اب کھانا کھا کر شام میں ہی جائیں گی اور کھانا باندھ کے بھی لے کے جائیں گی۔ اب گھر جا کر کون پکائے گا۔ یہ بھی شکر ہے کہ سسرال والوں نے ہمیں خود ہی الگ کر دیا۔ ورنہ ان کے لیے بھی روٹیاں تھوپنی پڑتیں۔" ان زریں خیالات پر باقی دونوں بہنیں بھی سر دھننے لگیں ۔۔۔ اور اندر آتے ننھے میاں نے سوچا۔

"تم لوگوں کی زبانوں کے آگے کوئی ٹک پاتا تو تم سسرال میں رہتیں نا' بے چاروں کو عزت پیاری تھی' جب ہی الگ کر دینے میں عافیت جانی۔" مگر یہ بات باآواز بلند کہہ کر رہے سہے بال نہیں اڑوانے تھے۔ لہٰذا چپ رہنے میں عافیت جانی اور اپنی بہنوں کے فرمائشی کھانوں پر آنے والے اخراجات کا حساب لگانے لگے کہ تینوں جب بھی آتیں بازار سے ہی بریانی' نہاری' حلیم یا تکے کباب منگوائے جاتے' کیونکہ بقول ان کے میکہ تو آرام کے لیے ہوتا ہے۔



کچھ دن یوں ہی گزرے تھے کہ بوا حمیدہ ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئیں اور آتے ہی بولیں۔

"لو بنو! اللہ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ آج بالکل تمہارے مطلب کا رشتہ لائی ہوں۔ لڑکی ہے تو تیس سال کی' مگر لگتی نہیں ہے۔ بس رنگ تھوڑا کم ہے' مگر نوکری بھی کرتی ہے اور لوگ بھی تم سے زیادہ پیسے والے ہیں۔ لڑکی کی عمر نکلی جارہی ہے۔ اس لیے اپنے سے کم حیثیت لوگوں میں بھی رشتہ دینے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اب تم تصویر دیکھ لو اور اپنی چنڈال چوکڑی کو بھی بھلے دکھا دو اور ہاں کوئی اعتراض کرنے سے پہلے ذرا اپنا گھر اور لڑکا بھی غور سے دیکھ لینا۔ میں چلتی ہوں اب۔ کہیں اور بھی کام ہے۔" بوا حسب عادت دوٹوک بات کر کے چلتی بنیں اور اماں نے فوراً" بیٹیوں کو بلاوا بھیج دیا' جو حسب معمول فوراً" ہی آ پہنچیں۔ اماں سے تفصیلات سن کر تو تینوں بہنیں جھوم ہی اٹھیں' یہ رشتہ تو گویا ان کے لیے ہی تھا۔ بھابھی کم شکل یعنی طعنے دینے میں آسانی اور اوپر سے کمائی والی بھی۔ بس تھوڑا سا خدشہ یہ تھا کہ مالی حیثیت میں لڑکی کا میکہ مضبوط تھا تو کہیں اس بل بوتے پر بھابھی نخرے نہ دکھائے' مگر اماں نے سمجھایا کہ

"جب شادی ہو جاتی ہے تو سمجھو سب کشتیاں جل گئیں۔ میکے پر اکڑ دکھائی تو وہیں چھوڑ آؤں گی اور ویسے بھی گھر والے تو ایسے بے زار بیٹھے ہیں اس سے کہ ہم جیسوں میں بھی رشتہ دے رہے ہیں تو بس کہاں کا میکہ....." تینوں بہنوں نے لڑکی کی تصویر کو اوکے کر دیا۔ "ہیڈ کوارٹر" سے منظوری کے بعد ننھے میاں کو تصویر دکھانے کی رسم ادا کی گئی۔ لڑکی کا نام صنوبر تھا۔ رنگ بے شک سانولا تھا۔ مگر نقوش میں وہی جاذبیت تھی جو اکثر سانولی رنگت کی حامل خواتین میں ہوتی ہے۔ لہٰذا ننھے میاں کو وہ لڑکی اچھی لگی' مگر بہنوں کو "ہاں ٹھیک ہے" کہہ کر مطمئن کر دیا۔ جانتے تھے کہ اگر پسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کر دیا تو شاید بہنیں یہاں شادی ہی نہ کروائیں۔ ان کا روکھا پھیکا "ٹھیک ہے" سن کر بہنوں کے چہروں پر جو اطمینان اترا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ آخر کو وہ باہر کی

دنیا میں کام کرنے والے' ہر طرح کے لوگوں سے ملنے والے شخص تھے۔ لوگوں کے رویوں کو پہچانتے تھے۔ اگر ادب و احترام۔ لحاظ و مروت میں وہ اپنے گھر والوں یا محلے والوں سے زیادہ بات یا بحث نہیں کرتے تھے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ عقل سے پیدل تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بہنوں کے مزاج کے مطابق ہی ردعمل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اگلے جمعے کو ان کی بہنیں اور والدہ صنوبر کے گھر پہنچ گئیں۔

صنوبر کے گھر والے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ اپنا کاروبار تھا۔ لہٰذا مالی طور پر بہت زیادہ نہیں تو کافی مستحکم تھے۔ رہائش کاروبار کی مناسبت سے بے شک کھارادر میں ہی تھی' مگر دو منزلہ کافی کشادہ اور خوب صورت مکان بنا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر ہی شوکت جہاں کافی مرعوب ہو گئیں' مگر بیٹیوں نے فوراً" والدہ ماجدہ کو اصول نمبر ایک سمجھایا کہ لڑکی والوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا' بلکہ یہ ہی جتانا ہے کہ وہ رنچھوڑ لائن میں رہ کر بھی ڈیفنس میں رہنے والوں سے ہرگز کم نہیں۔ لہٰذا بوا حمیدہ کے ہمراہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ماتھے پر پڑے بلوں کو تھوڑا اور گہرا کیا گیا اور چاروں ماں بیٹیاں پکا سا منہ بنا کے گھر میں داخل ہوئیں' جہاں حسب توقع استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا اور اس رویے نے چاروں کی گردن میں کچھ اور تناؤ پیدا کر دیا۔ اب یہ الگ بات کہ جب سموسوں' گلاب جامن' شامی کباب' کسٹرڈ اور چنا چاٹ سے بھری ٹرالی سامنے آئی تو سارا کروفر وہیں کا وہیں دھرا رہ گیا۔ ہر چیز سے مکمل انصاف کرنے کے بعد بھی نادرہ فتنی نے فرمایا۔

"ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ ہماری کھانے کی دعوت کریں گی' چلیں' اگلی دفعہ جب ہم بھائی کے ساتھ آئیں گے تو کھانا ہی کھا کے جائیں گے۔" اس بے تکلفانہ انداز پر صنوبر کی والدہ اور بہنیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ مگر بوا حمیدہ نے اپنی پاٹ دار آواز میں نادرہ کو جواب دیا۔

"اے بی بنو! خود تو دوسروں کو بغیر پتی کے چائے پلواؤ اور دوسروں کے ہاں دعوتوں کی فرمائش کرو۔ واہ بھئی واہ۔ ایسی ڈھٹائی نہ دیکھی۔" یہ کھری کھری سن کر شوکت جہاں جلدی سے بات سنبھالنے کو بولیں۔

"ارے بوا مذاق کر رہی ہے۔ ابھی بچی ہے۔" اور اس بچی کی عمر کے بارے میں بوا کا مزید کوئی ارشاد سننے سے پہلے لڑکی کو بلوانے کی فرمائش کر ڈالی۔

صنوبر آئی تو تینوں بہنوں نے حسب مقدور ناک بھوں چڑھائی کہ ظاہر تو یہ ہی کرنا تھا کہ بس پڑھی لکھی لڑکی کی وجہ سے ہاں کر رہے ہیں' ورنہ ہمارے بھائی کو تو لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ صنوبر کے گھر والے یہ سب دیکھ رہے تھے' مگر برداشت کرنے پر مجبور تھے کہ ایک تو وہ وضع دار لوگ تھے۔ دوسرے بوا حمیدہ نے اس رشتے کے ہو جانے کی کافی امید دلائی تھی۔ لہٰذا ان لوگوں نے اپنے طور پر ننھے میاں کے متعلق ضروری چھان بین بھی کروائی تھی' اور لڑکے کی شرافت اور اچھی کمائی کا جان کر ان کی دلی خواہش تھی کہ یہاں رشتہ طے ہو جائے' اس کے لیے نہ صرف چاروں ماں' بیٹیوں کی آؤ بھگت کی جا رہی تھی' بلکہ ان کی طنزیہ گفتگو کو بھی نظرانداز کیا جا رہا تھا۔ صنوبر کی عمر تیس برس ہو چلی تھی اور اس معاشرے میں کنواری لڑکی کو گھر بٹھا کر اسے لوگوں کی فضول باتیں سن سن کر نفسیاتی مریض بنانے سے بہتر تھا کہ "کچھ لو کچھ دو" کے حقیقت پسندانہ رویے کو اپناتے ہوئے مناسب رشتہ دیکھ کر اس کو اس کے گھر کا کر دیا جائے۔ روپیہ پیسہ نصیب کا ہوتا ہے اور ساس نندیں بھی آخر کار ٹھیک ہو ہی جاتی ہیں اور اولاد ہو جائے تو پھر تو یہ چھوٹی موٹی الجھنیں خود ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ صنوبر کے گھر والوں کو یہ رشتہ مناسب ترین لگ رہا تھا۔

آخر کار سب کی دعائیں رنگ لائیں اور شوکت جہاں اور ان کی بیٹیوں نے صنوبر کے لیے پسندیدگی کا عندیہ دے دیا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اکرم کے گھر والے عید کے فوراً" بعد شادی کرنا چاہتے تھے۔ یعنی شادی کی تیاریوں کے لیے محض دو مہینے تھے۔ صنوبر کے گھر والوں نے بوا حمیدہ سے اتنی جلدی پر اعتراض کیا تو بوا حمیدہ نے

سمجھایا کہ۔

"اے آج کل جہیز' بری بنانا کچھ مشکل نہیں' بس پیسہ ہاتھ میں ہو۔ تم اب فضول کی باتوں میں لڑکی کا رشتہ ہاتھ سے نہ نکالو۔ لڑکے والوں کی مان لو اگر کچھ کمی بیشی رہ بھی جائے تو بعد میں پورا کرتی رہنا۔"

اصل میں بواحمیدہ کو خدشہ لاحق تھا کہ اگر صنوبر کے گھر والوں تک ننھے میاں کے گھر والوں کی زبان درازی اور تیز طراری کے قصے پہنچ گئے تو کہیں انکار ہی نہ ہو جائے اور ان کو وہ پانچ ہزار لوٹانے پڑ جائیں جو انہوں نے بڑی دقتوں سے شوکت جہاں سے نکلوائے تھے۔

ادھر ننھے میاں کی جیب خالی کروائی جا رہی تھی۔ تینوں بہنیں ننھے میاں کو جونک کی طرح چمٹ گئی تھیں' کہ نہ صرف ان تینوں کو دس دس ہزار نیگ دیا جائے گا بلکہ پیاری بھابھی کے لیے بھی زیادہ رقم دی جائے' تاکہ وہ زبردست سی بری تیار کر سکیں۔ پس پردہ یہ مقصد کار فرما تھا کہ اس رقم میں سے بھی حصہ بٹورا جائے گا۔ ننھے میاں نے بھی کمال فراخ دلی سے دو لاکھ روپے عنایت فرما دیے جس میں ایک لاکھ کا مزید اضافہ کروایا گیا کہ سونے کے نرخ تو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں تو ایک لاکھ کا تو صرف سونے کا زیور ہی آجائے گا۔ باقی دو لاکھ کپڑے' میچنگ جیولری' جوتے وغیرہ کے لیے کافی ہوں گے۔ اب ننھے میاں تو بہنوں کو تین لاکھ تھما کر شان دار بری کے سپنے دیکھتے باہر چلے گئے۔ جبکہ کمرے میں موجود تینوں بہنوں کو اتنی رقم دیکھ کر ہی سکتہ سا ہو گیا تھا۔

"اے آپا! دیکھ رہی ہو بیوی کے لیے کیسے جیب خالی کر کے گیا ہے' ہمارے لیے تو کبھی کچھ نہ نکالا۔" شبانہ سکتے سے باہر آکر بولی اور اپنے بھائی کے لیے کچھ نہ دینے کا شکوہ کرتے وہ اس سارے سامان کو یکسر فراموش کر گئیں جو ہر سال عید' بقر عید' رمضان' شب برات اور اس کے علاوہ ان سب کے بچوں کی پیدائش پر کپڑے' کھلونے' پھل' مٹھائی اور نقد روپیہ یا سونے کی چھوٹی موٹی چیز کی شکل میں ان کا بھائی انہیں دیا کرتا تھا اور تب ان کی زبان شہد ٹپکانے لگتی تھی کہ سسرال میں ناک کٹنے سے بچ جاتی تھی اور اب اسی بھائی کے لیے وہ بیٹھی زہر اگل رہی تھیں۔

"ہاں تو اچھا ہے نا' اب ہم بھی ان ہی پیسوں سے کپڑے بنوائیں گے اور جہاں تک اس کلوٹی کے کپڑوں کی بات ہے تو ہم زیادہ بھاری کپڑے تو لیں گے ہی نہیں' بلکہ کاٹن اور جارجٹ کے ہلکے کڑھائی والے کپڑے رکھیں گے اور ہاں شاپنگ کے لیے لیاقت آباد (المعروف لالوکھیت) سے اچھی جگہ کوئی نہیں۔ سب سے سستا مال وہیں ملے گا۔ لہٰذا ٹھیک ٹھاک پیسے بچیں گے جو ہم تینوں آپس میں بانٹ کر اچھی اور مہنگی جگہ سے اپنے لیے کپڑے بنوائیں گے۔" نادرہ فتنی کا فتنہ خیز دماغ ہمیشہ کی طرح دور کی کوڑی لایا تھا۔

اور پھر اس مشورے پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ بری میں ہلکے ترین کام کے دو شادی کے جوڑوں کے علاوہ باقی سب جوڑے کاٹن یا پرنٹڈ جارجٹ کے تھے۔ جبکہ چپلوں کے نام پر محض دو سینڈلیں موجود تھیں۔ مختلف بچت بازاروں سے گھٹیا کاسمیٹکس کا سامان بھی لیا گیا تھا۔ البتہ ننھے میاں کی تھوڑی بہت تسلی کروانے کے لیے ایک عدد چھلکے جیسا سونے کا سیٹ اور منہ دکھائی کے لیے کاغذ جیسی سونے کی انگوٹھی لے لی گئی تھی۔ اس سارے بچت پلان کے باوجود بہنوں کو قلق ہی رہا کہ اتنے پیسے نہیں بچ سکے کہ وہ اپنے لیے سونے کی کوئی چیز لے سکتیں۔ دوسری جانب اکرم عرف ننھے میاں کو صنوبر کے گھر والوں نے ساتھ لے جا کر اچھی مارکیٹوں سے شاپنگ کروائی تھی اور شادی سے کچھ دن پہلے جب جہیز کا سامان ان کے گھر آیا تو بھی ہر چیز کی قیمت اور معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ اس پر بھی شوکت جہاں نے اعتراض کیا کہ۔

"کھانے کی میز نظر نہیں آرہی۔" اب کوئی یہ پوچھتا کہ بی بی دو کمروں کے اس گھر میں ڈائننگ ٹیبل آپ رکھیں گی کہاں؟ کہ دونوں کمرے تو پہلے ہی صنوبر کے بیڈ روم سیٹ' صوفہ سیٹ' ٹی وی اور فریج سے بھر چکے تھے کہ چلنا پھرنا بھی مشکل ہو رہا تھا' مگر یہ آئینہ

دکھاتا کون؟

ان ہی باتوں میں آخر شادی کا دن بھی آ ہی گیا اور صنوبر 'اکرم صاحب کی دلہن بن کر آ گئی۔ شادی کی پہلی صبح صنوبر اور اکرم کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر بہنوں کو تھوڑی پریشانی ہوئی 'کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ننھے میاں کو دلہن پسند نہیں آئے گی اور وہ ضرور بہنوں سے شکوہ کریں گے اور یوں ان لوگوں کو صنوبر کو باتیں سنانے اور اپنی مرضی پر چلانے میں آسانی ہوگی 'مگر ننھے میاں ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو محض ظاہر کو دیکھ کر زندگی کے فیصلے کرلیتے ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں وہ شعور کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں صورت کی چار روزہ چاندنی پر سیرت کی دائمی خوب صورتی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ صنوبر کی نرم مزاجی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو جاننے کے لیے انہیں کسی نجومی کی ضرورت نہیں تھی' بلکہ اس کے لیے ان کا باہر کی دنیا کا تجربہ ہی کافی تھا۔ لہٰذا وہ خوش اور مطمئن تھے۔ مگر یہ اطمینان بہنوں کا چین اڑا رہا تھا' جب ہی آنکھوں آنکھوں میں تینوں نے اشارے کیے اور ناشتے کے لیے بیٹھے اکرم اور صنوبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرزانہ بولیں۔

"اے بھابھی۔ رات تو میک اپ سے تمہاری شکل ہی بدل گئی تھی' کالی رنگت کو کیسا صاف بنادیا تھا پارلر والی نے۔ مجھے بھی بتا دینا' میں ولیمہ کا میک اپ وہیں سے کرواؤں گی۔ ویسے تو میں کترینہ لگتی ہوں۔ (اللہ معاف کرے) مگر ذرا ہم بھی دیکھیں کہ وہ صرف بدصورت لوگوں کو خوب صورت بناتی ہے یا خوب صورت لوگوں کو بھی مزید خوب صورت بناتی ہے۔"

آخر میں ٹھٹھا مار کر ہنسیں اور باقی دو بہنوں نے بھی ساتھ دیا۔ اس بے ہودہ جملے پر اکرم صاحب صرف پہلو بدل کر رہ گئے۔ شادی کے پہلے ہی دن بیوی کی حمایت میں کچھ بول کر وہ جورو کا غلام کا خطاب حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے' مگر بہن پر ایک کڑی نگاہ ضرور ڈالی جو انہوں نے کمال صفائی سے نظرانداز کردی' جبکہ صنوبر بڑے تحمل سے گویا ہوئی۔

"جی ضرور آپا' میں آپ کو ضرور بتادیتی ہوں کہ پارلر کہاں ہے۔ وہ آپ کا بھی بہت اچھا میک اپ کرے گی۔" یہ سیدھا سادا جواب سن کر تینوں بہنوں کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں' وہ تو صنوبر کی طرف سے ٹکڑا توڑ جواب کی منتظر تھیں۔ جس کو بنیاد بنا کر کوئی جھگڑا شروع کیا جاسکے' مگر یہ پلان تو ناکام ہوگیا تھا۔ خیر ابھی آگے بہت مواقع تھے جن سے فائدہ اٹھا کر بھابھی کا جینا حرام کیا جاسکتا تھا۔



ولیمہ کے ایک ہفتے بعد ہی کھیر پکوائی کی رسم ادا کرکے صنوبر کے اوپر گھر کی ساری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ اتنی جلدی کام سونپ دینے کا عذر یہ پیش کیا گیا کہ تینوں بہنیں تو اپنے گھر کی ہیں اور اماں سے تو اب اتنا کام ہوتا نہیں' تو بھئی اب بہو سب سنبھال لیں' ورنہ کون کرے گا کام۔ صنوبر نے ماتھے پر ایک شکن لائے بغیر بہت خوش اسلوبی سے ساری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ تین آدمیوں کا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔ وہ اپنی جاب جاری رکھتے ہوئے بھی آرام سے گھر سنبھال لے گی' مگر جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ گھر کے تین لوگ تو محض نام کے تھے۔ آئے دن تینوں بہنیں اپنے اپنے بچوں سمیت میکے آدھمکتی تھیں اور ان کی آمد کے ساتھ ہی مختلف کھانوں کے فرمائشی پروگرام جاری ہوجاتے تھے۔ وہ بہنیں جو پہلے میکے آنے پر بازار سے کھانے منگوا منگوا کر کھاتی تھیں' اب وہی بازاری کھانے ان کو سخت مضر صحت لگنے لگے تھے۔ لہٰذا بھابھی سے کہا جاتا کہ بریانی' حلیم' نہاری یا کوفتے گھر پر تیار کیے جائیں اور ان مشکل کھانوں کی تیاری میں کوئی بھی اس کی مدد نہیں کرواتا تھا اور نہ ہی اسے کسی قسم کی رعایت دی جاتی تھی کہ وہ رات میں یہ کھانے تیار کرلے۔ سو ہوتا یہ تھا کہ اکثر صنوبر تھکی ہاری گھر میں داخل ہوتی اور اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر وہ فوراً" آرام کے لیے کمرہ بند کرکے سو جائے گی' مگر سامنے ہی تینوں نندیں بمعہ بچوں کے

براجمان ہوتیں اور اس کی شکل دیکھتے ہی کہتیں۔
"بڑی دیر لگادی آنے میں۔ کب سے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ تم آؤ تو کھانا بنا کے کھلاؤ ہمیں۔ بھئی ہم تو اب باورچی خانے میں جاتے نہیں کہ کہیں تم برا مانو کہ میرے گھر میں دخل اندازی کرتی ہیں۔ بھئی ہم نے تو اپنا بھائی اور پورا گھر تمہیں سونپ دیا ہے۔ اب تم جانو' تمہارا کام۔ اب اگر دل چاہے تو کھانا بنا کر کھلادو' ورنہ ہم تو گھڑی دو گھڑی کو آتے ہیں' کہو تو وہ بھی نہیں آئیں گے۔" ایک سانس میں کہی بے ربط باتیں جن کا مقصد صرف صنوبر کو ستانا ہوتا تھا۔ سن کر صنوبر زبردستی مسکراتے ہوئے کہتی۔
"ارے نہیں باجی' آپ کا اپنا گھر ہے' جب چاہیں آئیں۔ میں ابھی کھانا بناتی ہوں۔ بتائیں کیا بناؤں۔"
اور یہ سنتے ہی مختلف فرمائشیں کردی جاتیں جن کو پورا کرنے میں وہ ہلکان ہوجاتی۔ کوئی بھی کچن میں آکر نہ اس کی مدد کرواتا' نہ یہ کہہ سکتی تھی۔ ہاں البتہ جب کھانا سامنے آتا تو اس پر نکتہ چینی کرنا حق سمجھا جاتا' یہ سوچے بغیر کہ نہ صرف کسی کی دل آزاری ہورہی ہے' بلکہ کھانے میں نقص نکالنے کا فعل اللہ کو بھی کتنا ناگوار گزرتا ہے۔ ایک دن اسی طرح صنوبر کے بنائے گئے چکن پلاؤ میں خامیاں نکال نکال کر اور بوٹیوں کی کمی کا رونا رو' رو کر کھانے سے انصاف کیا جارہا تھا تو صنوبر نے ہمت کرکے شبانہ کو ٹوک ہی دیا۔
"آپا حدیث میں ہے کہ اگر کھانا پسند نہ آئے تو اس کو خاموشی سے چھوڑ دو' مگر اس میں نقص نہ نکالو اور جہاں تک بوٹیاں کم ہونے کی بات ہے تو جتنا گھر میں موجود ہوگا اتنا ہی پکاؤں گی نا۔" بس یہ جائز بات کہنا غضب ہوگیا۔ شبانہ نے وہ واویلا مچایا کہ آس پاس کے لوگ اپنے گھروں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے۔
"ارے اب ہمارا یہاں آنا' کھانا اور کچھ کہہ دینا بھی برا لگنے لگا۔ چھ مہینے میں ہی یہ حال ہوگیا۔ تم ہمیں یہ کہہ رہی ہو کہ ہمارے آنے سے تمہارا بجٹ خراب ہوجاتا ہے۔ گوشت کم پڑجاتا ہے۔ ارے آئندہ اپنے گھر سے لے کر آئیں گے کھانے کا سامان' تم رکھو سب اپنے پاس۔"
صنوبر حیرت سے منہ کھولے یہ سب سن رہی تھی۔ اس کے تو سان و گمان میں نہ تھا کہ اس کے دو جملے یہ طوفان لے کے آئیں گے۔ خشک ہوتے گلے اور کپکپاتی آواز کے ساتھ اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔
"نہیں آپا! میں نے یہ تو نہیں کہا' میں نے تو صرف..." مگر شوکت جہاں نے اس کو ڈانٹ کر چپ کروادیا۔
"ارے چپ رہ۔ تو ہوتی کون ہے میری بچیوں کو حدیثیں پڑھانے والی' تجھے تو میں ننھے سے ٹھیک کرواتی ہوں۔" اور صنوبر کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ رات تک وہ وقفے وقفے سے اپنی نندوں سے معافیاں مانگتی رہی' مگر وہاں اکڑ برقرار رہی اور جب ننھے میاں تھکے ہارے گھر آئے تو "مقدمہ" نئے سرے سے کھولا گیا اور شبانہ صاحبہ نے رو' رو کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی روداد بھائی کو سنائی۔ توقع یہ ہی تھی کہ ابھی بھائی اٹھ کر بیوی کو چوٹی پکڑ کر نکال باہر کرے گا۔ مگر اس وقت امیدوں پر پانی پھر گیا جب ننھے نے صرف بیوی پر ایک نظر ڈالی اور سخت آواز میں کہا۔
"آئندہ تم میری بہنوں کے لیے کھانا نہیں بناؤ گی' میری بہنیں تمہاری محتاج نہیں ہیں۔ یہ آئندہ جب بھی آئیں گی تو میں ان کے لیے خاص طور پر باہر سے کھانا لے کر آؤں گا اور آپا' آپ اب جب بھی آئیں تو بس مجھے ایک فون کرکے بتادیں کہ آپ کو کیا کھانا ہے' میں فوراً" لے کر آجاؤں گا۔"
آپا تو اتنی عزت افزائی پر نہال ہی ہوگئیں اور صنوبر کو اور تو کچھ سمجھ نہ آیا' بس کمرے میں جاکر زاروقطار رونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ننھے میاں اندر داخل ہوئے۔ صنوبر نے خفگی سے منہ پھیرا تو ننھے میاں پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولے۔
"لو بھئی یہ بن بادل برسات کیوں؟ اور مجھ سے کیا ناراضگی' میں نے تو کھانا بھی نہیں کھایا' نہ اس میں نقص نکالے تو مجھ غریب پر یہ ستم کیوں۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ بات ہوئی کیا تھی اور بس فوراً" فیصلہ سنا دیا کہ آئندہ تم کھانا نہیں بناؤ گی۔ یقین کریں' میں نے تو۔" صنوبر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ننھے میاں اس کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرکے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرا چکے تھے۔

"عقل مند! تم سے کچھ اس لیے نہیں پوچھا کہ میں اچھی طرح اپنی بہنوں کی فطرت سے واقف ہوں کہ انہوں نے محض پر کا کوا بنایا ہوگا' مگر یہ بات کہہ کر میں تمہارے خلاف کوئی نیا محاذ نہیں کھلوانا چاہتا تھا۔ میں چھ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تم گھر' جاب اور مہمان داری کے درمیان کس طرح گھن چکر بنی رہتی ہو' میں بہت دن سے چاہ رہا تھا کہ کم از کم یہ فرمائشی کھانے بنانے سے تمہاری جان چھڑواؤں' لیکن یہ کام ایسے کرنا تھا کہ نہ تم بری بنو' نہ مجھ پر بیوی کی حمایت کا الزام آئے' اور آج یہ موقع خود آپا نے فراہم کردیا۔ اب تمہیں ان کی خاطر تواضع کے لیے گھن چکر بننے کی ضرورت نہیں' اب تمہیں کچھ پکانے کو کہیں تو تم معصوم شکل بنا کر کہہ دینا کہ اکرم نے منع کیا ہے' مجھے ڈانٹ پڑے گی' اور ادھر میں ان کے فرمائشی پروگرام پورے کرکے ان کو بھی خوش کردوں گا۔ اور پلیز اب تم یہ جاب بھی چھوڑ دو' اگر مناسب سمجھو تو' مجھے تمہاری کمائی کی ضرورت نہیں۔ البتہ تم خوشی سے کرنا چاہو تو میں روکوں گا نہیں۔ اب مجھ غریب بھوکے آدمی کو آج کھانا دیا جائے گا یا نہیں۔" آخر میں لہجہ متبسم ہوگیا اور صنوبر تو مارے تشکر کے کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اپنے آنسو صاف کرکے وہ اٹھنے لگی تو اکرم صاحب نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اور ابھی چہرے پر ہنسی اور اطمینان مت لانا' کوئی نہ کوئی دروازے کے پاس ہی کھڑا کن سوئیاں لے رہا ہوگا۔ لہٰذا جلدی کھانا لاؤ پھوہڑ عورت۔" آخری جملہ خاصا دھاڑ کر کہا گیا' تاکہ باہر والے سن لیں اور جب صنوبر باہر نکلی تو دروازے کے ساتھ کھڑی نادرہ سٹپٹا کر رہ گئی اور صنوبر' اکرم کے اتنے درست اندازے پر بمشکل ہنسی ضبط کرتی کچن میں جاکر کھانا گرم کرنے لگی۔



صنوبر کے جاب چھوڑنے کی خبر گھر والوں پر بجلی بن کر گری۔ ان چھ مہینوں میں صنوبر نے اپنی ضرورت کے لیے کچھ روپے نکال کر پوری تنخواہ شوکت جہاں کے ہی ہاتھ پر رکھی تھی' جسے وہ شروع کے رسمی انکار کے بعد اب اپنا حق سمجھ کر وصولتی تھیں اور نہایت آرام سے بیٹیوں اور ان کے بچوں پر خرچ کرتی تھیں۔ اب یوں ان چند ہزار روپوں سے محروم ہوجانا ان کو بڑا کھل رہا تھا۔ اس تنخواہ کو دے دینے کے علاوہ بھی صنوبر اکثر ان چھوٹی موٹی فرمائشوں کو پورا کرتی رہتی تھی' جو نندوں کے بچے مامی سے بڑے دھڑلے سے کرتے تھے۔ بیٹ بال' پیانو والا جیومیٹری باکس' باربی ڈول کتنی ہی چیزیں اس نے بچوں کو لا کردی تھیں اور اس خرچ کے لیے وہ اپنے خرچ میں سے کٹوتی کرتی تھی۔ وہ کوئی فرشتہ صفت قسم کی آسمان سے اتری بہو نہ تھی' مگر ہر لڑکی کی طرح وہ بھی سسرال والوں کو اپنا بنانا چاہتی تھی اور اس کے لیے تھوڑا پیسہ خرچ کرنا کوئی گھاٹے کا سودا نہ تھا' مگر ان چھ مہینوں میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ لہٰذا جب اکرم نے اسے جاب چھوڑنے کا کہا تو وہ بخوشی مان گئی کہ اس کی اپنی ضروریات تو اکرم پورا کردیتے تھے اور اس کو یقین تھا کہ وہ اکرم سے جب بھی جتنے پیسے مانگے گی وہ اسے دے دیں گے۔ اتنا اچھا ہم سفر مل جانے پر اس کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کررہا تھا۔

شوکت جہاں نے ننھے میاں سے صنوبر کی جاب چھڑوانے کی وجہ پوچھی' درحقیقت وہ یہ چاہ رہی تھیں کہ اگر یہ فیصلہ صرف صنوبر کا ہو تو وہ ننھے میاں پر زور دے کر اس سے جاب جاری رکھوانے کا کہیں گی' مگر ننھے میاں نے کہا۔

"نہیں اماں! کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ جاب کرنے والی لڑکیاں زیادہ سر چڑھنے لگتی ہیں' یہ بھی

کہیں ایسی نہ ہو جائے۔ بس یہ گھر بیٹھے اور تمہاری خدمت کرے۔ تمہیں پیسے چاہیے تو مجھے کہو۔"

"نہیں، نہیں۔" کہہ کر ان کی بلائیں لینے لگیں اور دوپہر کے لیے سبزی کاٹتی صنوبر اکرم کی اس چاپلوسی پر ان کو دل ہی دل میں داد دینے لگی۔ شوکت جہاں کچھ اس لیے بھی خاموش ہو گئیں کہ صنوبر اب امید سے تھی اور اصل سے زیادہ سود تو پیارا ہوتا ہی ہے۔

جاب چھوڑنے سے صنوبر اور اکرم کا یہ خیال کہ صنوبر کو اس حالت میں آرام مل جائے گا، خام خیالی ثابت ہوا۔ گھر کے کام تو ہوتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ اب اس کو زچ کرنے کا ایک اور انداز اپنایا گیا تھا کہ اب جو بھی نند آتی اپنے ساتھ میلے کپڑوں کا گٹھر اٹھا لاتی کہ بھابھی تو سارا دن گھر پر فارغ ہی ہوتی ہیں، سوچا مل کے دھلوا دیں گی۔ اب یہ الگ بات کہ ایک دو پھیروں کے کپڑے دھونے کے بعد وہ خود تو بچوں کے تنگ کرنے کا بہانہ کرکے کمرے کی راہ لیتیں اور صنوبر باقی ماندہ کپڑے دھو، دھو کے ہلکان ہو جاتی یا پھر صنوبر کو شامی کباب، چنے یا گاجر کا ڈھیر حلوہ بنانے کا آرڈر دے دیا جاتا اور وہ کباب سل پر پیستے پیستے حلوہ بھونتے بھونتے تھک کر چور ہو جاتی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے اور صنوبر اپنا گھر بنائے رکھنے کی خاطر سب کچھ سہ رہی تھی، مگر اب اس کی جسمانی حالت اس بے تحاشا تھکن کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ لہٰذا ایک دن کچن میں کام کرتے ہوئے وہ بری طرح چکرا گئی۔ بڑی دقتوں سے اس نے اکرم صاحب کو آواز دی اور ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر شوکت جہاں کے بھی ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ بیٹیوں کا ساتھ دینے کے چکر میں وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ کچھ زیادہ ہی زیادتی کر گئی تھیں۔

"اب آئے گی تو کوئی کام نہیں کرواؤں گی۔ ان نگوڑ ماریوں کو بھی ڈانٹوں گی کہ بھابھی کا خیال کریں۔ اے میرے بچے کی نسل آگے چلنی ہے۔ کم بختوں نے میری مت بھی مار دی ہے۔" ننھے میاں کے ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آنے تک وہ یوں ہی صحن میں چکر کاٹتی وعدے وعید کرتی رہیں، مگر جب ننھے تنہا گھر میں داخل ہوئے تو وہ حیران ہو کر ان کی طرف لپکیں۔

"دلہن کہاں ہے؟ کہاں چھوڑ آئے؟" ننھے میاں نے ماں پر ایک کٹیلی نگاہ ڈالی اور اپنے ابلتے غصے پر قابو پا کر بولے۔

"صنوبر کو اس کے میکے چھوڑ آیا ہوں، وہ اب ڈلیوری تک وہیں رہے گی۔ میں اس کا سامان لینے آیا ہوں، تاکہ لے جا کے دے دوں اسے۔"

"مگر کیوں، ابھی تو چار مہینے باقی ہیں اور ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں کہ بہو میکے جا کر رہے اور بچے کی پیدائش وہیں ہو۔ میں جا کر اسے لے آتی ہوں۔" شوکت جہاں یہ سب کچھ بہت دل سے، بہو کی محبت میں کہہ رہی تھیں۔ مگر ننھے تو ان پر الٹ ہی پڑے۔

"کیوں؟ کیوں لے کر آئیں گی آپ اسے؟ تاکہ وہ یہاں کولہو کے بیل کی طرح پھر سے کام کرے؟ اس کا انسان ہونا آپ لوگوں کو نظر نہیں آتا جو آپ لوگ حد سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ میں اگر کچھ کہتا نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے کچھ نظر بھی نہیں آتا۔ ایک سال میں آپ لوگوں نے اتنی زیادتیاں کی ہیں اس کے ساتھ کہ میں تو حیران ہوں کہ کیا سگے بیٹے کی بیوی سے بھی اتنی نفرت کی جا سکتی ہے؟ اور اب مجھے جورو کے غلام کا طعنہ مت دیجیے گا۔ آپ خود بھی جانتی ہیں کہ آپ نے زیادتی کی ہے، میں صرف آئینہ دکھا رہا ہوں۔ وہ ہرگز یہاں نہیں آئے گی، اب ڈلیوری تک۔ اب خود سنبھالیں اپنا گھر آپ اور آپ کی بیٹیاں۔"

دونوں طرف توازن رکھنے کے خواہش مند ننھے میاں، آج بول پڑے تھے کہ شاید یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ جس میں توازن رکھنا ناممکن نہ سہی تو بہت مشکل ضرور ہے، اور شوکت جہاں مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کو افسوس اور شرمندگی ضرور تھی، مگر جب شبانہ کو فون پر ساری گفتگو سنائی تو شبانہ جھٹ میکے آ پہنچیں اور بھائی کو سخت سست کہا، جس کا اکرم صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنی اماں کو سمجھایا کہ۔۔۔

"ہرگز بہو کے لیے ۔۔۔ نرم کرنے کی ضرورت

نہیں، ورنہ سر چڑھ کر ناچے گی۔ وہ میکے جاکر بیٹھ گئی' تم سے اجازت بھی نہ لی۔ ارے ناراض ہوتا تو تمہارا اپنا ہے۔'' اس قسم کی باتیں کرکے انہوں نے شوکت جہاں کو خوب مطمئن کردیا اور جب صنوبر نے بیٹی کو جنم دیا تو نہ شوکت جہاں اسے دیکھنے گئیں اور نہ ہی ان کی بیٹیاں۔ اس رویے پر جہاں ننھے میاں کو شدید دکھ ہوا، وہیں صنوبر کے گھر والوں نے بھی شکوہ کیا' مگر اکرم صاحب محض خاموش رہنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکے۔ بات صرف خفگی اور ناراضگی تک رہتی تو ٹھیک تھا' مگر جب صنوبر بچی کو لے کر واپس سسرال پہنچی تو چاروں ساس' نندوں نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔ صنوبر کی والدہ' بہن اور بھائی اس کو چھوڑنے آئے تھے اور اس دفعہ وہ بھی خاموش نہیں رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نادرہ نے صنوبر کو تھپڑ مارا اور بچی کو بھی اس کی گود سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس پر صنوبر کے گھر والے مزید بھڑ گئے اور پولیس بلوالی۔ وہ تو بھلا ہو کسی محلے والے کا' جس نے اکرم صاحب کو بروقت بلوالیا اور انہوں نے اپنے سسرال والوں کی منت سماجت کرکے معاملہ ٹھنڈا کروایا۔

صنوبر کو انہوں نے واپس میکے جانے کا کہا اور یہ بھی کہا' کچھ دن میں' میں خود آکر تمہیں لے جاؤں گا۔ ماں' بہنوں سے انہوں نے کچھ نہیں کہا' نہ گلہ' نہ شکوہ کیا' مگر اگلے دن جب دو کمروں کے مکان کے اوپر مزید دو کمرے بننے شروع ہوئے تو بہنوں کے واویلا مچانے پر انہوں نے صرف اتنا کہا۔

''جب دلوں میں اتنی نفرت ہو تو الگ رہنا ہی بہتر ہے۔ میں چالیس سال کی عمر میں اب دوسری شادی نہیں کرسکتا' نہ ہی اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ سکتا ہوں۔ میری زندگی کے بہت سے قیمتی سال ازدواجی خوشیوں کے لیے ترستے گزرے ہیں' مزید سال برباد نہیں کرسکتا۔ میری بیوی پر صرف میری خدمت کرنا فرض ہے۔ تمام سسرال والوں کی نہیں' اور یہ حق اسے دین دیتا ہے اور اگر یہ حق نہ ہوتا' تب بھی جب میری بہنیں سسرال سے الگ رہتی ہیں تو وہ کیوں نہیں۔ تم لوگوں کا خیال میں ویسے ہی رکھوں گا' لیکن اب تم لوگ اوپر کے حصے میں نہیں آؤ گے' نہ ساتھ کھاؤ گے۔''

یوں ننھے میاں ۔۔۔ صنوبر کے ساتھ اوپر شفٹ ہوگئے۔ صنوبر اماں کو کھانا پہنچادیتی۔ جب وہ بیمار ہوتیں تو حتی المقدور تیمار داری بھی کرتی' لیکن نندوں کو اب کھانا خود ہی پکانا پڑتا ہے۔ وہ جب بھی آئیں' لہٰذا اب ان کا آنا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔ ننھے میاں اب بھی بہنوں پر ویسے ہی کھلا خرچ کرتے ہیں' لیکن وہ بے تکلفی اور اپنائیت اب ان کے رویے سے مفقود ہے جو پہلے تھی اور خود اب بہنیں بھی ان سے کچھ کہتے جھجکتی ہیں کہ اب شوکت جہاں بھی بیٹیوں کو برا بھلا کہتی ہیں کہ جن کے کہے میں آکر انہوں نے ہمیشہ بہو کو پرایا ہی سمجھا۔ انہوں نے ننھے میاں سے کئی دفعہ بہو سے معافی مانگنے کے لیے کہا' جس پر ننھے میاں ان کے پیر پکڑ کر کہتے ہیں۔

''اماں تم مجھے گناہ گار نہ کرو۔ مگر یہ شیشہ جو ٹوٹ گیا اسے ٹوٹا ہی رہنے دو' اس کو جوڑو گی تو بھی دراڑ ہمیشہ رہے گی۔''

ننھے میاں کا الگ رہنے کا فیصلہ شاید غلط ہو' لیکن سوال یہ ہے کہ اس فیصلے کی حد تک ان کو پہنچانے والے رویے کیا ٹھیک تھے؟ اگر معاشرے میں ہر دوسرے گھر میں بہو کے ساتھ روا رکھے جانے والا یہ رویہ ہندوانہ رسم و رواج کا مرہون منت ہے' تو ان رسوم سے علیحدہ ہوئے تو ہمیں نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہوگیا' ابھی بھی ذہن و دل اتنے تنگ کیوں؟ بہو نہ گھر سے بھاگ کر آتی ہے' نہ خرید کر لائی جاتی ہے' پھر ہمیشہ پرائی کیوں ہوتی ہے؟ بہو کے ساتھ کچھ بھی برا کرتے یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ وہ بیٹے کا نصف ہے۔ اس کو تکلیف دینا بیٹے کو بھی تکلیف دیتا ہے؟ اگر ننھے میاں الگ نہ ہوتے تو جلد یا بدیر یا تو وہ خود پاگل ہوجاتے یا صنوبر کو طلاق دے دیتے' تو کیا یہ حل قابل قبول ہے؟ شوکت جہاں کے مرنے کے بعد کیا ان کی بیٹیوں کے لیے کوئی میکہ ہوگا۔ جہاں آکر وہ اپنے دکھ سکھ کہہ سکیں؟ اگر وہ بھابھی کو تھوڑی سی عزت و تکریم دے دیتیں تو کیا بھائی کے دم سے میکے کا مان برقرار نہیں رہتا؟





کمرے کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ کمرے کی ساری بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے گرے ہوئے تھے لیکن پھر بھی دروازے کی درز سے ہلکی سی روشنی کی لکیر سی کمرے میں داخل ہو کر اس گھرے اندھیرے کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ریحاب فرش پر بچھے کارپٹ پر سر گھٹنوں میں دیے اور دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ وہ رو رو کر تھک چکی تھی مگر درد تھا جو کسی صورت کم نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں مسلسل گریہ وزاری سے سرخ ہو رہی تھیں اور پپوٹے بے حد بھاری۔ کئی گھنٹوں سے ایک ہی زاویے سے بیٹھنے کی وجہ سے جسم اکڑ گیا تھا۔ مگر اسے جسمانی تکلیف کی پرواہ ہی کب تھی۔ جو درد اسے قریبی رشتوں سے ملا تھا اس کے بعد سے تو ہر اذیت پر تکلیف جیسے ثانوی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

اس کا موبائل پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل بج رہا تھا۔ وہ بے حس بنی رہی۔ موبائل چیخ چیخ کر خاموش ہو جاتا اور پھر چند لمحوں بعد پھر سے بجنے لگتا۔ اب پھر موبائل بجنا شروع ہو چکا تھا۔ عمر کی مستقل مزاجی کی حد تھی۔

ریحاب نے اپنا بھاری ہوتا سر گھٹنوں سے اوپر اٹھایا۔ بے تحاشا رونے کے باعث آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی اکڑے وجود کے ساتھ وہ بیڈ تک آئی۔ اپنی جگہ سے اٹھنے اور بیڈ تک آنے کے لیے اسے بے حد جسمانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جوڑ جوڑ درد سے چیخ اٹھا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور فون

عنبرین ولی

بس کوئی تیرے سوا



ریسو کیا۔

"ریحاب۔ تم نے کیا سوچ کر مجھ سے اتنی گھٹیا بات کی۔ بولو؟" عمر کی سرد آواز اس نے سنی۔ اس کی آنکھیں پھر سے نیر بہانے لگیں۔

"میں پچھلے چار گھنٹوں سے تمہیں مسلسل فون کر رہا ہوں تم فون ریسیو نہیں کر رہیں' میرے میسجز کا جواب بھی نہیں دے رہیں۔ تمہیں لگ رہا ہے میں تمہیں بخش دوں گا۔ تمہیں اس کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔" غصے اور پریشانی میں ڈوبی عمر کی آواز۔ اس نے اپنی سسکی روکی۔

"عمر۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہے۔ وہ بہت سوچ کر کہا ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں' بہتر ہے تم بھی

ناولٹ



اس فیصلے کو قبول کرلو اور تمام کاغذی کارروائی کر کے مجھے طلاق نامہ بھیج دو۔ خدا حافظ۔"

ریحاب نے یہ تمام جملے ادا کرتے وقت اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی اس کی آواز لرزتی رہی۔ عمر نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے اسکرین کو گھورتی رہی۔



وہ سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ صبح اچانک ہی ریحاب کا فون آیا اور اس نے اپنی طرف سے سارے رشتے ختم کر ڈالے۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وجہ بتانے پر وہ راضی نہیں تھی۔ وہ مستقل اس کا نمبر ملا رہا تھا۔ اور جب اس نے فون اٹھایا بھی تو کیا کہا۔؟ اس کی آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ رو رہی ہے اور بات کرنے کے دوران بھی وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عمر کو اس بات کا احساس ہو اس لیے اس نے اپنے لہجے کو مزید کٹھور بنا لیا ہے۔ مگر عمر کو کیسے معلوم نہ ہوتا۔؟ وہ تو اس کی سانسوں میں بستی تھی۔ وہ اس سے بے خبر کیسے ہو سکتا تھا؟ عمر کو اندازہ تھا کہ وہ خود پر جبر کر کے اس سے بات کر رہی ہے۔ اس لیے اس نے فون کاٹ دیا۔

عمر نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا موبائل اپنی نیلی جینز کی پاکٹ میں ڈالا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ریحاب کا وہ فضول سا فون آتے ہی اسے اس سے ملنے کے لیے جانا چاہیے تھا۔ یہ اتنے سارے گھنٹے ضائع کرنے کے بجائے آمنے سامنے ہو کر اس سے سیدھی بات کرنی چاہیے تھی۔ اسے بھروسا تھا کہ اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو وہ اسے اصل وجہ بتا دیتی اور شاید اب تک معاملہ سلجھ بھی چکا ہوتا۔

وہ خود کو ملامت کرتا تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ نگاہ ضوفشاں بیگم پر پڑی۔ وہ نفیس سی ساڑھی پہنے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ بڑا میاں اترتے عمر کو دیکھ کر وہ اس کے قریب آئیں۔

"شکر ہے کہ تم گھر پر ہو؟" عمر نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ضوفشاں نے بے حد غور سے اس کے حلیے اور پریشان چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہ عمر کی انگلیوں میں دبی چابی پر تھی پھر وہ بڑے آرام سے گویا ہوئیں۔

"مجھے ضروری کام سے جانا ہے اور تمہارے پاپا اب تک نہیں پہنچے۔ نجانے وہ کب آئیں تم ہی مجھے ڈراپ کر دو۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔" عمر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ ضوفشاں بیگم پھر سے بولیں۔

"غالباً" تم بھی کہیں جا رہے ہو" اس سادہ اور لاپرواہ حلیے میں وہ صرف اور صرف ریحاب سے ملنے ہی جا سکتا ہے یہ بات انہیں اچھی طرح معلوم تھی اور انہیں تو یہ بھی معلوم تھا کہ ریحاب نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس سے ملے۔ عمر کو روکنے پر تو وہ قادر نہیں تھیں لیکن اسے زچ تو کیا جا سکتا تھا سو وہ کر رہی تھیں۔ ذوالقرنین نے انہیں کہا تھا کہ وہ راستے میں ہیں اور پہنچنے والے ہیں مگر پھر بھی وہ عمر سے ڈراپ کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ عمر نے انہیں جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملایا۔

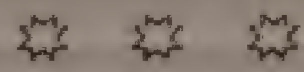
"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اور تم مجھے جواب دینے کے بجائے فون کے ساتھ لگ گئے۔" انہیں عمر کی یہی حرکتیں غصہ دلاتی تھیں کہ وہ انہیں اہمیت دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

"پاپا! آپ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں؟ ممی بڑی بے صبری سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" وہ طنزیہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ عمر کی چالاکی پر وہ سلگ کر رہ گئیں۔

"او کے ٹھیک ہے خدا حافظ۔" اس نے فون کاٹ کر موبائل پھر سے پاکٹ میں رکھا اور ان کی

طرف دیکھا۔

"پاپا کہہ رہے ہیں، وہ پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے اور آپ تب تک اپنا میک اپ ٹھیک کرلیں۔ آپ کی ٹھوڑی پر لپ اسٹک لگ گئی ہے۔" وہ آخری سیڑھی سے چکنے فرش پر قدم رکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے بولا۔ وہ جو اسے خوب سنانے کا ارادہ رکھتی تھیں فوراً کمرے کی جانب بھاگیں۔ عمر کو ان کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ان کی ٹھوڑی پر لپ اسٹک نہیں لگی تھی لیکن وہ اس وقت ان کے سوال و جواب میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ان کے جاتے ہی باہر کی جانب بڑھ گیا۔



روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی، کسی کے ہاتھوں کالمس محسوس کر کے اس نے یک دم آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا اسے لگا وہ خواب دیکھ رہی ہے کتنا حسین خواب۔ اس نے پھر سے آنکھیں موندلیں۔ ہڑبڑائی تب جب اس کے ہاتھ پر عمر کے ہونٹ ثبت ہوئے تھے۔ وہ جھٹکا کھا کر اٹھی، وہ سامنے بیٹھا اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح خائف ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ موڑ کر تکیے پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اپنے گرد لپیٹا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا ریحاب کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ عمر کا یوں بلا اجازت اس کے کمرے میں آنا اور استحقاق سے بیٹھنا ان سب نے اس کے غصے کو بڑھا دیا۔

"تمہیں، مجھے یہاں دیکھ کر ضرور حیرت ہو رہی ہوگی کہ انکل کی غیر موجودگی میں گھر کیسے آگیا، بلکہ سیدھا تمہارے کمرے میں ہی آگیا۔" وہ ریحاب کا سرخ چہرہ دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ وہ گردن موڑے بیٹھی رہی جیسے وہ یہ ساری گفتگو دیواروں سے کر رہا ہو۔

"مجھے تم نے یہاں بلایا ہے ریحاب۔" اس الزام پر ریحاب نے شدید غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر مجھ سے ملنے کے لیے تمہارا دل اتنا ہی بے قرار تھا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا۔ میں آجاتا۔ اتنا بڑا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بیڈ پر پھیل کر بولا۔ یوں کہ اس کا کندھا ریحاب کے کندھے سے لگ گیا، وہ پیچھے ہوئی مگر عمر نے اپنا بازو اس کے گرد حائل کر دیا۔ ریحاب اچنبھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ کل رات سے شدید اذیت برداشت کر رہی تھی۔ ہزار جتنوں کے بعد اس نے عمر سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ کتنی تکلیف اٹھا رہی تھی وہ یہ سن کر کہ... اور عمر۔ اسے یہ سب مذاق لگ رہا تھا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ شدید غصے سے اس کی گویائی ہی سلب کرلی تھی۔ مگر آنکھوں کو بہنے کا بہانا مل گیا تھا۔ عمر اسے روتا دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"ریحاب۔ کیوں رو رہی ہو؟" وہ پریشان سا پوچھ رہا تھا۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"پلیز۔ خاموش ہو جاؤ اور بتاؤ" آخر کیا ہوا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ اس کے چہرے پر سے زبردستی ہٹا کر بولا۔

"آپ یہاں سے جائیں بس۔" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ عمر نے بے چارگی سے اسے دیکھا، وہ اسے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ اگر اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو سارا غصہ بھول جاتی۔

"ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا لیکن ایک شرط پر۔" وہ جانتی تھی کہ اس کی شرط کیا ہے۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنا زیادہ کیوں رو رہی ہو؟" وہ اس سے قطع تعلق کی وجہ دریافت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے یوں بلک بلک کر رونے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ حالانکہ گھر سے نکلنے سے پہلے اور یہاں پہنچنے تک اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس سے اس فضول بات کی وجہ پوچھ کر ہی ٹلے گا، مگر اسے روتا دیکھ کر اسے بس یہی پوچھنا یاد رہا تھا، عمر کی آنکھوں میں اپنے لیے بے تحاشا محبت دیکھ کر وہ نگاہ چرا گئی۔

"یہاں جو کچھ بھی ہوا اس میں کیا عمر قصور وار ہے؟" وہ پھر سے سوچنے لگی۔ اس کا دل کچھ اور کہہ رہا تھا اور دماغ کچھ اور۔ اسے صرف وہ کرنا تھا جو دماغ نے سمجھایا۔ دل کی تمام دلیلیں، تمام ثبوت دماغ نے رد کر دیے تھے۔

"میں آپ سے اپنا ہر تعلق ختم کر چکی ہوں۔ میرا اب آپ سے کوئی رشتہ نہیں تو پھر میں ایک انجان شخص کو اپنے آنسوؤں کی وجہ کیوں بتاؤں؟" دل اور دماغ کی اس جنگ میں دماغ جیت گیا تھا۔ ریحاب کے آنسو تھم گئے تھے۔ اس کی آواز میں اب مضبوطی اور بے حد اجنبیت بھی تھی۔ عمر حق دق اسے دیکھنے لگا۔

"ریحاب..." اس ایک پکار میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دکھ، حیرانی، تکلیف... اس نے چہرہ موڑ لیا۔ عمر نے کندھوں سے تھام کر اپنی سمت موڑا۔

"میرا اور تمہارا تعلق اتنا کمزور ہرگز نہیں کہ ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے، میں جانتا ہوں کہ ضرور کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے اور اس نے تم پر بہت منفی اثرات مرتب کیے ہیں اور اسی کے زیر اثر تم یہ سب کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی دن میں تم بالکل نارمل ہو جاؤ گی۔ مجھے تم ساری حقیقت بتا دینا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ریحاب نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے۔

"مجھے جو فیصلہ کرنا تھا، وہ میں کر چکی ہوں۔ اب چاہے جتنا بھی وقت گزر جائے، میں اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرنے والی۔ مجھے ابھی طلاق چاہیے۔" اس نے سرد مہری سے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔ عمر کا ہاتھ بے ساختہ اٹھا۔ ریحاب گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آج کے بعد اگر تمہاری زبان پر غلطی سے بھی طلاق کا لفظ آیا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا اور میں دیکھتا ہوں کہ کیسے تم مجھ سے رشتہ توڑتی ہو۔ ساری دنیا سے لڑ کر تمہیں میں نے اپنے نام لکھوایا ہے مسز ریحاب عمر۔ اتنی آسانی سے میں تمہیں اپنی دنیا اجاڑنے نہیں دے سکتا۔ تم پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ یہ بات اپنے اس بچکانہ ذہن میں بٹھا لو تو بہتر ہے۔" عمر نے انتہائی سخت لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی اور اسے چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ ریحاب ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

عمر کا یہ جارحانہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج تک وہ اس سے نرمی سے پیش آتا رہا تھا۔ کسی گھرے سایہ دار درخت جیسا تھا وہ۔ دونوں کا نکاح ہوا تو وہ بھی آہستہ آہستہ اس کی محبت میں مبتلا ہونے لگی تھی۔

عمر سے دور ہونے کا فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی، مگر اس فون کال کے بعد تو جیسے اس نے خود یہ فرض کر لیا تھا کہ اسے ہر صورت عمر سے دور رہنا ہے۔ ایک مرد نے اس کا بھروسا توڑا تھا۔ دنیا کے سارے مردوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔



عمر بے حد شرمندہ تھا کہ اس نے ریحاب پہ ہاتھ کیوں اٹھایا۔ وہ خود کو ملامت کرتا رہا۔ ساری رات وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا۔ ریحاب کا روتا اداس چہرہ، بے چین نگاہیں، خود سے بھی کوئی راز چھپاتے کپکپاتے لب ساری رات نگاہوں میں گھومتے رہے۔ عمر کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ کانٹوں پر رات گزارنا کیا ہوتا ہے۔

آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو وہ اس حد تک جانے کا سوچ رہی تھی؟ اگر اسے مجھ سے کوئی شکایت ہوتی، وہ کم از کم ایک بار تو مجھ سے کہتی، لیکن اس سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے... کہیں ضوفشاں ممی نے تو... نہیں، ریحاب میرے اور ان کے تعلقات کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے۔ ان کے کسی جھوٹ پر تو وہ یقین کر ہی نہیں سکتی پھر۔ وہ وجہ اگر میری فیملی سے نہیں تو کیا خیر انکل یا منال سے متعلق ہو... لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس سب میں میری کیا غلطی؟ وہ پوری

رات اسی طرح اندازے لگاتا اور رد کرتا رہا۔
صبح ہوتے ہی اس نے ارادہ کیا کہ وہ آج پھر جائے گا اپنے رویے کی معافی مانگ کر اس سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرے گا۔ بغیر کپڑے تبدیل کیے صرف چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر اس نے اپنی سرخ آنکھوں کی جلن کم کرنے کی کوشش کی اور باہر نکل آیا۔
صبح سات بجے کا وقت تھا۔ گھر کے لوگوں کی صبح بہت دیر سے ہوا کرتی تھی اور آج تو ویسے بھی اتوار تھا بارہ بجے کے بعد ہی کسی کا چہرہ دیکھنے کو ملتا' مگر جب وہ لان میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ ضوفشاں بیگم لان میں واک کرتی پائی گئیں۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ جلدی سے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کہ ان کی نگاہ اس پر پڑی۔ ان کے پکارنے پر بیزار سا ہو کر پلٹا۔
"صبح صبح ایسی حالت بنا کر کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے انگلی سے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"میں اپنے دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔" وہ ناچاہتے ہوئے بھی چھپا گیا۔
"تمہارا ایسا کون سا دوست ہے ریحاب کے علاوہ جو اتنی صبح صبح بیدار ہو جاتا ہے بلکہ تمہیں اتنی ایمرجنسی میں بلاتا ہے کہ تمہیں کپڑے تک بدلنے کا ہوش نہیں رہتا۔" ایک تو تفتیش اس پر طنز۔ وہ غصے سے پلٹا۔
"ہاں۔ میں ریحاب سے ملنے جا رہا ہوں۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟"
وہ مسکرائیں۔
"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اور اعتراض ہو گا بھی تو کیوں؟ آخر کو وہ تمہاری دلاری منکوحہ ہے۔ دن ہو یا رات' تم کسی بھی وقت اس سے ملنے جا سکتے ہو۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اس پر چوٹ کی۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ عمر کی اس حالت کے پیچھے ریحاب بی بی کا ہی ہاتھ ہے۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ عمر' شکیل صاحب کی غیر موجودگی میں اس سے ملنے جائے۔ وہ ہفتے' دو ہفتے بعد ہی ان کے گھر جاتا تھا' وہ بھی کچھ دیر کے لیے' لیکن کل نہ صرف وہ ان کے گھر گیا تھا بلکہ ساری رات اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہی تھی اور اب اس کی سرخ آنکھیں' فکر مند چہرہ سارے راز اگل رہا تھا۔
"آپ کو کوئی اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے' کیوں کہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آپ کے کسی اعتراض کو کبھی خاطر میں نہیں لایا اور نہ ہی کبھی لاؤں گا۔" وہ بھی عمر تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ان کا جواب سننے کی زحمت نہیں کی تھی۔
جب وہ ریحاب کے گھر پہنچا تو زینت صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ عمر کو اتنی صبح دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئی۔ نوکرانی تھی وجہ دریافت تو کر نہیں سکتی تھی۔ البتہ فوراً "سلام کیا۔
"وعلیکم السلام! منال بی بی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"جی وہ تو دو دن سے اپنے گھر گئی ہوئی ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم؟" زینت کے جواب پر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کل اسے منال کا پوچھنے کا ہوش نہیں تھا اور آج جب پوچھا تو وہ یہاں تھی ہی نہیں۔
"آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟" وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے ریحاب کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ روشنی کے کمرے میں پہنچتے ہی ریحاب نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔
"ریحاب!" عمر کی بے قرار آواز پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
"آئی ایم ریئلی سوری۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ریحاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"تمہاری طلاق والی بات نے میرے ہوش و حواس سلب کر لیے تھے۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں۔ تم میرے لیے' میری سانسیں چلتی رہنے کے لیے ضروری ہو۔ اگر ریحاب نہیں تو عمر ذوالقرنین کے لیے

زندگی نہیں۔ تم اتنی آسانی سے مجھے موت کیسے دے سکتی ہو؟ کیسے مجھے اپنی زندگی سے نکال سکتی ہو؟" عمر کے لفظوں میں سچائی کی مہک اور جذبات کی تڑپ تھی۔ ریحاب کا دل کانپ گیا۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

"تمہارا یوں رونا ثابت کرتا ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میرا ساتھ تمہیں قبول ہے۔ تم بھی میرے سنگ اپنی زندگی گزارنے کی خواہش مند ہو۔ تو پھر یہ انکار کیوں؟ کیوں تم ہماری سیدھی سادی زندگی کو پرپیچ راستوں پر گھسیٹ رہی ہو؟"

وہ بہت بے چین سا پوچھ رہا تھا۔ ریحاب نے تمام ترہمت مجتمع کی اور اس کی طرف دیکھا۔

"عمر! مجھے آپ سے محبت ہو یا نہ ہو' وہ الگ کہانی ہے مگر... مگر مجھے آپ پر بھروسا نہیں۔" ریحاب کے اس ایک جملے نے ہی عمر کی ذات ہلا کر رکھ دی۔ عمر کے ہاتھوں میں دبا اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ریحاب نے اس سے آنکھیں نہیں چرائی تھیں' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی وہی کہانی سنا رہی تھیں جو ریحاب کی زبان نے سنائی۔ یہ جملے ادا کرتے اس کی زبان لمحے بھر کے لیے بھی نہ لڑکھڑائی۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ پایا۔

"تم نے مجھ میں ایسی کون سی خرابی دیکھ لی جو... جو تمہارا مجھ پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا۔" وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا... آپ میں تو جیسے کبھی کوئی خرابی تھی ہی نہیں۔" ریحاب کے طنز۔ اف...

"وہ میرا ماضی تھا اور میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔" اسے لگا' وہ اپنی صفائی دے رہا ہے یہ احساس ہوتے ہی وہ ایک دم چپ کر گیا۔

یہ وہ ریحاب نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ وہ حیران پریشان سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر عمر نے اسے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ ریحاب نے اس کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلتا گیا۔ کمرے کے دروازے کے پار آکر اس نے عمر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آج کے بعد میرے دل کے اور میرے کمرے کے دروازے آپ پر بند ہیں۔ انہیں کھولنے کی کوشش بھی کی تو آپ بہت نقصان اٹھائیں گے۔"

وہ ایک قدم کمرے کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ وہ اب تک شاک میں تھا۔ ریحاب کا ارادہ بھانپ کر اس نے بند ہوتے دروازے کو دھکا دیا۔ اگر آج اس نے دروازہ بند کر دیا تو... معاملہ اور خراب ہو جاتا۔ بگڑ جاتا... وہ خود انا میں آجاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے رشتے کو وہ انا کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ریحاب کو دروازہ بند کرتے دیکھ کر دروازے کو دھکا دیا تھا۔ ریحاب کی درد سے بھری چیخ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ دروازہ ریحاب کے سر سے بری طرح ٹکرایا تھا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر گئی' گرنے کی وجہ سے اس کا پاؤں مڑ گیا تھا۔ ماتھا ایک طرف سے پھٹ گیا تھا اور اب خون رس رہا تھا۔ عمر بھاگ کر اندر آیا۔

"پلیز یار۔ غصہ بعد میں کر لینا' جتنا لڑنا ہے لڑ بھی لینا پر ابھی اٹھو اور ڈاکٹر کے پاس چلو۔" اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ پاؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ پھٹے ہوئے ہونٹ اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا' مگر وہ ڈھیٹ بنی اپنا بازو چھڑا رہی تھی۔ عمر کو اس کی ڈھٹائی پر شدید غصہ آیا۔

"تم اگر اب نہیں اٹھو گی تو میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" اس نے دھمکی دی۔ ریحاب ڈر سی گئی۔ عمر نے اب اسے سہارا دیا تو وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بمشکل بیڈ تک آئی۔ عمر نے فرسٹ ایڈ باکس ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ باکس کھولتا۔ ریحاب نے غصے سے باکس چھینا اور خود ہی اپنے زخم صاف کرنے لگی۔

"ہو گئی میری ٹریٹمنٹ۔ اب آپ جائیے یہاں سے۔" لہجہ اور انداز دونوں روکھے تھے۔ عمر نے کچھ دیر اسے دیکھا۔

"انکل واپس آجائیں تو میں ان سے رخصتی کی بات کروں گا اور اگر تم نے ان کے ساتھ کوئی فضول بات کی تو پھر مجھ سے کوئی گلہ مت کرنا۔ تم میری بیوی ہو۔ میں تمہیں عزت سے رخصت کروا کر لے جانا چاہتا ہوں، لیکن تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو پھر میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔ اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں یہ بھی یاد رکھنا۔" ساری نرمیاں بالائے طاق رکھ کر وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی مگر انداز ایسا تھا کہ وہ گھبرا سی گئی۔

"اگر آپ نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان لے لوں گی، مگر آپ کا نام جوڑے رکھنے کی اذیت میں برداشت نہیں کروں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔ عمر کے اٹھتے قدم رک گئے تھے۔ وہ اس کی جانب پلٹا اور نہایت سرد انداز میں اسے دیکھا۔

"تو ٹھیک ہے، تم اپنا ارمان پورا کرلینا۔ میں تو وہی کروں گا جو میں نے کہا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ عزت کے ساتھ اس گھر سے ڈولی میں رخصت ہونا ہے یا پھر حرام موت گلے لگا کر باپ کی عزت داغ دار کرنی ہے، لیکن ایک بات ذہن میں بٹھالو۔ دونوں صورتوں میں میرا نام تمہارے نام کے ساتھ ہی رہے گا۔"

وہ مطمئن سا کہہ کر باہر نکل آیا۔ اور وہ اس کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی۔



وہ کسی کو بھی بتائے بغیر حیدر آباد آگئی تھی۔ شارق زمان نے اسے بلایا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اس کے بلانے پر انکار کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے اپنے اماں ابا تک کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی کیونکہ اسے ان سے ملنا نہیں تھا۔ اگر وہ شارق زمان کی بات ماننے سے انکار کردیتی تو وہ خود کراچی پہنچ جاتا۔

وہ شارق کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر انتظار کررہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ خوب سجا خوشبوؤں میں ڈوبا اس کے سامنے براجمان ہوگیا تھا۔ اس کا دل نفرت سے بھرنے لگا اس مصنوعی خوشبو میں ڈوبا وجود اندر سے کتنا غلیظ تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ شارق اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"کیسی ہو۔۔؟" وہ بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے کیوں بلایا ہے یہاں۔۔؟ اب تمہیں مجھ سے کیا کام پڑگیا۔۔؟" وہ غصہ دباتے ہوئے بولی۔

"تم سے تو مجھے مستقبل قریب میں بہت سے کام پڑنے والے ہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، لیکن وہ ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"میرے سامنے اکڑ امت کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں اکڑنے والوں کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔" اس کا لہجہ یک دم بدل گیا۔ منال کیسے بھول سکتی تھی۔ چپ ہو رہی۔

"کام کی بات کرو۔" کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہوئے کہا اور جوابا" اس نے جو طلب کیا اس سے منال کو زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔



انہیں عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بے چینی کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھے۔ یہاں اتنی دور وہ ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں آئے تھے اور اسی کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک دم ہی ان کا دل ہر کام سے اچاٹ ہوگیا۔ رگ و پے میں بے قراری دوڑ رہی تھی۔ انہوں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کئی روز سے ان کی رباب سے بات نہیں ہوپائی تھی۔ وہ انہیں بہت یاد آرہی تھی۔ تب ہی ان کا موبائل بج اٹھا۔ انہوں نے لپک کر فون اٹھایا۔ رات کے بارہ بجے اگر وہ فون کررہی تھی تو یقیناً" کوئی خاص وجہ ہوگی۔

فون سن کر وہ مزید پریشان ہوگئے تھے۔ کل کی میٹنگ کے بعد انہیں فورا" پاکستان کے لیے نکلنا تھا۔

* * *

وہ پہلے ہی بے تحاشا پریشان تھی۔ اس پر عمر کے فون نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ وہ اسی وقت حیدر آباد سے نکلی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ملازمہ سے ریحاب کا پوچھا۔

"جی وہ تو دو دن سے اپنے کمرے میں بند ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں' نہ پیتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں۔ نجانے کیا ہوگیا ہے۔" وہ پریشانی سے بتا رہی تھی۔ منال فوراً اس کے کمرے میں آئی۔

"ریحاب۔" اس نے آواز دیتے ساتھ ہی لائٹس آن کیں۔ ریحاب بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی اس کی آواز پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ منال گھبرا کر قریب آئی۔ وہ شدید بخار کی کیفیت میں تھی۔ اس کا چہرہ تھپتھپانے لگی۔ اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں اور منال کو اپنے قریب دیکھ کر اس نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں۔

"ریحاب! اٹھنے کی کوشش کرو' میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔" وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی' اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"منال۔ میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔" اس نے تمام ہمتیں مجتمع کرکے چیخ کر کہا تھا۔ منال کا رنگ فق ہوگیا۔

"کیا ہوا ریحاب! تم ایسا بی ہیو کیوں کررہی ہو؟ فی الحال سب چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔" منال حد درجہ پریشان تھی۔ آخر کار اس نے عمر کو فون کرکے بلایا۔ عمر سیدھا ریحاب کے کمرے میں چلا آیا۔

"اٹھو۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں کیا کروں گا؟" منال باہر کھڑی بن رہی تھی۔

"مجھے نہیں جانا۔ تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" وہ غصے سے بولی۔

"نہیں چھوڑ سکتے ہم تمہیں ایسے۔" وہ بھی سخت لہجے میں بولا۔

"نہیں جاؤں گی میں۔ نہ جینے دیتے ہو نہ مرنے دیتے ہو۔ آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیوں مجھے پاگل کرنے پر تلے ہو تم سب کے سب۔" وہ وحشت سے چلا رہی تھی۔ اس نے عمر کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ عمر کتنی ہی دیر ساکت سا اس کی اس ابتر حالت کو دیکھتا رہا اور پھر چپ چاپ اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھادیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ منال بھی آکر بیٹھ گئی تو اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

"اگر وہاں اسپتال میں بھی تم نے یہ سب کیا تو میں سب کے سامنے وہ کروں گا جو تم برداشت نہیں کرپاؤ گی۔ بہتر ہے چپ چاپ اپنا علاج کرواؤ۔" اسپتال پہنچ کر عمر نے اسے وارننگ دی۔

"میں چاہتا ہوں کہ انہیں ایسی دوا دی جائے جس سے یہ سو سکیں۔ پریشانی کے باعث یہ دو راتوں سے جاگ رہی ہیں۔" عمر ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ریحاب غنودگی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری دوست ؟؟؟ میں اتنا چاہتی ہوں وہ..." منال کا سانس رک گیا۔

"میرے پاپا..." وہ سسکی۔ منال کے ہاتھ سے ریحاب کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

"تم سب بہت برے ہو۔ میں مرجانا چاہتی ہوں... مجھے نفرت ہے تم سب سے۔ اپنے آپ سے بھی... ہر چیز سے۔" منال کو لگا ساتوں آسمان اس پر گر گئے ہوں... وہ بے جان سی ہوگئی۔

ریحاب کے ٹوٹے پھوٹے جملوں نے اسے کیا کچھ نہیں سمجھا دیا تھا۔ اتنی نفرت' اتنی بے اعتباری؟ وہ بے اختیار ریحاب کو دیکھے گئی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ انکل کو سب بتادوں۔ تاکہ وہ جلد سے جلد آئیں۔ ریحاب کی ذہنی حالت بہت بری ہورہی ہے۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"میں نے انہیں فون کیا تھا۔ ریحاب کے متعلق کچھ نہیں بتایا' بس پوچھا تھا کہ وہ کب آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ آج شام کی فلائٹ سے پہنچ جائیں گے۔" منال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ عمر اسے

روداد یکھ کر لب بھینچ گیا۔
"نجانے کیا غم ہے اسے۔ کیا ہو گیا ہے ریحاب کو؟" عمر نے بے بسی سے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ ایک ریحاب کی حالت اس پر بے خبری۔ اصل وجہ معلوم ہوتی تو ہی وہ کوئی سدباب کرتا۔ وہ چپ چاپ ریحاب کو دیکھے گیا۔ جبکہ منال سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی اسے حقیقت کا علم ہو گیا ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟ لیکن اس میں شکیل صاحب کا کیا قصور؟ قصوروار تو میں ہوں۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ریحاب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں بس یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے یہاں سے دور جانا ہے۔ سب سے دور۔" وہ اپنے آنسو روکتے ہوئے بولی۔ منال نے بے بسی سے شکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ عمر بھی بیٹھا ہوا تھا۔
"تم ہمیں وجہ بتا دو۔ اس کے بعد تم جو کہو گی، ہم وہی کریں گے۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ ریحاب کے ہونٹوں پر قفل لگ گئے۔ وہ عمر کے سامنے کیسے یہ سب کہتی اور ہمیشہ کی طرح شکیل صاحب بنا کہے سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے عمر کو اشارہ کیا، وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔
"بیٹا۔" وہ اس کے قریب آ کر بیٹھے اور کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ریحاب نے یک دم ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا تھا۔
"مجھے بیٹا مت کہیے۔ میں کچھ نہیں لگتی آپ کی۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ منال کا دل سکڑ کر پھیلا۔
"کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟" وہ بے حد نرمی سے پوچھ رہے تھے۔ ریحاب چیخ گئی۔
"منال کے ساتھ آپ کا تعلق؟" شکیل صاحب کو لگا کسی نے گرم سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ منال کا شک صحیح تھا۔
"نفرت ہے مجھے آپ سے، منال سے، سب سے۔" وہ رو رہی تھی چیخ رہی تھی۔ شکیل صاحب گم صم بیٹھے تھے۔ عمر اسے قابو کرنے کی کوشش میں تھا۔
"عمر چھوڑ دو اسے۔ یہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ٹھیک ہے۔ پندرہ دن بعد ریحاب کی تمہارے ساتھ رخصتی ہے۔ تم بارات لے کر آؤ یا اکیلے، تمہاری مرضی۔" شکیل صاحب کی بات سن کر ریحاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے وقت ان کی چال بے حد شکستہ تھی۔ عمران کے پیچھے لپکا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ اور جا کر تیاریاں کرو۔ جس دن تمہاری رخصتی ہو گی اس دن میں منال سے نکاح کروں گا۔" ایک اور دھماکا۔ منال کو لگا وہ زمین میں گڑ گئی ہے۔ عمر بھی نگاہیں چرا گیا۔

☼ ☼ ☼

ریحاب البم کھول کر بیٹھی تھی اور بڑی محویت سے ایک ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ یہ ساری تصویریں اسکول اور کالج کے خوش گوار دنوں سے وابستہ تھیں۔ اس میں الجھ کر کتنا وقت گزر گیا اسے احساس تک نہ ہوا۔
کافی دیر بعد اس نے ساری تصویریں سمیٹ کر الماری میں رکھیں پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھایا اور اپنی دوست منال کا نمبر ملایا۔
"السلام علیکم!" اس نے بے حد خوش گوار لہجے میں اسے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہو ریحاب؟" منال نے لہجہ ہشاش بشاش بناتے ہوئے کہا، لیکن تھکن پھر بھی ظاہر ہو گئی۔
"میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہیں کیا ہوا، خیریت تو ہے؟" اس نے فوراً" ہی اس کے لہجے کی تھکن محسوس کر لی۔
"ارے مجھے کیا ہو گا، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں میں بھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تو پھر اتنی مری ہوئی آواز میں کیوں بات کر رہی

ہو۔ انکل کی طبیعت کیسی ہے؟" رےحاب نے استفسار کیا۔

"دراصل میں پچھلے دنوں ابو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں اسپتال داخل کروانا پڑا۔ امی خود بیمار رہتی ہیں۔ ابو کی تیمارداری نہیں کر سکتیں تو ابو کے ساتھ اسپتال میں مجھے رہنا پڑا۔" اس نے سرسری لہجہ اپنا کر بات کی۔

"اب کیسے ہیں وہ؟"

"اب تو کافی بہتر ہیں۔" اس نے گہری سانس خارج کر کے کہا۔

"اور تمہاری جاب۔۔؟" اس کے اگلے سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔

"جاب بھی بس ٹھیک ہی چل رہی ہے۔"

"سچ بتاؤ منال۔" رےحاب کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"چھٹیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے جاب سے نکال دیا گیا۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اوہ۔" وہ چپ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

شکیل صاحب گھر پہنچے تو رےحاب کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

"رےحاب بیٹا۔" انہوں نے اسے پکارا تو وہ ہڑبڑا گئی۔ وہ اپنے خیالات میں الجھی ان کے قدموں کی چاپ تک فراموش کر چکی تھی۔

"السلام علیکم! پاپا۔ آپ کب آئے؟" وہ اپنی شرمندگی چھپاتی ان کے ہاتھ سے بریف کیس تھامتے ہوئے بولی۔

"خیریت۔۔ تم کچھ پریشان ہو؟" وہ تشویش سے لہجے میں بولے تو وہ ہنس پڑی۔

"پاپا! آج بہت دن بعد میں نے منال کو فون کیا تو مجھے اپنی بے خبری پر شدید غصہ آیا۔" اور پھر اس نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔

"وہ بے حد پریشان ہے' کیونکہ اس کی نوکری ختم ہو گئی ہے آپ اس کے لیے جلدی سے جاب ڈھونڈ دیں نا' تاکہ وہ کچھ تو پرسکون ہو سکے۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"تم پہلے بھی اسے کئی بار یہاں بلا چکی ہو' لیکن وہ نہیں مانی۔ پچھلی بار بھی میں نے اپنے ہی آفس میں اسے سیٹ کرنے کا سوچا تھا' لیکن وہ تیار نہیں ہوئی آنے پر۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔ رےحاب کو سب یاد تھا' لیکن وہ اس رویے کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

"پاپا آپ بس جاب کا بندوبست کیجیے میں اسے منالوں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی۔ کیونکہ اپنے والد کی بیماری اور پھر اس کی نوکری کے ختم ہونے کے بعد وہ بہت سے مسائل کا شکار ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بیٹا کوشش کرتے ہیں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پاپا! میں منال سے ملنے کے لیے حیدر آباد جانا چاہتی ہوں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دن منتخب کر لو میں تمہیں لے چلوں گا۔ فی الحال مجھے اچھی سی چائے پلاؤ' آج ہم دونوں باہر ڈنر کریں گے۔" وہ خوش گوار انداز میں بولے۔ وہ مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"عمر! تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کیوں مجھے پٹوانا چاہتے ہو؟" آصف اس کی فرمائش سن کر گھبرا گیا تھا۔

"میرے ہوتے ہوئے تجھے کوئی اور کیوں پیٹے۔ اس نیک کام کے لیے میں کافی ہوں۔" اس نے اپنے خطرناک تیور دکھائے۔ آصف کا منہ بن گیا۔

"یار! دیکھ اگر تو یہ سب کرے گا اور تیرے پاپا کو پتا چل گیا تو۔۔؟"

"تو کچھ نہیں ہو گا۔ بحث مت کر اور یونیفارم دے مجھے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ آصف عمر کا دوست تھا۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل آصف کے ابا جان کا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار وزٹ کر لیتا (صرف کچن کا) پر آج عمر نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ اسے اگر علم ہوتا کہ وہ اس سے ایسی فرمائش کرے گا تو وہ آج تو ہرگز نہ

آتا‘ لیکن نہ صرف وہ آچکا تھا بلکہ پھنس بھی چکا تھا۔ عمر کے ہاتھوں۔ عمر کی بات نہ ماننے کا مطلب تھا اس کی ناراضی۔

عمر ویٹرز کا مخصوص لباس پہنے پورے ہال میں گھوم رہا تھا۔ دو آرڈرز وہ لے چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ریحاب اپنے پاپا کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مہینوں کے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ ریحاب کو دیکھ کر اسے اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی۔ اس کا جی چاہا وہ جائے اور اس کا حال احوال پوچھے‘ مگر ظاہر ہے وہ اس روپ میں اس کے سامنے جاتا تو وہ حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہو جاتی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے شکیل صاحب کو موبائل کان سے لگائے باہر نکلتے دیکھا تو وہ اس کے پاس چلا آیا۔

”کیسی ہو....؟“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

”آپ یہاں.... اس حال میں....؟“ وہ شدید حیرت زدہ تھی۔ اس سے پہلے کہ عمر اسے کوئی جواب دیتا‘ اس نے اپنے پاپا کو اپنے دوستوں کے ہمراہ اندر آتے دیکھا۔

”میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں‘ پہلے آرڈر لے لوں۔“ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ محض سرہلا کر رہ گئی۔

عمر اس سے ذرا دور ایسی ٹیبل پر آرڈر لینے لگا جہاں سے اس کے پاپا اور ان کے دوست اسے آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ عمر ٹیبل کے پاس کھڑا کچھ کہہ رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر حامد صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”او کے میم....“ وہ آرڈر لے چکا تھا۔ ابھی وہ اسی شاک سے باہر نہ نکلے تھے کہ لڑکی کے قریب سے گزرتے عمر نے جان بوجھ کر پانی کا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا وہ لڑکی چیخ کر اٹھی تھی۔

وہ ”سوری میم.... سوری میم“ کر رہا تھا اور وہ نازک اندام سی لڑکی اسے ذلیل کر رہی تھی۔ حامد صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے اور کیوں ہوا ہے؟ عمر سر جھکائے سب سن رہا تھا۔ حامد صاحب کے برابر میں بیٹھے ان کے دوست سوالیہ نگاہوں سے حامد صاحب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

جبکہ عمر کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی کسی طور چپ نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ہنگامہ مچانے پر مینیجر دوڑتا ہوا آیا تھا۔ عمر کی حیثیت سے واقف تھا۔ وہ اپنی جگہ پریشان کہ کرے تو آخر کیا کرے‘ جب ہی وہ خود اس کی ٹیبل پر آگئے تھے۔

ریحاب سے جب یہ برداشت نہ ہوا تو وہ بھی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”اسٹاپ دس نان سینس۔ تم جانتی بھی ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو؟“ وہ لڑکی کے سر پر جا کر دھاڑے تھے۔

”یہ خاتون ایک ویٹر سے بات کر رہی ہیں اور ویٹرز کے ساتھ اسی طرح بات کی جاتی ہے۔“ عمر کا سرد انداز میں ادا کیا گیا جملہ انہیں سب سمجھا گیا تھا۔ وہ اچنبھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ ان کا بیٹا تھا۔

”ویٹرز کی کوئی عزت نہیں ہوتی کیونکہ وہ آپ جیسے لوگوں کی چاکری کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ نچلے درجے کے کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی گزارنے والوں کی کیا عزت.... ہے نا سر....؟“ وہ لڑکی اب چپ ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ حامد صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

کچھ روز پہلے اسی ہوٹل میں عمران کے ساتھ تھا۔ اور ویٹر سے پانی کا گلاس ان کے کپڑوں پر گر گیا تھا۔ وہ لڑکا ”سوری“ تک نہ کہہ سکا تھا کیونکہ حامد صاحب نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا تھا۔ عمر کے غصہ کرنے اور جھگڑا کرنے پر انہوں نے وہ الفاظ ادا کیے تھے۔ جو عمر نے اب ان کے سامنے دہرائے تھے۔

”شکر کیجیے کہ انہوں نے مجھے اس غلطی پر تھپڑ نہیں مارا۔“ وہ سخت غصے سے کہتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ انہیں کیا سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ باپ تھے۔ عمران کی جان تھا۔ جب وہ لڑکی ان کے بیٹے کو الٹا سیدھا بول رہی تھی‘ اس وقت غصے سے انہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا

گلا ہی دبا دیں گے۔ انہیں اس کم عمر سے لڑکے کی سرخ آنکھیں اور جھکا چہرہ یاد آیا۔ اگر وہ ایک بیرا نہ ہوتا اور کسی امیر آدمی کا بیٹا ہوتا اور اس کے ہاتھوں ان کے کپڑے گندے ہو جاتے تو کیا وہ یہی رویہ رکھتے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی کسی اور کی عزت نفس کا احساس دلانے کے لیے وہ اپنے آپ کو بے عزت کروا رہا تھا۔ اتنا بڑا دل تھا عمر کا۔۔۔؟ وہ کچھ بول ہی نہ پائے۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔ سردیاں شروع ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ رش بڑھتا وہ خریداری کر لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے تحت وہ بازار آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ منال سے ملنے جائے گی تو ان سب گھر والوں کے لیے بھی گفٹ لے جائے گی۔ اس لیے وہ دل کھول کر خرچ کر رہی تھی۔ جب ایک جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ بلاشبہ عمر ہی تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑا دو خواتین کو ڈیل کر رہا تھا وہ اس سے چھ قدم کے فاصلے پر تھی۔ عمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ عمر مسکرایا۔

"پلیز میم۔ آئیے۔" وہ دونوں خواتین کو فارغ کر چکا تھا اور اب اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔

وہ حیران پریشان سی کاؤنٹر کے قریب آگئی۔

"آپ یہاں بھی۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

عمر نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"کیوں کیا میں یہاں نہیں ہو سکتا؟" وہ بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ میرا مطلب تھا کہ آپ اس دن۔۔۔ ہوٹل میں۔۔۔ اور اب یہاں۔۔۔ آپ کو جاب سے نکال دیا گیا؟" وہ حیرت زدہ سی پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔" اس نے بھی اپنے لہجے میں اداسی بھری۔

"لیکن آپ یہ معمولی معمولی سی نوکریاں کر کیوں رہے ہیں؟ آپ کے والد کا تو اپنا کاروبار ہے؟" ریحاب نے ذہن میں آئے سوال کو زبان دی۔

"تھا۔ لیکن اب نہیں ہے۔۔۔ بزنس میں شدید نقصان نے ہمیں سڑک پر لا کھڑا کیا۔" عمر نے لہجے میں رقت پیدا کی۔

"اور آپ کی تعلیم؟" وہ یونیورسٹی میں بہت قابل اسٹوڈنٹ ہوا کرتا تھا اس سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"اگر وہ کام آتی تو کیا میں آپ کو یہاں دکھائی دیتا۔۔۔ ہر کوئی تجربہ مانگتا ہے اور سفارش بھی۔ جو کہ میرے پاس نہیں۔ یہاں صرف اس کی اہمیت اور قدر ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔" اس کا لہجہ آخر میں تلخ ہو گیا تھا۔ عمر ریحاب کا یونیورسٹی فیلو اور ایک سال سینئر تھا۔ عمر کی ذہانت کے چرچے پوری یونیورسٹی میں تھے۔ لڑکیاں اس کی خوب صورت شخصیت پر مرتی تھیں۔ ذہانت پر جان دیتی تھیں۔ وہ بھی اسے کئی بار ان "تتلیوں" کے جھرمٹ میں دکھائی دیا تھا۔

وقت اور حالات انسان کو کس قدر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ وہ بھی بل بنا رہا تھا۔

"عمر!" اس نے بے حد سوچ کر اسے پکارا۔ ریحاب نے شاید پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ عمر کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس نے ایک چٹ پر اپنا نمبر لکھا اور اسے تھمایا۔

"آپ کو۔۔۔ اگر۔۔۔ ضرورت پڑے تو مجھے اس نمبر پر فون کر دیجئے گا۔" وہ جھجک کر بولی۔ کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اپنی سی وی اسے دے دے، لیکن یہ بات سن کر عمر کو برا بھی لگ سکتا تھا۔ عمر نے پرچی لے لی۔

"شکریہ۔" وہ مسکرا کر بولا۔ ریحاب بے وقت مسکرائی۔ اس کا دل بے حد بوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھوں میں اُمڈتی نمی کو صاف کیا۔ عمر بغور اسے دیکھ رہا تھا اور پھر نگاہ موڑ لی۔

عمر نے اسے ملول دیکھا تو اس کا جی چاہا وہ اسے سب سچ بتا دے۔ اس کے چہرے کی اداسی ختم کر دے، مگر وہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

ریحاب کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ

ہاتھ میں پکڑے فون نمبر کو دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار ایک نرم سی مسکان نے اس کے ہونٹوں کو چھوا۔ اس نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور پرچی اپنے والٹ میں رکھ لی۔ وہ مستقل اسی کے بارے میں سوچ جا رہا تھا۔ ایک محبت کی ابتدا ہو رہی تھی۔ چپکے چپکے۔



رات اس نے بہت کچھ سوچتے اور منال سے ملنے کی خوشی محسوس کرتے گزاری تھی۔ صبح جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تو شکیل صاحب کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کی شرٹ اور گرے پینٹ پہنے وہ عام دنوں سے کہیں زیادہ ہینڈسم لگ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

"پاپا! کبھی کبھار میں سوچتی ہوں کہ دادی اماں نے آپ کی شادی کم عمری میں کروا کر کافی نیک کام کیا تھا اور عقل مندانہ بھی۔" وہ شرارت سے بول رہی تھی۔ وہ پلٹے۔

"عقل مندانہ وہ کیسے بھلا۔؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولے۔

"وہ ایسے کہ اگر آپ کسی کو یہ کہیں کہ آپ سنگل ہیں تو وہ بلا تردد مان لے گا اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ لڑکی ریحاب میری بیٹی نہیں میری بہن ہے تو بھی آپ کی اس بات پر ہر کوئی یقین کرلے گا۔" وہ بہت شریر لہجے میں بولی۔ انہیں ہنسی آگئی۔ ان کی عمر واقعی کم تھی۔ نوجوانی میں ہی ان کی شادی کروادی گئی تھی اور ریحاب کی پیدائش شادی کے ایک سال بعد ہی ہو گئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا' یہ باپ بیٹی ہیں۔

"اچھا۔ مکھن بعد میں لگانا۔ پہلے ناشتا کرلو۔ پھر نکلنا بھی ہے۔" وہ کلائی میں گھڑی باندھتے ہوئے بولے تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے منال کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے ملنے آرہی ہے۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ ناشتا کرتے ہی وہ حیدر آباد کے لیے نکل گئے' وہاں پہنچ کر اس نے تیزی سے اتر کر دروازہ بجایا۔

دروازہ منال نے کھولا تھا۔ ریحاب کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران تھی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ اس کی غیر متوقع آمد پر وہ منہ کھولے کھڑی تھی۔ ریحاب اس کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"منہ کھول کر کھڑی رہو گی کہ مجھ سے ملو گی بھی؟"

وہ بے حد خوشگوار انداز میں بولی تھی۔ منال اس سے لپٹ گئی۔ دونوں ہی آبدیدہ تھیں۔ منال کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کتنا روئیں گی آپ۔؟" جانی پہچانی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا' وہ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ ان پر نگاہیں جمائے کھڑی رہے۔ لیکن دل کو ڈانٹ کر وہ ریحاب سے دور ہوئی اور نگاہیں جھکالیں۔

"السلام علیکم!" اس نے شرمندہ سے لہجے میں سلام کیا اور سائیڈ پر ہو گئی۔ وہ جواب دیتے اندر داخل ہوئے۔ تین کمروں اور مناسب صحن پر مشتمل چھوٹا سا گھر بے حد صاف ستھرا تھا۔

"آئیں۔ بیٹھیں۔" اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر گھس کر لائٹ آن کی پنکھا چلایا تاکہ بند کمرے میں تازگی ہو۔ انہیں بٹھا کر وہ کچھ دیر کے لیے غائب ہوئی۔ آئی تو گلاسوں میں جوس تھا۔ انہیں گلاس تھما کر وہ سامنے بیٹھ گئی۔

"آنٹی انکل کی طبیعت کیسی ہے؟" ریحاب نے بات کا آغاز کیا۔

"امی کے گھٹنوں میں درد تھا' وہ اسپتال گئی ہیں جبکہ ابو کچھ دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ کافی بہتر طبیعت ہے۔ تم سناؤ کیسی ہو؟" اس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا تھا۔ ریحاب نے اس کی پریشانی محسوس کی تھی۔ شکیل صاحب کو بھی وہ بے چین سی لگی۔ اس کے مالی حالات جس طرح کے تھے اسے پریشان تو ہونا ہی تھا۔ مگر کچھ اور بھی تھا۔ منال بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ شکیل صاحب کے سامنے کھل کر کچھ بھی نہیں پوچھ سکتی تھی۔ اسی لیے اسے یونیورسٹی کے قصے سنانے لگی۔ اس کا آخری سمسٹر بھی مکمل ہو گیا تھا۔ وہ اب نیچے

کے انتظار میں تھی۔ منال اس کی باتیں سنتی رہی پر توجہ شکیل صاحب پر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے دھیان میں تھے۔



وہ جب سے ریحاب سے ملا تھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے والٹ میں سے وہ پرچی نکالی اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ایک خوبصورت سا منظر اس کی نگاہوں میں آیا تھا۔ ریحاب اس کی جونیئر تھی۔ عمر نے نئے آنے والوں کی بہت ریگنگ کی تھی۔ اسٹوڈنٹس کسی بھی ڈپارٹمنٹ کے ہوتے اس کی شرارتوں سے نہیں بچ پاتے تھے۔ جب ریحاب نے یونیورسٹی جوائن کی‘ پہلے ہی دن اس کا ٹاکرا عمر سے ہوا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر عمر نے اس سے کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ عمر کو خود اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ شاید ریحاب کی بے تحاشا معصومیت نے اسے کسی بھی شرارت سے روکے رکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی دلکشی اور طلسم تھا۔ جس نے عمر کو متوجہ کیا تھا۔ عمر سے اس نے ڈیپارٹمنٹ کا پتا دریافت کیا تھا۔ اور عمر اسے پتا سمجھانے کے بجائے اسے خود ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ آیا تھا۔ اس کی یہ حرکت اس کے دوستوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے دوست یہی سمجھے کہ یقیناً" وہ دونوں پہلے سے ہی ایک دوسرے سے واقف ہیں اس لیے عمر نے اسے تنگ نہیں کیا۔ عمر نے اس الزام کی سخت لہجے میں نفی کی تھی۔

”ریحاب مجھے پہلی نگاہ میں معصوم اور سادہ لگی ہے اس لیے میں نے اسے تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ یہ بیان عمر کا تھا اور سچائی پر ہی مبنی تھا۔ مگر نیا آنے والا ہر طالب علم شروع کے دنوں میں اسی قدر معصوم اور سادہ دکھائی دیتا ہے جتنی کہ ریحاب تو پھر ان ”معصوموں“ کی ریگنگ کیوں؟“ اعتبار نے اسے گھورتے ہوئے کافی اچھا پوائنٹ اٹھایا تھا‘ وہ عمر کی دوست تھی اور عمر کوئی جواب نہیں دے پایا۔

ان گزرے سالوں میں اسے معلوم تھا کہ ریحاب کے فادر کو تو وہ بہت اچھی طرح جانتا ہے کاروباری حلقے میں وہ کافی مشہور تھے۔ کئی پارٹیز میں ان کی ملاقات ہوئی تھی لیکن ریحاب کو اس نے کبھی ان کے ہمراہ کسی پارٹی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جان نہیں پایا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا تو حیرت ہوئی۔ وہ اب تک یہ سمجھتا آیا تھا کہ ریحاب کی سادگی اور شرافت مڈل کلاس کے مذہبی گھرانے کی دین ہوگی حقیقت معلوم ہونے پر اسے اپنی سوچ پر افسوس ہوا۔ اسے اول روز سے وہ اچھی لگی تھی۔ اس نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے گریزاں تھی۔ بلکہ ہر اس لڑکے سے جس کے ایک افیر کا بھی اسے علم ہوتا اس سے دور بھاگتی۔ اس کی اس درجہ احتیاط پسندی پر وہ کئی بار ہنسا تھا لیکن اس نے ریحاب کو کبھی تنگ بھی نہیں کیا۔

اس کی پڑھائی مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اس کا سامنا ریحاب سے مہینوں بعد ہوتا تھا‘ وہ بھی کسی شادی کے فنکشن میں۔ ہیلو ہائے کے بعد وہ یوں بیٹھ جاتی جیسے گونگی ہو۔ اور اب چھ ماہ بعد وہ اسے وہاں دکھائی دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی انسلٹ کے وقت اٹھ کر باہر جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا حساس دل بھر آیا ہوگا اور وہ کھانا بھی نہ کھا سکی ہوگی۔

اور پھر وہ اسے شاپنگ مال میں دکھائی دی۔ وہ اسے کاؤنٹر پر کام کرتے دیکھ کر دکھی اور پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے بنا سوچے سمجھے جھوٹ بولا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اس کی توجہ کے حصول کے لیے کیونکہ پچھلے کئی دن سے ریحاب اس کے ذہن پر سوار تھی اور بار بار اسے یاد آ رہی تھی۔

وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اس کا ملازم کہیں گیا تھا تو اپنے دوست کے ساتھ وہ بھی تفریحاً" کسٹمر کو بھگتانے لگا۔ عمر کو کیا علم تھا کہ محض تفریح کے لیے جانے والے کام میں اسے ریحاب کا نمبر مل جائے گا۔ بغیر کسی کوشش کے۔

وہ کل سے اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اسے فون کرے نہ کرے۔ دل اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس نے تھک ہار کر دل کی بات مان لی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے ریحاب کا نمبر ڈائل کیا جو کہ اس نے "پری" کے نام سے محفوظ کیا تھا۔ بیل جانے لگی۔ آخری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو۔" نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز نے اس کے کانوں کو چھوا۔

"ہیلو۔" دوسری بار آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ وہ چپ رہا۔

"کس کا فون ہے۔؟" ایک اور نسوانی نیند سے بھری دھیمی آواز بھی ابھری تھی۔

"پتا نہیں۔" ریحاب نے شدید بے زار لہجے میں کہہ کر فون کاٹ دیا۔ ریحاب کی بے خبری پر وہ افسردہ سا ہوا اور بیڈ پر گر گیا۔



ریحاب' منال کے گھر میں کچھ دن کے لیے رک گئی تھی' شکیل صاحب کراچی واپس چلے گئے۔

ریحاب اور منال اسکول کے زمانے سے دوست تھیں۔ ریحاب شہر کے مہنگے ترین اسکول میں پڑھتی تھی۔ حامد صاحب وہاں کینٹین چلاتے تھے اور اسی وجہ سے منال کو وہاں داخلہ دے دیا گیا تھا۔ پرنسپل اچھے انسان تھے انہوں نے منال کی ذہانت سے متاثر ہو کر فیس معاف رکھی تھی۔ ورنہ ایک معمولی انسان کی بیٹی کا وہاں پڑھنا ناممکنات میں سے تھا۔ منال اور ریحاب کی عمروں میں تین سال کا فرق تھا۔ منال اس سے تین سال بڑی تھی۔ مگر دونوں کلاس فیلوز تھیں۔ ہم مزاج تھیں سو دونوں کی جلد ہی دوستی ہو گئی۔ میٹرک کے بعد دونوں نے ایک گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ حامد صاحب نے اسکول کی کینٹین ختم کر دی' وہ اب اپنا کاروبار کرنا چاہتے تھے۔

حامد صاحب نے کاروبار شروع تو کر دیا تھا لیکن پھر بھی پیسہ کم پڑ گیا تھا تو انہیں اپنا گھر فروخت کرنا پڑا۔

حیدر آباد میں چھوٹا سا ہی سہی پر ان کا آبائی گھر تھا۔ منال گھر فروخت ہو جانے پر کتنے دن افسردہ رہی تھی۔ حامد صاحب نے اپنی بیٹی کو یقین دلایا تھا کہ وہ جلد ہی اپنا گھر پھر سے خرید لیں گے مگر حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ سب حق دق رہ گئے۔ جس کے ساتھ مل کر انہوں نے کاروبار کی بنیاد رکھی' وہ شخص سب کچھ سمیٹ کر فرار ہو گیا۔ حامد صاحب کا دل یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس حادثے کے بعد وہ بیمار رہنے لگے۔ ان حالات میں منال اپنا کالج بھی جاری نہ رکھ سکی۔ ریحاب کے لاکھ روکنے پر بھی وہ کراچی میں نہیں رکی تھی۔ اور اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد میں شفٹ ہو گئی۔ حامد صاحب نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اب مزدوری کر کے پھر سے گھر کا خرچ چلانے لگے۔

ریحاب بے حد اداس تھی۔ وہ پرنسپل کو اس تمام واقعے کے بارے میں بتا چکی تھی اور گزارش کی تھی کہ حاضری نہ ہونے کی صورت میں منال کا ایڈمٹ کارڈ نہ روکا جائے۔

امتحانات میں جب ایک مہینہ رہ گیا تو ریحاب خود اسے لے کر کراچی آ گئی تاکہ وہ مکمل توجہ کے ساتھ امتحانات دے سکے۔

لیکن منال کی توجہ بھٹک گئی تھی۔ اسے بالکل اچانک ہی شکیل صاحب اچھے لگنے لگے تھے اتنے کہ وہ خود سے گھبرا گئی تھی۔ ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ پہلے بھی وہ ان سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی لیکن اب تو ان کی موجودگی میں وہ کمرے سے ہی نہ نکلتی۔

وہ اپنے آپ سے سخت شرمندہ تھی۔ خود کو لعنت ملامت کرتی۔ وہ اس کی دوست کے والد تھے اس لحاظ سے وہ اس کے انکل ہوئے۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر پشیمانی اور شرمندگی میں گھرتی جاتی۔ پر دل پر کب کس کا زور چلا ہے۔ البتہ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ کراچی نہیں آئے گی۔

امتحانات کے بعد اس نے ایک دن بھی وہاں رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ریحاب اس کی جلد بازی پر

ناراض ہو چکی تھی لیکن وہ کیا کرتی۔ مجبور ہو چکی تھی وہ۔ بعد میں اس ریحاب کو منالیا تھا۔ اگلے سال پھر اسے آنا پڑا اس بار اس نے امتحان سے بس ایک دن پہلے ہی اس شہر کا چہرہ دیکھا جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ دل بھی۔ حامد صاحب بیماری کے باوجود مزدوری پر جاتے تھے۔ اس نے پرائیویٹ بی اے میں داخلہ لے لیا اور ایک اسکول میں نوکری کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی پڑھانے لگی۔ جبکہ ریحاب یونیورسٹی میں پڑھنے لگی۔



ریحاب کو اس نے اپنے حالات کا نہیں بتایا تھا' پھر بھی وہ سب جان گئی تھی۔ اس نے شکیل صاحب سے کہہ کر اپنے آفس میں اس کے لیے جگہ بنائی لیکن بھلا وہ یہ نوکری کیسے کر سکتی تھی' وہ ان سے دور رہنا چاہتی تھی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی کہ وہ ان سے دور رہ کر انہیں بھول جائے گی۔ دل کی زمین پر جو محبت کی کونپل پھوٹی ہے۔ وہ سیراب نہ ہونے کی صورت میں پھلے پھولے گی نہیں۔

عمر نے دوبارہ ریحاب کو فون کیا تو اس نے فوراً" اس کی جاب کا پوچھا اس نے انکار کیا تو ریحاب نے ہمت کر کے عمر سے کہا کہ وہ اپنی سی۔ وی لے کر اس کے پاپا کے آفس آجائے۔ عمر نے فوراً" وہاں پہنچنے کی ہامی بھرلی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حقیقت جاننے کے بعد ریحاب کا کیا رد عمل ہو گا لیکن وہ اس مذاق کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس لڑکی کا دل کس قدر نازک ہے۔

جب عمر آفس پہنچا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جبکہ شکیل صاحب نے بہت حیرت میں گھر کر عمر سے مصافحہ کیا تھا۔

"برخوردار! یہ کیا چل رہا ہے۔ میں کیا سن رہا ہوں۔ عمر ذوالقرنین کے پاس نوکری نہیں۔" ان کی بات پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

"سر! میرے پاس کب نوکری ہے بھلا۔؟ میں تو اپنے پاپا کی "دکان" چلاتا ہوں۔" وہ شرارت سے بولا تو وہ ہنس پڑے۔ ریحاب ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اصل بات کیا ہے؟ بتانا پسند کرو گے؟" دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور پھر عمر نے ساری تفصیل انہیں بتادی۔ حقیقت جان کر ریحاب کا تو غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے عمر کا سر پھاڑ دے۔ وہ تیزی سے ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔ وہ پیچھے سے پکارتے رہ گئے۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایسے ری ایکٹ کریں گی۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"میری ریحاب بہت معصوم ہے۔ اس نے بنا سوچے تمہاری کہانی پر یقین کر لیا تھا حالانکہ اگر وہ ذرا توجہ دیتی تو تمہارا جھوٹ پکڑ لیتی لیکن اسے تمہاری کہانی نے افسردہ کر کے رکھ دیا تھا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہے تھے۔ عمر بھی ہنس پڑا۔

اس کے بعد اس نے ریحاب کو بیسیوں فون کیے تھے مگر اس نے ایک بھی فون نہیں اٹھایا۔ اس نے پھولوں کا گلدستہ اور سوری کا کارڈ ٹی۔ سی۔ ایس کیا۔

"بیٹا! اس کا وہ مذاق اتنا بھی برا نہیں تھا کہ تم اسے معاف نہ کر سکو۔" پاپا کے اتنا کہنے پر ہی اس نے عمر کو فوراً" میسج کر دیا کہ وہ ناراض نہیں۔



اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ہی عمر کے والدین اس کے گھر اس کا رشتہ مانگنے کو موجود تھے اور ضوفشاں بیگم نے جب شکیل صاحب کو دیکھا تو وہ شاکڈ رہ گئیں۔ ضوفشاں عمر کی سوتیلی ماں کسی زمانے میں وہ شکیل صاحب کے آفس میں جاب کرتی تھیں۔ لاکھ ڈورے ڈالے مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آئے۔ وہ دل سے انہیں پسند کرتی تھیں' لیکن ان کے جھڑکنے نے انہیں پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں سوائے جاب چھوڑنے کے سوا انہوں نے جاب چھوڑ دی۔

اس کے بعد انہیں ذوالقرنین کے آفس میں نوکری مل گئی۔ وہ طرحدار اور حسین تھیں' ذوالقرنین صاحب کو ایسی خواتین ہی پسند تھیں۔ دونوں کا دھواں دار افیئر چلا اور نتیجہ شادی کی صورت بر آمد ہوا۔ عمر نے انہیں قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کی اپنی ماں بھی اسی مزاج کی تھیں۔ وہ ایک بروکن فیملی کا لڑکا تھا۔ سالوں پہلے اس کے والدین الگ ہوگئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے اندر والدین کی کمی کو حسرت بنا کر پروان نہیں چڑھایا۔ اس نے اپنی دنیا بنالی تھی۔ ضوفشاں نے اس پر اپنا کنٹرول کرنا چاہا لیکن وہ "عمر" تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ضوفشاں کے دل میں شکیل صاحب کا انکار کسی خنجر کی طرح چبھا رہ گیا۔ وہ اکثر انہیں مختلف پارٹیز میں دکھائی دیتے۔ ان کا پہلو ہمیشہ خالی ہوتا۔ وہ جل کر رہ جاتیں۔

عمر نے گھر میں کسی ریحاب نامی لڑکی کا ذکر کیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ذوالقرنین کو بھلا کیا اعتراض ہونا تھا۔ وہ اس اشتیاق میں چلی آئی تھیں کہ عمر کی پسند دیکھیں گی؟ انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریحاب "شکیل" کی بیٹی ہوگی۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ریحاب کو بہو ماننے سے انکار کردیا تھا۔ ان کے اس بے تکے انکار کو بھلا کون اہمیت دیتا؟ ذوالقرنین کو وہ عزیز تھیں' لیکن چونکہ ان کے انکار کی معقول وجہ نہیں تھی سو انہوں نے ضوفشاں کو خاموش رہنے کو کہا۔



ان کی شادی کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ اس کا چیخنا چلانا سب بیکار تھا۔ شکیل صاحب کا رویہ ریحاب کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ساری غلطی ان کی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اسے کیوں صفائی نہیں دے رہے تھے۔ اس سے کیوں کچھ نہیں کہا۔؟ کچھ تو بولتے لیکن وہاں ایک گہری خاموشی اور تکلیف دہ لاتعلقی تھی۔ وہ خود اس سے ناراض ہوگئے تھے۔ منال الگ گم صم تھی۔ پورے گھر میں ایسا سناٹا تھا جیسے کوئی مرگ ہوگئی ہو۔

چاروں طرف وحشت ناچتی پھرتی تھی۔

اسے اپنے پاپا کے فیصلے کا علم بھی ہوگیا تھا کہ وہ منال سے نکاح کررہے ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے دل کو چین نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس نے جذباتی ہوکر بہت غلط کردیا ہے۔ وہ یوں ہی بے قراری سے گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کے کمرے کے برابر ہی شکیل صاحب کا کمرہ تھا۔ اس نے منال کو اندر جاتے دیکھا۔ وہ وہیں رک گئی پھر کچھ سوچ کر دروازے پر آئی۔ اندر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں اس نے کان لگائے۔

"آپ نے ریحاب کو حقیقت کیوں نہیں بتائی۔؟ کیوں اس کی غلط فہمی دور نہیں کی؟" منال کی بھرائی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" شکیل صاحب کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ ریحاب کے اندر تک پھریری دوڑ گئی۔

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میرے وجود کا حصہ۔ وہ مجھے ایسا گرا ہوا سمجھتی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کی ماں کے مرنے کے بعد کبھی کسی عورت کے بارے میں نہیں سوچا۔ ریحاب کو اپنی زندگی کا محور بنایا۔ اس کی بہترین تربیت کی۔ اسے محبت دی اور اس نے مجھ پر بھروسا تک نہ کیا۔ ایک بھروسا بھی نہ دے سکی وہ مجھے۔؟ کیا ایسی ہوتی ہے اولاد ہاں۔ اولاد؟ ایسی ہی ہوتی ہے۔"

وہ شدید اذیت بھرے لہجے میں بول رہے تھے۔ ریحاب میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ اسے لگا' وہ مرجائے گی۔ اس جیسی اولاد کا مرجانا ہی اچھا تھا۔ ایک ٹیپ شدہ فون سننے کے بعد اس نے اپنے باپ کے کردار پر کیسے شک کرلیا؟ اسے خود سے اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔ اس نے دعا کی کہ وہ مرجائے۔

منال کو جو نوکری ملی تھی' وہ اس سے بے حد خوش

تھی۔ اس کی تنخواہ اتنی تھی کہ وہ آسانی سے اپنی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔ آفس میں بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہاں کا ماحول بھی کافی سازگار تھا۔ البتہ شارق زمان جو کہ باس کا چچہ تھا۔ اکثر اسے تاڑتا۔ وہ کوفت میں مبتلا ہو جاتی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جارہے تھے۔ شارق زمان اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ بظاہر وہ بے حد مہذب انسان تھا۔ لیکن منال چونکہ اس کی توجہ محسوس کر چکی تھی اس لیے اس سے دور رہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہی انسان تھا اور وہ اس کے علاوہ کسی اور کو وہ جگہ نہیں دے سکتی تھی۔

چند دن اور گزرے اور شارق زمان نے اسے شادی کے لیے پرپوز کر دیا۔ اس نے ایک لحہ بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی اور اسے انکار کر دیا تھا۔ شارق زمان کا تاریک ہوتا چہرہ دیکھ کر اسے افسوس ہوا لیکن وہ بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

شارق زمان کا دن بدن بڑھتا اصرار اور پاگل پن اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ جاب بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے کہ درمیان لٹکی رہتی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شارق زمان ایک نمبر کا فلرٹی آدمی تھا لیکن چونکہ اسے اب شادی کرنی تھی اس لیے اسے منال پسند آئی۔ اس نے منال جیسی لڑکیاں بہت کم دیکھی تھیں۔ اسے باکردار لڑکی چاہیے تھی اسے منال نظر آگئی۔ وہ سچ مچ اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن اس کا مستقل انکار اس کا گریز اس کے اندر کے انا پرست مرد کو جگا رہا تھا بلکہ جگا چکا تھا۔

منال کے پیچھے وہ بہت خوار ہوا لیکن پھر بھی وہ نہ مانی۔ اس نے منال کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ اسے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کیسے اپنے سامنے جھکائے گا۔ وہ خود اس کے پاس آتی اور اس کی منتیں کرتی کہ وہ اس سے شادی کرلے اور اس کے بعد وہ اپنا لیتا۔ اس کا بدلہ پورا ہو جاتا۔ اس نے پلان ترتیب دے دیا تھا۔ اور دن بھی منتخب کر لیا تھا۔

وہ روز کی طرح آفس آئی۔ ابھی اسے آفس آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کا موبائل بجا۔ فون سن کر وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ شارق اسے روتا دیکھ کر اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا ہوا منال۔ خیریت تو ہے نا؟" وہ مصنوعی پریشانی سے بولا۔

اسپتال سے فون آیا ہے کہ ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھے جانا ہے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم پریشان مت ہو۔ میں تمہیں اسپتال ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے آفر کی تھی اور منال نے بنا سوچے قبول کر لی۔ پورے راستے وہ روتی اور دعائیں کرتی رہی۔ چونکی تب جب شارق نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روکی۔

"آپ یہاں کیوں آگئے۔؟" وہ حیران سی بولی۔

"تمہارے ابا اسپتال میں ہیں یقیناً" پیسوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ میں اپنا والٹ گھر بھول گیا تھا، وہی لینے آیا ہوں۔" اس نے اتنا معقول بہانہ پیش کیا تھا کہ اسے شک بھی نہ ہو سکا۔ اور فی الحال اس کے پاس بہت کم پیسے تھے، اپنی انا کو مار کر وہ چپ رہی۔

"تم بھی اندر آجاؤ۔ پانی وانی پی لو۔" وہ چپ چاپ اتر آئی۔ دماغ حامد صاحب میں اٹکا تھا۔ اس نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ وہ ایک کمرے میں گھس گیا تھا۔ اسے لاؤنج میں بٹھا کر وہ والٹ ڈھونڈنے لگا۔ وہ پانی پینے لگی۔ ٹینشن سے اس کا دل شدید دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شارق اندر آیا۔

"چلیں۔" اس نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر کہا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی ناک اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ شارق کی نگاہیں بدلی تھیں۔ اب ان میں صرف بدلہ نہیں تھا، جذبات بھی تھے۔ وہ جذبات جو شدید انا نے دبا لیے تھے۔ وہ بے اختیار اس کے قریب آیا۔

"منال۔" اس کی آواز اور لہجہ بدل گئے تھے۔ منال کا رنگ اڑ گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا اور اب آگے کیا ہو گا۔؟ وہ خوف زدہ سی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ شارق نے

اسے بے بس کر دیا۔ وہ چیختی رہی مگر اس نے اس کی ایک نہ سنی۔

اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اس نے منال کو بتایا تھا کہ اس نے وہ جھوٹا فون کروایا ہے۔ منال نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اسے کچھ کہہ پاتی۔ اسے اب تک قدرت کی اس ستم ظریفی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔




"میں منتظر ہوں کہ کب تم مجھ سے کہو گی شارق مجھے اپنا لیں۔"

اس روز اس نے کیسے خود کو سنبھالا تھا' یہ وہی جانتی تھی۔ اگر وہ یہ بات اپنی ماں کو بتاتی تو وہ جیتے جی مرجاتیں۔ وہ خود تو بے موت مرچکی تھی اب کسی اور کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔ شارق روز اسی قسم کے پیغامات اسے بھیجتا۔ وہ اب زندہ لاش تھی۔ جبکہ شارق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ مرجائے گی لیکن شارق جیسے گدھ کے سامنے جھکے گی نہیں۔ لیکن یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ طبیعت خراب ہونے پر اس نے ٹیسٹ کروائے تھے اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ سن رہ گئی تھی۔ سالوں کی عزت مٹی میں مل چکی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ غم کی شدت سے مرجائے گی۔ وہ اپنے مرنے کی دعائیں مانگتی لیکن وہ بھی قبول نہ ہوتیں۔



ان ہی دنوں شکیل صاحب کسی کام کے سلسلے میں حیدر آباد گئے تھے۔ ایک سڑک پر گاڑی بے قابو ہوجانے کے باعث انہیں چوٹ آئی تھی۔ قریبی کلینک جاکر انہوں نے مرہم پٹی کروانے کا سوچا تھا اور وہاں انہوں نے منال کو دیکھا۔

وہ لیڈی ڈاکٹر سے روتے ہوئے جو کہہ رہی تھی' اس نے ان کو منجمد کر دیا۔ وہاں سے نکلتے منال نے شکیل صاحب کو دیکھا تو اسے اس آخری صدمے سے بھی گزرنا پڑا۔ انہوں نے بے انتہا غصے سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور اسے باہر لے کر آئے تھے۔

"یہ کیا سن رہا ہوں میں؟" غصے سے ان کی بری حالت تھی۔ اس نے روتے بلکتے ساری بات انہیں بتادی۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم رہے۔ "بالکل ساکت اور چپ۔

"تم آج ہی میرے ساتھ کراچی چلو گی اور ہاں اس بارے میں ریحاب کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور اس شارق کو تو میں دیکھ لوں گا۔" ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اس شکاری کو قتل کردیں۔

"میں وہاں جاکر کیا کروں گی۔؟ اور رہی بات اس آدمی کی تو جو بھی ہوا اب میری عزت تو واپس نہیں آسکتی۔ میں اور بدنامی نہیں برداشت کرپاؤں گی۔ وہ مجھے بدنام کردے گا' وہ بہت گھٹیا آدمی ہے۔" منال خوف زدہ تھی۔

"اب یہاں تو میں تمہیں نہیں رہنے دے سکتا۔ اور اس مسئلے کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں۔" وہ خود بہت پریشان ہوگئے تھے لیکن اسے تسلی دے رہے تھے۔

وہ منال کو اس کے گھر لے گئے۔ وہ بیمار پڑے حامد صاحب کو ساتھ چلنے کے لیے منا رہے تھے اور وہ مان گئے۔ منال کا دن بدن پیلا پڑتا رنگ انہیں پریشان کرتا تھا وہ جانتے تھے کہ باہر نوکری کرنا آسان کام نہیں لیکن انہیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ منال' کیا کچھ' برداشت کرچکی ہے۔

فون پر ہدایات دے کر وہ انیکسی ٹھیک کروا چکے تھے۔ ریحاب' منال کی اچانک آمد پر جہاں حیران تھی وہاں بے تحاشا خوش بھی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ منال آچکی ہے۔



کراچی آجانے کے بارے میں تو شارق نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے فون پر دھمکاتا لیکن اب وہ اس سے

کیوں ڈرتی؟ اس کے ساتھ شکیل تھے۔ وہ اسے اپنے ایک دوست کی لیڈی ڈاکٹر بیوی کے پاس چیک اپ کے لیے لے گئے تھے۔ یہ سب منال کو بے حد شرمندگی سے دوچار کرتا تھا لیکن وہ کیا کرتی؟ مجبور تھی وہ۔ وہ یہ بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی شکیل صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے سختی سے منع کیا تھا لیکن منال کی دن بدن بگڑتی حالت دیکھ کر وہ اسے خود ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر چونکہ ان کے قریبی دوست کی بیگم تھیں اس لیے وہ ان پر بھروسا کرتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو ضوفشاں نے سن لی تھی۔ وہ اس ڈاکٹر سے ملنے آئی تھیں کہ ان کے ان سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہاں آکر انہیں جیسے خزانہ ہی تو مل گیا تھا۔ ان کی گفتگو کو انہوں نے نہ صرف ریکارڈ کیا تھا بلکہ ایڈٹ کر کے اسے ریحاب کو بھیج دیا تھا۔ ریحاب کے لیے یہ سب اس قدر حیران کن تھا کہ وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اور پھر رپورٹس بھی اس نے منال کے کمرے سے ڈھونڈ نکالی تھیں۔ اس سب نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ پاگل ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ضوفشاں اپنے اس کارنامے پر بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے بعد میں اسے فون کر کے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عمر سے شادی سے انکار کر دے کیونکہ وہ ایک بدکردار مرد کی بیٹی کو قبول نہیں کر سکتیں۔ اس نے ان کے فون آجانے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ عمر سے تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرے گی۔ بقول اس کے اتنے نیک بابا بہک گئے تو عمر تو تھا ہی فلرٹ۔ اس نے بنا سوچے سمجھے وہ سب کیا تھا۔ اسے حقیقت کا علم نہیں تھا۔



وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے روتے روتے سر اٹھایا اور منال سے بات کرنے کا سوچا' وہ اپنا موبائل اٹھا کر منال کے کمرے میں آگئی۔ منال کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ ریحاب کے چہرے پر اسے شرمندگی دکھائی دے رہی تھی اسے حیرت ہوئی۔ ریحاب نے کچھ بھی کہے بغیر کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور موبائل میں موجود آڈیو چلائی۔ وہ بلاشبہ اس کی اور شکیل صاحب کی آواز تھی لیکن ان کی باتوں کو کاٹ پیٹ کر ایسے جوڑا گیا تھا کہ وہ بھی سن کر ششدر رہ گئی۔

"بتاؤ۔ میں کیا کرتی۔؟ مجھے معلوم ہے کہ میں نے بہت غلط کیا ہے۔ میں معافی کے بھی قابل نہیں لیکن تمہیں مجھے سچ بتانا چاہیے تھا۔ میرے عزیز ترین اور قریبی لوگوں کے بارے میں جب میں یہ سنوں گی اور تمہاری رپورٹس دیکھوں گی تو۔" وہ رونے لگی۔ منال اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور سب سچ بتا دیا۔ حقیقت جان کر تو وہ اور بھی شرمندگی کے گڑھے میں گر گئی۔

"میں حیدر آباد شارق سے ملنے گئی تھی۔ اماں ابا سے بھی مل نہیں پائی۔ وہ کچھ دن بعد ہی حیدر آباد چلے گئے تھے تاکہ گھر پہ رہ سکیں۔ شارق نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ میری اور اپنی وڈیو نیٹ پر اپ لوڈ کر دے گا۔ وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ پھر شکیل صاحب کو بتایا تو انہوں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے اسے غائب ہی کروا دیا۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں بول رہی تھی۔

"شارق پولیس کی تحویل میں ہے اور سالوں کے لیے اندر چلا گیا ہے۔"

"میں اس قابل تو نہیں کہ معافی مانگ سکوں لیکن پھر بھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" منال نے اس کے ہاتھ پکڑے۔ جس قسم کا یہ آڈیو کلپ تھا اس کے بعد تمہارا ایسا سوچنا حیران کن نہیں۔" منال نرمی سے بولی۔

"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری زندگی میں اتنا سب کچھ ہو گیا۔ میں غلط فہمیوں میں گھری اپنے رونے روتی رہی۔" وہ روتے ہوئے بولی منال نے اسے ساتھ لگا لیا۔

وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اور یہ سب جو بھی ہوا' منال کو لگتا تھا کہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ شکیل اس کی مدد کرتے نہ ریحاب غلط فہمیوں میں پڑتی۔

ریحاب کی جان مشکل میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں اتنی آسانی سے اسے معاف نہیں کریں گے۔ اس کے پاپا کی دکھ بھری آواز' مان ٹوٹنے کا غم' کیا کچھ نہیں تھا ان کے لہجے میں۔ اور اس نے عمر کو بھی کتنا تنگ کیا تھا۔ دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے اور دونوں ہی اب اس سے شدید ناراض بھی۔

وہ دن میں دس بار ان کے کمرے کے چکر کاٹتی' وہ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے۔ اس کا دل کٹ جاتا۔ دن رات روتے ہوئے گزرتے تھے۔ دوسری طرف عمر بھی اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔

منال کے والدین بھی آگئے تھے۔ اور ان سے رشتے کی بات بھی ریحاب نے ہی کی تھی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ شکیل صاحب بھلے ہی اس کی دوست کے والد تھے لیکن اتنی بڑی عمر کے ہرگز نہیں تھے۔ اور جس قسم کی طبیعت حامد صاحب کی ان دنوں تھی' انہیں یہی بہتر لگا کہ وہ ہاں کر دیں۔

شکیل صاحب تو بالکل ہی اس سے لاتعلق تھے۔ ریحاب روتی رہتی۔ منال اسے کب تک سنبھالتی۔ شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ وہ اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی لیکن شہر کے اس مہنگے ہال میں بجی روشنیاں اندھیرے کا مقابلہ کرتے اتری تھیں۔ منال نے اپنے نکاح کا دن آگے بڑھا لیا تھا۔ وہ لوگوں کے اس ہجوم میں کیسے دلہن بن کر بیٹھتی وہ بھی شکیل صاحب کی۔ وہ بھی اس کی مشکل سمجھ گئے تھے۔

ریحاب دلہن بنی بے حد حسین لگ رہی تھی اتنی کہ عمر کی اس پر نگاہ پڑتے ہی ساری ناراضی اڑن چھو ہو گئی۔ جبکہ شکیل صاحب لاکھ کوشش کرتے پر آج کے دن وہ اپنے دل کو اداس ہونے سے روک نہیں پائے تھے۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آرہی تھیں اور پھر اس کی رخصتی کا وقت بھی قریب آگیا۔

ریحاب جب ان کے گلے لگی تو ساری ناراضی' آنسوؤں میں بہہ گئی۔ وہ رو رو کر ان سے معافی مانگ رہی تھی۔ ان کا دل اس کی طرف سے صاف ہو چکا تھا۔



ریحاب بجی سنوری حوروں کو بھی مات دیتی پلنگ کے عین وسط میں بیٹھی تھی۔ وہ عمر کی ناراضی کا سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ تب ہی عمر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ سوچوں میں ابھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے قریب بیٹھنے پر وہ چونکی۔ فوراً" ہی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے۔

"تم پھر رونا شروع ہو گئیں۔" عمر اچنبھے سے بولا۔

"آئی۔ ایم رئیلی سوری عمر! میں نے آپ کو بہت ہرٹ کیا۔" وہ سوں سوں کر کے کہہ رہی تھی۔ عمر نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں وہ ساری بری باتیں بھلا چکا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا تو ریحاب خوش ہو گئی۔

"میں اپنی اس نئی زندگی کی شروعات لڑائی' جھگڑے یا ناراضی سے نہیں کرنا چاہتا۔ تم نے اس وقت جو کیا' وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ چاہے غلط سہی لیکن پھر بھی۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی غلطیاں معاف کرنے کا ظرف بھی رکھا جاتا ہے۔ اور مجھے تم سے بے تحاشا محبت ہے۔ اور میں وہ سب بھول چکا ہوں۔ آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بولو اس نئی زندگی میں تم میرا ساتھ دو گی؟ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

ریحاب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر یقین دہانی کرائی تھی۔



[illegible] محسوس [illegible] نفاست پسندی تو ان ہی کی ہیں۔

☆ ☆ ☆

علیشاہ احمد

نفاست پسند

حد ہوتی ہے بھئی، تم سے برتن تک جگہ پر نہیں رکھے جاتے۔" سویرا نے اپنی چھوٹی بہنوں ناجیہ اور مہ کامل کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ناجیہ فوراً" اٹھی اور برتن کچن میں پہنچائے، کیونکہ وہ نفاست پسندی پر لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ جو سویرا ہر وقت دینے کو تیار رہتی تھی۔

"سسرال جاؤ گی تب پتا چلے گا کیسے کیڑے نکالتے ہیں سسرال والے ہر کام میں۔" سویرا بیٹھ چکی تھی اور لیکچر دینے کو تیار تھی۔ مہ کامل اور ناجیہ نے ایک دوسرے کی طرف اکتاہٹ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تو اپنے گھر میں ایک چیز ادھر سے ادھر برداشت نہیں کر سکتی۔" سویرا نے فخریہ انداز سے کہا۔ اور ناجیہ اور مہ کامل چپ کر کے سنتی رہیں کہ بول کر لیکچر کو طوالت ضرور دینی ہے۔ جو ویسے ہی بہت طویل ہوتا تھا۔

سویرا کی شادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اور اب تک وہ علیحدہ گھر میں منتقل بھی ہو چکی تھی۔ وہ جب بھی میکے آتی تھی مہ کامل اور ناجیہ کو نفاست پسندی پر لیکچر دیتی رہتی تھی۔ وہ دونوں ہی اس کا لیکچر سننے سے بچتی تھیں۔ ان دونوں نے سویرا کا نام لیکچر اور نفاست پسند رکھا ہوا تھا۔ اس کی آمد پر دونوں کافی نفاست پسند بن جاتی تھیں۔ چادر پر ایک بھی سلوٹ نہیں، الماریاں ترتیب سے سیٹ، برتن ہمیشہ ان کی جگہ پر اور کچن ہر وقت چمکا کر رکھتی تھیں، جو عام دنوں میں کرنا دونوں ہی گناہ سمجھتی تھیں۔ ان کی اتنی محنت کے باوجود بھی سویرا کوئی نہ کوئی بات ڈھونڈ لیتی تھی اور انہیں ایک طویل لیکچر سناتی تھی۔ سویرا کے آنے سے اور

"آپی ہر وقت ہمیں نفاست پسندی کا لیکچر دیتی رہتی ہیں مجھے تو بڑا غصہ آتا ہے۔" ناجیہ مہ کامل سے بولی جو کوئی ناول پڑھنے میں مصروف تھی، پر نفاست پسندی کا سن کر فوراً" ناول بند کر کے ناجیہ کی طرف پلٹی۔ آخر کو سویرا کی نفاست پسندی پر برا بھلا اس نے بھی تو کہنا تھا۔

"ہاں آپی ہمیں تو ایسے نفاست پسندی کا لیکچر دیتی ہیں جیسے شادی سے پہلے خود تو بڑی نفاست پسند تھیں۔ یاد ہے پہلے کیسے چائے پر سے ملائی اٹھا کر ٹرے پر رکھ دیتی تھیں، اب کل جب یہی میں نے کیا تو نفاست پسندی پر لیکچر اسٹارٹ۔" مہ کامل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ سویرا کی نفاست پسندی سے جی بھر کر بےزار تھی۔

"اور تمہیں یاد نہیں آپی کی شادی سے پہلے کیسے برتن جگہ جگہ پڑے رہتے تھے، تب تو کوئی خیال نہیں ہوتا تھا اور اب ایک برتن ادھر ادھر پڑا ہو تو لیکچرار نفاست پسند لیکچر دینا شروع کر دیتی ہیں۔" ناجیہ نے بھی اپنی بھڑاس نکالنی چاہی اس کا دکھ کونسا مہ کامل سے مختلف تھا۔

"یہ دیکھو ذرا کتنی گرد جمی ہوئی ہے اس کرسی پر۔ صاف بھی کر لیا کرو کبھی، ہر وقت بیٹھی ہی رہتی ہو دونوں۔" سویرا کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی کی سطح کو چھوتے ہوئے بولی جس پر ذرا سی گرد جمی تھی ناجیہ اور مہ کامل کے خیال میں۔ اور اب وہ دونوں جانتی تھیں کہ ایک طویل لیکچر شروع ہونے والا ہے، اس لیے ان دونوں نے اپنے دونوں کان کھول لیے۔ ایک کان سے سن کر سہلانے کے لیے اور دوسرے کان سے باہر نکالنے کے لیے۔ اور ویسے بھی سویرا کی باتوں پر ایک کان کے کام سے گزارا کرنا ذرا مشکل تھا۔

مہ کامل اور ناجیہ ایک دوسرے کی طرف بے بسی سے دیکھتے ہوئے کپڑے بیگ میں ڈال رہی تھیں۔

"مطلب اب ہم بذات خود چل کر لیکچر اور نفاست پسند کے پاس جا رہے ہیں؟" ناجیہ نے اپنی بڑی بہن مہ کامل کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں مطلب تو یہی ہے۔ یہ امی بھی نا اگر عارف بھائی (آپی کے شوہر) کچھ دن کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور کہ ہم آپی کے پاس جا کر رہیں۔"

"ہاں اب روز آپی کے نفاست پسندی پر لیکچر سننے پڑیں گے اوہ گاڈ۔"

"جانا تو پڑے گا امی کا حکم جو ہے 'تو ذرا کپڑے صحیح طرح سیٹ کر کے رکھو کہ کہیں جاتے ہی لیکچر نفاست پسند اس بات پر شروع نہ ہو جائیں کہ کپڑے بھی صحیح طرح نہیں رکھے جاتے۔" مہ کامل نے ناجیہ سے کہا کیونکہ اب جانا تو تھا ہی 'تو اب وہ یہی کر سکتی تھیں کہ سویرا کو لیکچر دینے کا موقع کم سے کم دیں۔



"کیا سوچا تھا اور کیا ملا۔" ناجیہ نے مہ کامل کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں تو اور کیا' میں نے تو سوچا تھا کہ بہت نفاست سے سیٹ ہو گا آپی کا گھر' پر یہ تو۔" مہ کامل نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ جگہ جگہ فرش پر چیزوں کے کاغذ بکھرے ہوئے' چادر پر بے تحاشا سلوٹیں' پردے بلا کے میلے اور صفائی تو لگ رہا تھا عرصے سے نہیں ہوئی۔

"ہمارے اتنے بڑے گھر کو نفاست سے سیٹ کرنے کے درس دیتی ہیں اور اپنے ایک کمرے' کچن اور واش روم کا گھر بھی صحیح طرح سیٹ نہیں ہوتا۔" ناجیہ نے مہ کامل سے کہا۔

"ہاں' درس دینا ہی آسان ہوتا ہے خود عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" مہ کامل نے ناگواری سے کہا۔ ناجیہ نے سر ہلا کر اس کی بات سے اکتفا کیا۔



"ناجیہ تم نے دیکھا؟" مہ کامل نے صحن میں کھڑی ناجیہ کے پاس آتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں' کیا؟" ناجیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپی برتن دھوتے ہوئے لیکویڈ کا صرف ایک قطرہ ڈالتی ہے اور سارے برتن دھو لیتی ہیں بالکل اس اشتہار پر عمل کرتی ہیں کہ ایک قطرہ ڈالو اور سارے برتن دھو ڈالو۔"

"ہاں اور اتنے گندے دھوتی ہیں' توبہ مجھے تو



استعمال کرنے سے پہلے دوبارہ دھونے پڑتے ہیں۔" ناجیہ نے کہا۔

"ویسے اس میں لیکوئیڈ کا قصور نہیں ہے" آپی خود ٹھیک طرح نہیں دھوتیں ورنہ ہم بھی تو اسی سے اتنے اچھے دھو لیتے ہیں۔" مہ کامل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہاں آکر مجھے ایک بات پتا چلی ہے کہ آپی بس باتوں باتوں میں نفاست پسند ہیں۔ حقیقت میں خود نہیں ہیں۔" ناجیہ نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

"ہاں وہاں تو آپی کہتی تھیں کہ ایک چیز بھی مجھے اس کی جگہ سے یہاں وہاں برداشت نہیں ہوتی یہاں آکے پتا چلا کسی چیز کی کوئی جگہ ہو تو انہیں برداشت نہیں ہوتا۔"

"تم دونوں وہاں کھڑی کیا باتیں کر رہی ہو؟" سویرا نے صحن میں دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر پوچھا۔

مہ کامل اور ناجیہ سویرا کی آواز سن کر مڑیں تو دیکھا وہ پردے سے اپنے گیلے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ ان دونوں کا دل چاہا پوچھیں کہ اب کہاں گئی نفاست پسندی پر وہ دونوں خاموش رہیں کہ وہ نفاست پسند اپنے آپ میں بہت بڑی نفاست پسند ہے یہ بات وہ دونوں جانتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے گھر آگئے ہیں ورنہ تو اس نفاست پسندی کی نفاست پسند مار دیتی۔" مہ کامل نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں مہ کامل پر میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم ہی تنگ ہیں لیکچرار نفاست پسند سے پر نہیں ہم اکیلے نہیں ہیں عارف بھائی بھی تنگ ہیں ان کے لیکچرز سے چلو ہمیں تو کبھی کبھار ملتا ہے پر عارف بھائی کو تو روز ملتا ہے بے چارے کیا کہہ رہے تھے۔" ناجیہ نے بات ادھوری چھوڑی پوری جو مہ کامل نے کردی تھی۔

"خوب لیکچر ملا ہوگا تم دونوں کو نفاست پسندی کا سچ اگر لیکچر کے ساتھ ساتھ کام میں بھی نفاست پسندی کا عنصر ہو تو بندہ چپ کر کے سن بھی لے پر جب صرف باتوں میں نفاست پسندی ہو تو بولنے کا دل چاہتا ہے کہ بندہ بتائے کہ نفاست پسندی ہوتی کیا ہے پر بھئی ہم تو لیکچر کو طوالت دینے سے ڈرتے ہیں۔" مہ کامل نے ہو بہو عارف کی بات دہرائی۔

"ویسے مہ کامل! قصور آپی کا بھی نہیں ہے وہ واقعی سمجھتی ہیں کہ وہ بہت نفاست پسند ہیں نفاست پسند کا صحیح مطلب جو نہیں پتا انہیں۔" ناجیہ نے اپنی بات مکمل کر کے قہقہہ لگایا جس میں مہ کامل کا قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"حق ہا رضیہ بہن! میری بہو تو ذرا بھی نفاست پسند نہیں ہے برتن پورا پورا دن ایک ہی جگہ پر پڑے رہتے ہیں لیکن اسے کوئی ہوش نہیں ہوتا۔" ناجیہ وغیرہ کی ہمسائی ان کی امی کے پاس آئی بیٹھی تھیں مہ کامل اور ناجیہ بھی چائے سرو کرنے کے بعد ان کے دکھڑے سن رہی تھیں۔

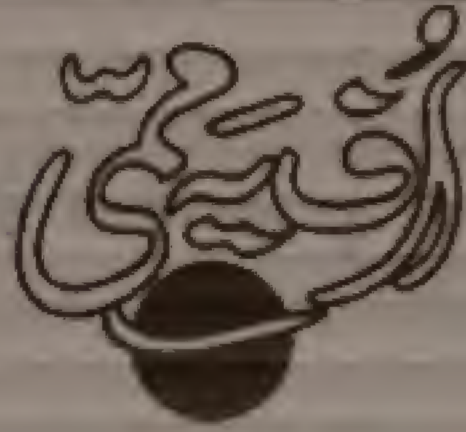
"آپ کی بیٹیاں تو ماشاء اللہ بہت نفاست پسند ہیں۔" ان کی ہمسائی نے محبت بھری نگاہوں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں فقط مسکرا کر رہ گئیں۔

"جی بہن اللہ کا شکر ہے یہ دونوں تو اتنی نفاست پسند نہیں ہیں ابھی آپ میری بڑی بیٹی سویرا کو دیکھیں تو نفاست پسندی کا مطلب پتا چلے آپ کو اس کے جیسا نفاست پسند تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" رضیہ خاتون نے محبت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اور مہ کامل اور ناجیہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک واضح تحریر تھی جسے وہ دونوں بخوبی پڑھ سکتی تھیں۔

"خدا نہ کرے کہ سویرا آپی جیسا نفاست پسند اس دنیا میں کوئی اور ہو۔"

☼

ام ایمان قاضی





وہ بڑی ترنگ میں پھولوں سے سجے اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ جہاں اس کے خوابوں کی تعبیر انشرح اپنا پور پور اس کے لیے سجائے اس کی منتظر تھی۔ اس کمرے کو دونوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق سجایا اور ترتیب دیا تھا۔ آج اس کا شرمایا شرمایا سا روپ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی وہ اس کے سجے سنورے روپ کو نظر بھر کر دیکھ نہ پایا تھا کہ زوردار دستک پر وہ دونوں ہی چونک گئے۔

خوب صورت لمحوں کا فسوں ٹوٹنے پر وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔ دروازہ کھولنے پر اسے اپنی ملازمہ شریفاں کی گھبرائی صورت نظر آئی۔

"وہ۔ وہ علی بابا! انشرح بے بی کی ممی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ جی' وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے گھبرائی آواز میں کہا۔ اس کی آواز انشرح تک بھی پہنچی تھی' جب ہی لال رنگ کا بھاری لہنگا سنبھالتی انشرح تیزی سے بیڈ سے اتر آئی۔

"کیا ہوا ممی کو۔ آؤ میرے ساتھ۔" علی کو اس پل یکسر نظر انداز کرتی انشرح اس کے پاس سے گزر کر شریفاں کو ساتھ لے کر ممی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"اف یہ ممی!" وہ کراہا۔ ممی نے ایک بار پھر اس کے ارمانوں پر شب خون مارا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ڈھیلے قدموں سے چلتا ممی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ممی اب ہوش میں تھیں۔ دلہن بنی انشرح ان کے بالکل پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ممی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا جبکہ شریفاں ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

"وہ دیکھیں وہ آگئے علی بھی۔ آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی تھیں۔ علی بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی میں کرتی ہوں۔" انشرح نے علی کو دیکھ کر ممی کی گویا تسلی کرانی چاہی انہوں نے کچھ کہے بغیر صرف آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"کیا ہوا ہے ممی کو؟" بمشکل اپنے اندر کے ابال کو

مکمل ناول

قابو میں رکھ کر وہ اپنا لہجہ سرسری بنا پایا۔

"ممی کبھی میرے بغیر تنہا نہیں رہیں ناں علی! تو میری جدائی کا سوچ سوچ کر انہوں نے دیکھو تو اپنا کیا حال کر لیا۔" انشرح روہانسی ہو کر بولی' جبکہ ممی جی کی آنکھوں سے بھی آنسو جھر جھر بہنے لگے۔ پٹر پٹر بولتی انشرح شاید بھول رہی تھی کہ وہ دلہن ہے اور آج ان کی شادی ہوئی ہے' اف یہ ممی۔ علی نے دل میں ایک بار پھر دہرایا اور ممی کے دوسری طرف آن بیٹھا۔

"آپ کی انشرح کو آپ سے دور نہ کروں اسی لیے تو میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا ہے ممی! پھر کس جدائی کا سوچ کر آپ نے یہ حال کر لیا ہے۔ آپ کا کمرہ ہے اور اس سے صرف دس قدم کے فاصلے پر ہمارا کمرہ ہے۔ آپ کے اتنے قریب کہ آپ کی ایک پکار پر ہی ایک منٹ کی دیر کیے بغیر آپ کے پاس موجود ہوں۔"

"علی! میری انشرح کو بہت خوش رکھنا۔ کبھی کوئی

دکھ نہ دینا۔" اس کی تسلی کے جواب میں انہوں نے وہی الفاظ دہرائے جو رشتہ ہونے سے لے کر آج تک بلامبالغہ وہ سینکڑوں نہیں ہزاروں بار دہرا چکی تھیں۔

"اس کو میرے پاس رہنے دیں گی تب ہی کسی خوشی کا سوال پیدا ہو گا۔" دل ہی دل میں وہ بولا' پر زبان سے کچھ اور الفاظ ہی ادا ہوئے۔

"جی جی ممی! آپ فکر ہی نہ کریں آپ کو زندگی بھر میری طرف سے کوئی شکوہ نہیں ہو گا۔"

"دیکھا ممی!۔ یہ مجھ سے زیادہ آپ کو چاہتے ہیں۔" انشرح چہکی۔ وہ بے بسی سے اپنی نئی نویلی دلہن کو اپنی ماں کے چاؤ پورے کرتا دیکھتا رہا۔

"شریفاں! جاؤ ممی کے لیے دودھ گرم کر کے لاؤ۔ اتنی سی دیر میں کیسے چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔" انشرح کی تشویش پر علی ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"او کے ممی! میں بہت تھک گیا ہوں صبح اٹھ کر ولیمہ کے انتظامات بھی دیکھنے ہیں' چلتا ہوں۔"

اس سے بڑھ کر اس میں ممی کے ناز اٹھانے کی ہمت اور وقت تھا نہ ان کی بیٹی کے لیے' کمرے میں آکر اس نے غصے میں پھولوں کی لڑیاں کھینچ ڈالیں۔ تکیے اٹھا کر نیچے پھینک دیے' جلتے کڑھتے نہ جانے تھکا ہوا جسم اور دماغ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔

دو بجے کے بعد جا کر کہیں ممی کو سلا کر انشرح کو اپنے دولہا کا خیال آیا تھا' وہ شریفاں کو ممی کے پاس سونے کا کہہ کر کئی ہدایات دے کر اپنے کمرے میں آئی تو کمرے کا حشر دیکھ کر علی کے غصے کا اندازہ ہوا۔ زیرو کا سینگوں بلب اپنی کمزور روشنی میں بھی کمرے کی حشر سامانیاں دکھا رہا تھا۔

"اوہ۔ میں نے شاید زیادتی کر دی۔ آج کے دن کے حوالے سے علی کے پاس میرے لیے بہت سے سرپرائز تھے اور اس نے مجھے کوئی گفٹ بھی دینا تھا۔ اف میں نے ایک بار پھر اسے خفا کر دیا۔"

زیور اتار کر رکھتے۔ کپڑے تبدیل کرتے وہ مسلسل یہی سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

علی کے ماں باپ بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ بچپن سے ہی وہ اپنے ماموں کے پاس رہا تھا۔ جو کہ مستقل مسقط میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے اپنے بھی دو بیٹے تھے' علی کی بھی انہوں نے بیٹے کی طرح ہی پرورش کی تھی۔ پھر بچوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اپنا گھر کاروبار سب کچھ پاکستان منتقل کر دیا تھا۔ پھر دونوں بیٹوں کی اپنے رشتہ داروں میں شادی بھی کر دی تھی۔

ان ہی دنوں علی کی جاب ایک نجی کمپنی میں دوسرے شہر ہوئی تو ماموں نے اسے اپنے رشتہ کی ایک بہن کا ایڈریس دیا تھا کہ نیا شہر نئی جگہ ہے' وہ بیوہ عورت ہیں تو پہلے ان سے جا کر ملے' ساتھ ہی ایک خط بھی دیا تھا۔ انشرح اور اس کی ممی سے اس کا پہلا تعارف یہاں آکر ہوا تھا۔

انشرح کی ممی' ماموں کی دور پرے کی کزن تھیں۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اپنے اوپر کے پورشن کو اس کی رہائش کے لیے صاف کرا دیا تھا۔ علی نے اسی شرط پر ان کی بات مانی تھی کہ وہ کرایہ دے کر رہے گا ورنہ نہیں۔ تھوڑے سے رد و کد کے بعد وہ مان گئی تھیں' ویسے بھی ان کی بیٹی کالج میں زیر تعلیم تھی اور اسی محلے میں تین دکانیں ان کی اپنی ملکیت تھیں جو کہ کرایہ پر دی ہوئی تھیں ان ہی کے کرایہ کی رقم سے ان کے گھر کا گزارا ہوتا تھا۔

ویسے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا' پر انشرح کی ممی انشرح کے حوالے سے بے حد شدت پسند تھیں۔ اتنی کہ عام طور پر والدین کی بچوں سے محبت تو دیکھنے کو ملتی ہے' پر محبت کی ایسی قسم سے علی کا پہلی بار پالا پڑ رہا تھا۔ ممی نے پہلے دن ہی باور کرا دیا تھا کہ چونکہ علی کے ماموں ان کے دور کے رشتہ دار ہیں سو وہ ان کا بھی بیٹا ہوا اور صبح ناشتا بھی ان کے ساتھ ہی کیا کرے اور شام

کو کھانا بھی اسی کے ساتھ کھائے۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ مان گیا تھا۔

پر ممی کے اپنی بیٹی سے محبت کے انوکھے مظاہرے اسے اکثر ہی حیران کردیا کرتے۔ جیسے پہلے دن وہ ناشتے کے لیے نیچے آیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب اس نے ممی کو انشرح کو چھوٹے بچوں کی طرح خود ہی ایک ایک نوالہ منہ میں دیتے دیکھا' پہلی بار اسے حیرت ہوئی پھر وہ عادی ہوتا گیا کہ محبتوں کے اس سے بھی بڑے مظاہرے اسے اپنی آئندہ زندگی میں بھی دیکھنے کو ملے تھے۔

صبح وہ ناشتا کرکے روانہ ہو رہا ہوتا تو اسی وقت انشرح کی وین بھی کالج کے لیے اسے لینے آئی ہوئی تھی۔ کمپنی کی طرف سے اسے بائیک بھی ملی تھی۔ جس کو اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے ممی کی وہ ہدایات اور اقدامات دیکھنے کو ملے جو انہوں نے وین ڈرائیور اور ساتھ بیٹھی لڑکیوں کو دیں' یہی نہیں انہوں نے کئی لڑکیوں کی جگہ تبدیل کرکے انشرح کو بٹھایا پھر اٹھایا پھر بٹھایا پھر گاڑی چلانے کے حوالے سے ڈرائیور کی گوشمالی بھی ہوئی۔

ان کے اس عمل کے پیچھے کیا ردعمل کارفرما تھا وہ نہیں جانتا تھا' پر اس نے قصداً" دیر ضرور لگائی اس دن کہ ممی کی محبت کے اس مظاہرے پر اس نے ڈرائیور اور لڑکیوں کے منہ کے بگڑتے زاویے بھی دیکھ لیے تھے۔ یقیناً وہ روزانہ ہی ایسا کرتی ہوں گی۔ عجیب سی کوفت محسوس کرتے ہوئے وہ آفس چلا گیا تھا شام کو واپسی پر وہ دونوں ماں بیٹی کھانے پر اسے اپنی منتظر ملی تھیں' وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گیا۔

"دیکھیں آنٹی۔ میرا کام کچھ اس قسم کا ہے کہ مجھے دیر سویر ہو جایا کرے گی۔ آپ ایسا کریں گی تو میں اچھا محسوس نہیں کروں گا۔ آپ اپنے معمولات میں میری وجہ سے کوئی فرق نہ آنے دیں' پلیز۔ ایک دو دن میں کھانے کا ارینج ہو جائے گا میرا' پلیز۔"

کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

"ارے نہیں بیٹا! کیسی بات کرتے ہو۔ احسان کے بیٹے ہو' سمجھو میرے بھی بیٹے ہو اور اپنے بچوں کا انتظار کرتے مائیں تھکتی ہیں بھلا۔ بلکہ تم مجھے آنٹی کی بجائے ممی بلاؤ گے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔" انہوں نے کہا تو اس نے سوچ لیا کہ وہ ان کے خلوص کی قدر تو کرے گا پر کسی طریقے سے ان کی ہیلپ بھی کردیا کرے گا۔ ایسے کہ ان کو پتا بھی نہ چلے کہ وہ کھانے کا معاوضہ ادا کر رہا ہے۔ بس وہ طریقہ اسے سوچنا تھا۔

"اور انشرح آپ کیا کرتی ہیں؟" ممی کی بہت خوب صورت اور نٹ کھٹ سی بیٹی سے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔ جسے آنٹی اب پھر سے بچوں کی طرح ایک ایک چمچہ خود سے کھلا رہی تھیں۔

"میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ بی ایس سی کے فائنل ایر میں۔ پڑھائی کے بعد کا جو ٹائم ہوتا ہے وہ ممی کے ساتھ گزرتا ہے میرا۔"

"ہوں۔ آنٹی کھانا بہت مزے کا بنا ہے اور آپ۔ آپ خود کھائیں ناں۔"

لہجے کو انتہائی سرسری سا بناتے اس نے گویا انہیں چونکا دیا تھا۔

"کیسی بات کرتے ہو بیٹا! میں بھلا انشی کو کھلانے سے پہلے کیسے کھانا کھا سکتی ہوں؟ بلکہ تم تو کیا کوئی بھی شاید اس بات پر یقین نہ کرے کہ انشرح کو کھلا کر بعض دفعہ میں ایسے محسوس کرتی ہوں کہ میرا پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔" وہ ایک جذب کی سی کیفیت میں انشرح کے منہ میں چمچ دیتے ہوئے بولیں۔ ایک پل کو علی اپنا کھانا کھانا بھی بھول گیا۔

"لیکن آنٹی۔ انشرح ماشاء اللہ اب بڑی ہو گئی ہے۔ ماں باپ کی محبت اپنی جگہ' لیکن بہت زیادہ بھی بچوں کو اپنا عادی بنا لینا بعض اوقات' بچوں کی خود اعتمادی کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک کمی سی رہ جاتی ہے بچے کے اندر۔ کل آخر آپ انشرح کی شادی بھی کریں گی' پھر یہ کیسے آپ کے بغیر اور آپ اس کے بغیر رہ پائیں گی۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور بے ساختہ اپنے خیال کا

اظہار بھی کر دیا۔

"شادی۔ ایک سرسراتی ہوئی آواز ممی کے حلق سے برآمد ہوئی۔ علی تو ان ماں بیٹی کے تاثرات سے ہی خائف ہو گیا' پھر ایک لمحہ کو اپنی کہی بات کو دل ہی دل میں دوہرا کر دیکھا کہ آیا ایسی کوئی سنگین بات اس کے منہ سے انجانے میں نکل گئی ممی کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔

"میں نے انشی کی شادی بالکل نہیں کرنی اس کو ساری عمر اپنے پاس رکھنا ہے۔" سرگوشی میں کہی اس بات نے علی کو جیسے کرنٹ سا لگا دیا۔

"ہاں علی بھائی! میں نے کوئی شادی وادی نہیں کرنی مجھے تو سسرال نام کی بلا سے بہت خوف آتا ہے۔" انشرح نے اپنے مخصوص لاابالی پن سے کہا تو ممی کے چہرے کی رونق بحال ہوئی تھی۔ انہوں نے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ علی ان کی طبیعت اور ایسی شدید محبت کے بارے میں سوچتا اوپر چلا آیا تھا۔



پھر ایک بار ممی کو پتا چلا کہ اس کے سبجیکٹس میں میتھ بھی شامل رہا تھا' وہ میتھس میں بہت اچھا تھا۔ انہوں نے درخواست کی تھی کہ انشرح کو میتھس میں کچھ پرابلم درپیش ہے' وہ اگر مدد کر دے گا تو مہربانی ہوگی۔ علی نے فوراً" سے بیشتر ہامی بھرلی تھی کہ وہ ان کا بہت احسان مند تھا' سوائے چند ایک باتوں کے اسے کسی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس نے ممی کو مہینہ مکمل ہونے پر مقررہ کرائے کی رقم سے پانچ ہزار اضافی دیے تھے جو کہ اس نے کہا تھا کہ اگر وہ کسی ہوٹل سے کھاتا تو یقیناً اس سے زیادہ ہی بل بھرتا' پھر وہ ایسے اچھا محسوس نہیں کرتا۔ تھوڑا متامل ہونے کے بعد انہوں نے وہ رقم اس سے لے لی تھی۔ پھر اسی شام کتابیں سنبھالے انشرح اس کے پاس آگئی۔ ممی کو اس کے پیچھے آتا دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گیا۔

"وہ بیٹا برا مت ماننا۔ تم میرے اپنے بچے ہو۔ ہر قسم کا اعتبار ہے تم پر لیکن انشرح کو سوائے کالج ٹائم کے' میں کہیں بھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ سوچ سوچ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے کہ میری بیٹی مجھ سے دور ہے۔ تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو میں ایک طرف خاموش بیٹھی رہوں گی۔ بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ علی طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اسے انشرح اب ایک جیتی جاگتی لڑکی نہیں' بلکہ ایک روبوٹ معلوم ہوتی' جس کی زندگی کے ہر معاملے کی ڈور ممی کے ہاتھ میں تھی' اور حیرت کی بات یہ تھی کہ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی و طراری اس میں مفقود تھی' وہ اپنے ان معمولات پر راضی برضا تھی۔ پھر ایک دن پڑھانے کے بعد اس نے نیچے جاتی انشرح کو مخاطب کیا۔

"سنو انشرح۔ ایک کپ چائے بنا دو پلیز۔ آج آفس میں بہت کام تھا۔" انشرح کے رد عمل کو تو اس نے دیکھا نہیں کہ اس کے پیچھے جاتی ممی جھٹکے سے مڑیں۔

"نہیں' نہیں علی بیٹا! میں بنا کر دیتی ہوں ناں تمہیں چائے۔ انشرح کو میں کچن تو کیا کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ خدانخواستہ میری بچی کو کچھ ہو نہ جائے۔"

علی کو پہلے صرف تھکاوٹ ہو رہی تھی پھر تو سر میں بھی درد ہونے لگا۔ "اف یہ ممی" وہ پہلا دن تھا جب اس کے دل سے بے ساختہ یہ پکار نکلی اور آنے والے دنوں میں یہ تین لفظ اس کی زندگی کے ساتھی بن گئے تھے گویا۔

اسے گھر گئے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ ماموں' ممانی سب گھر والوں کی یاد نے کچھ ایسے اس پر غلبہ پایا کہ تین دن کی چھٹی لے کر اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ سب بہت خوش ہوئے تھے۔ شام کو ماموں کے پاس بیٹھا وہ چائے پی رہا تھا جب ماموں کی بات سن کر وہ چونک گیا۔

"اور سناؤ بیٹا! ساجدہ اور اس کی بچی کیسی ہے! کیسی

گزر رہی ہے؟ میں تو چاہنے کے باوجود چکر نہیں لگا پایا ہوں وہاں۔" پھر علی ان کو ممی اور انشرح کے عجیب و غریب تعلق کا بتا کر ان سے کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہو سکتا ہے ماموں کچھ ایسا بتائیں کہ جس سے ان کی ایسی شدت پسندی کا ماخذ پتہ چل سکے' پر مامی جی کے آنے سے ماموں نے بات بدل دی تھی شاید وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے ان کے سامنے۔

تین بھرپور دن گھر گزار کر آیا تو جو بات اسے گنگ کر گئی۔ شام کو انشرح کا وہ معصوم سا اقرار تھا جسے سن کر دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا۔

"سر بہت دن لگا دیے آپ نے۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا۔ ہے ناں ممی۔"

انشرح کی کوئی بات اور ممی کے بغیر مکمل ہوتی' ممکن ہی کہاں تھا' ممی نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ علی بھی کتاب کھولتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اور بیٹا! گھر میں تو سب ٹھیک تھے ناں بھائی' بھابھی' بچے۔ زندگی نے مصروفیات ہی اتنی دی ہیں کہ بعض اوقات انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت دل تھا میرا بھائی کے بچوں کی شادی میں شریک ہوتی' پر ان ہی دنوں پہلے انشرح کی بیماری نے ہاتھ پاؤں پھیلا لیے تھے پھر اس کے پیپرز شروع ہو گئے۔"

"آنٹی! انشرح کے ننھیال' ددھیال میں سے کوئی رشتہ دار آئی مین آپ اکیلی؟" انشرح کو سوال کرنے کا کہہ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"سب سے بڑا سہارا اللہ کی ذات ہوتی ہے بچے! باقی سب تو ثانوی ہے۔ تعلق داریاں' رشتے سب کچھ۔ اس کے ابا کی وفات کے بعد اور کوئی رشتہ باقی ہی نہ رہا' پھر رہے میرے رشتہ دار تو جو کچھ انہوں نے میرے ساتھ کیا' اس کے بعد تو دعا کرتی ہوں کہ کبھی ان سے سامنا ہی نہ ہو سکے ہمارا۔" طویل سانس لے کر انہوں نے مختصر سے الفاظ میں اپنی ساری داستان حیات کو سمیٹ دیا' جس کی بہرحال اسے کچھ خاص سمجھ نہ آسکی تھی۔ لیکن وہ چپ ضرور رہ گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ انشرح کی بھولی صورت کا جادو تھا یا اس کی معصومیت کہ دل نے آہستہ آہستہ اس کا اسیر ہونا شروع کر دیا۔ ایسا ہی حال دوسری طرف بھی تھا یقیناً' جب ہی علی پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ گلرنگ ہو جاتا' نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ ممی جتنا بھی اس کی زندگی کو اپنے طور گزارنے پر زور دیتیں' فطری تقاضوں پر بند باندھنے سے قاصر تھیں۔

ماموں نے بھی اس بار اس سے ذکر کیا تھا وہ اب اپنی اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں چونکہ اب وہ برسر روزگار بھی ہو گیا ہے تو اگر اس کی کوئی پسند ہے تو بتائے' نہیں تو وہ مامی کو اس مہم پر لگانے والے ہیں' تب ہرگز بھی اس کی نگاہ میں ایسا کوئی نہیں تھا تاہم اس نے ماموں سے کچھ ماہ کی مہلت ضرور مانگ لی تھی۔

اب دل نے ہی پینترا بدل کر انشرح کی ہمراہی کے الاپ الاپنے شروع کر دیے تھے' پر گھر بسانے کے لیے بہت سی باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسے سب سے پہلے تو ممی اور ان کی بیٹی کا کچھ دن قبل پیش کیا گیا سنہری قول یاد آیا تھا جو انہوں نے اس کے سامنے دہرایا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گی اپنی بیٹی کی' اور بیٹی صاحبہ نے بھی تائید کی تھی۔ پھر کسی طرح ممی کو منا بھی لیتا تو انشرح سے شادی میں کئی قباحتیں تھیں' ممی نے انشرح کی تربیت ہرگز اس نہج پر نہیں کی تھی' جس طرح عام لڑکیوں کی کی جاتی ہے۔ اس کو پتا نہیں تھا کہ کچن میں کام کس طرح ہوتا ہے۔ انڈا تک ابالنے سے نابلد تھی' وہ کالج جانے کے لیے کپڑے اسے ممی پریس کر کے دیتیں۔ ٹھیک ہے شادی کے بعد وہ ملازمہ بھی افورڈ کر سکتا تھا' پر شادی شدہ زندگی کو نباہنے کے لیے بے شمار تقاضے ہیں' جن کو پورا کرنے کی ذمہ داری سو فیصد عورت پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو انشرح کی تربیت ایسی کی ہی نہیں گئی تھی کہ وہ گھر گرہستی کی ذمہ داریاں نبھا سکتی۔

دماغ سے سوچتا تو وہ انشرح کو فوراً" سے بیشتر، کر دیتا کہ ایسی لڑکی جو ناشتا کھانا اپنی ماں کے ہاتھ سے کرتی ہو وہ کہاں ایک گھر کی ذمہ داری نبھا سکتی جبکہ اس کی موہنی صورت پر نظر پڑتے ہی دل دماغ کے سارے دلائل کو مسترد کر کے لپک لپک کر اس کی ہمراہی مانگتا۔

"ماموں میری شادی کرنا چاہتے ہیں بہت جلد۔ آنٹی! کوئی لڑکی ہو نظر میں تو بتایئے گا۔"

ناشتے پر اس نے کن انکھیوں سے انشرح کو دیکھتے ہوئے مخاطب ممی کو کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ انشرح نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا 'پھر اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر جھٹ نگاہیں جھکا لی تھیں۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ علی کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ ممی کا تاثر البتہ بیٹی سے یکسر جدا تھا انہوں نے خاصی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹا۔ لیکن ایسا ہے کہ میرا حلقہ احباب اتنا وسیع نہیں ہے 'نہ ہی اتنا ملنا جلنا ہے کسی سے تم سے پہلے اوپر جو کرائے دار تھے ان کی بیٹی خاصی خوب صورت بھی تھی اور ان کو رشتہ کی تلاش بھی تھی۔ دیکھوں گی اگر فون پر ان سے رابطہ ہوا تو۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے آنٹی! ابھی آپ کسی سے کوئی بات مت کیجیے گا یہ تو میں نے ماموں کا ارادہ بتایا ہے نا۔۔۔ ابھی میں نے فی الحال ان سے کچھ ماہ کی مہلت طلب کی ہے۔۔۔ جاب میں تھوڑا مزید اسٹیبلش ہو جاؤں 'پھر ہی دیکھوں گا۔" وہ جلدی سے بولا تھا مبادا وہ اس کا رشتہ لے کر ہی نہ چل پڑیں 'دو تین دن کی سوچ بچار کے بعد آفس ہی کے ایک قابل اعتماد

دوست کو اس نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا 'جو کبھی اس کا کلاس فیلو بھی رہا تھا اور بائے چانس جاب بھی دونوں کو ایک ہی آفس میں ملی تھی۔

"رقیب میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں 'پر ممی بھی رقیب کا کردار ادا کرتی ہیں یہ آج پتا چلا ہے 'تو ایسا کر ساجن سے پہلے ساجن کی ممی کو رام کر اور مجھے تو یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ بھی لگتا ہے تیری 'ہونے والی ساس کا ورنہ مائیں محبت بھی کرتی ہیں 'لاڈ بھی کرتی ہیں 'پر ایسی صورت حال پہلی دفعہ سنی ہے۔" حسن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"یہ سب باتیں تو مجھے بھی پتا ہیں 'پر ان کا کوئی حل بھی تو ہو۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"اچھا تو ایسا کر۔" حسن نے کچھ سوچا پھر دھیرے دھیرے اسے کچھ بتاتا چلا گیا۔ وہ بھی پرسوچ انداز میں سر کو اثبات میں ہلانے لگا۔



"پتا ہے انشرح! مجھے چائے بہت پسند ہے 'پر تب تو بہت اچھا لگے گا جب تم خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلاؤ 'آنٹی کو کیسے منانا ہے یہ تم پر چھوڑتا ہوں۔" اس روز جب ممی ناشتا بنانے میں مصروف تھیں 'گھبرائی گھبرائی سی انشرح کو دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں بنا لوں گی سب۔۔۔ میں نے ممی کو بہت بار چائے بناتے ہوئے دیکھا ہے۔" وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"ممی آپ یہاں بیٹھیں۔۔۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" انہوں نے جیسے ہی ناشتے کے لوازمات لا کر رکھنا شروع کیے انشرح اپنی کرسی چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔

"کیا چاہیے مجھے بتاؤ بیٹا!" ممی بے چین ہو کر اس کے پیچھے چلی آئیں۔ علی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا جب اس نے سامنے موجود کچن میں انشرح کی آواز سنی۔

"ممی! آپ صرف پانچ منٹ کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔۔۔ پلیز۔" علی کی محبت نے اسے ممی سے محبت کرنا بھی سکھا دیا تھا وہ آکر ممی کو علی کے مقابل بٹھا کر چلی گئی۔

"آنٹی! آپ آرام سے ناشتا کریں 'انشرح ماشاءاللہ سمجھ دار ہے 'کالج کی اسٹوڈنٹ ہے 'آپ اسے ایک چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرنا چھوڑ دیں 'یوں ان میں

اعتماد آئے گا۔" وہ بار بار ہاتھ ملتی، بے چینی سے کچن کو دیکھتی ممی کو نرمی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"وہ کتنی بھی بڑی ہو جائے میرے لیے بچی ہی رہے گی۔۔۔ میں دیکھ آؤں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔۔۔ کچھ بنانے ہی نہ لگ جائے اسے تو برنر تک آن کرنا نہیں آتا۔"

خود سے بولتی وہ اٹھی ہی تھیں کہ انشرح کی زوردار چیخ پر ممی بے ساختہ زرد پڑ گئیں اور بے ساختہ کرسی کو تھام لیا۔ علی ہی فوراً" اٹھ کر کچن میں گیا تھا اس کے پیچھے ممی بھی آ گئی تھیں۔ انشرح اپنے بے تحاشا سرخ ہوتے ہاتھ کو تھامے جلن سے دوہری ہوئی جا رہی تھی، آنسو قطار در قطار اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

برنر بھی جل گیا تھا، چائے بھی اس نے بنا ہی لی تھی۔ پہلے کبھی بنائی نہیں تھی، بارہا ممی کو بناتا تو دیکھ چکی تھی۔ چائے بن جانے کی خوشی میں اسے دھیان نہیں رہا تھا کہ ابلتی چائے والے گرم برتن کو وہ بغیر کسی کپڑے کے پکڑ رہی ہے "نتیجتا" ہاتھ تو جلا سو جلا تھا، گرم چائے نیچے گر کر پاؤں بھی جھلسا گئی تھی۔

انشرح سے زیادہ ممی کی حالت خراب تھی جیسے اس کی تکلیف وہ اپنے وجود پر محسوس کر رہی ہوں۔ علی ہی انشرح کو بائیک پر بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ مرہم پٹی کروائی تھی۔۔۔ ممی اس دوران مصلیٰ بچھائے وظائف میں مصروف رہی تھیں۔

"کیوں تم کچن میں گئیں انشی۔۔۔؟ مجھ سے کہہ دیتیں بیٹا۔۔۔ میں کس لیے ہوں۔۔۔ دیکھا اب کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ گیا تمہیں میری جان۔" وہ بار بار اس کا ماتھا چومتیں۔ اس کے ہاتھ پکڑ لیتیں، علی کو چونکہ آفس کے لیے دیر ہو گئی تھی، سو وہ آنٹی کو کچھ کریمیں اور دوائیں جو ڈاکٹر نے دی تھیں، پکڑا کر بھاگم بھاگ آفس کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

"دیکھو انشرح۔۔۔ آنٹی تم سے بہت محبت کرتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اپنی محبت کی شدت میں انہوں نے بہت سی باتیں، بہت سی چیزیں نظر انداز کر دی ہیں، ویسے تو سر پڑنے پر ہر کوئی ذمہ داری سنبھال

ہی لیتا ہے خصوصاً لڑکیاں، لیکن لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری میں بھی ماہر ہونا چاہیے۔ پتا ہے میری ماں جی، جنہوں نے ایک ماں کی طرح ہی میری پرورش کی ہے، اپنے بیٹوں کے ساتھ مجھے بھی بتاتی تھیں کہ انسان کو کبھی کسی کام کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا تو بہت سی مشکلات سے بچا لیتا ہے انسان کو۔۔۔ ہم میں سے کوئی بحث بھی کرتا کہ ہم لڑکے ہیں تو ہم کیوں کوئی کام کریں "مثلاً" کبھی اکیلی ہونے کی بنا پر وہ ہم سے کچن کے یا گھر کے دیگر کسی کام کے لیے کہتیں تو، پتا ہے ان کا جواب کیا ہوتا۔۔۔ ہمارے نبی پاک آقائے دو جہاں جو اگر حکم کرتے تو کس کی مجال تھی جو ان کا حکم ٹال سکتی پر اپنے بہت سے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیے۔

پاکستان میں تو مرد اس بات کو عیب سمجھتے ہیں، پر بہت سے دوسرے ممالک ترقی یافتہ کی صف میں اس لیے بھی شامل ہیں کہ ہر انسان اپنا کام خود کرنے کا عادی ہے، پھر یوں ہوا کہ تعلیم کی مصروفیات کے باوجود ہم تینوں ماں جی کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتے۔ کام بھی جلدی ہو جاتا اور ہم ان کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے۔۔۔ میری ماں جی کی جب شادی ہوئی وہ تیرہ سال کی تھیں تم سے بھی سات سال چھوٹی، پر انہوں نے بہت چھوٹی سی عمر میں ایک بھرے پرے سسرال کی ذمہ داری بہت جلد سنبھال لی جس میں بیمار اور معذور سسر کی دیکھ بھال جیسی خدمت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ اپنے گھر میں بھی عادی تھیں اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا۔۔۔ کچن کے کام میں اپنی امی کا ہاتھ بٹانا، چھوٹے بہن بھائیوں کے ڈھیروں کام اور ذمہ داریاں سنبھالنے کا جو ہنر انہوں نے اپنے گھر میں سیکھا تھا، وہ ہنر ان کی سسرال میں کام آیا، اور آج بھی میری

ماں جی کا نام بہت عزت سے ان کی سسرال میں لیا جاتا ہے۔۔۔ میری ماں جی میرا آئیڈیل ہیں بہت سے حوالوں سے ان کا ایک سنہری قول تمہیں بتاؤں کہ وہ

کہتی ہیں گھرداری تو ایک عورت کا وہ گہنا ہے، جس کے بغیر وہ بالکل ادھوری ہے۔ تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہر کام، ہر بات میں اپنی ممی کی طرف دیکھنا چھوڑ دو اور خود میں اعتماد پیدا کرو۔ ان سے کام کروانے کے بجائے ان کی مدد کرو۔"

بہت سی باتیں اور بہت سے اقوال اس دن اسپتال سے واپسی پر اس نے انشرح کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی جس سے ذرہ برابر بھی اس کی شخصیت میں تبدیلی آسکتی اور مزے کی بات یہ تھی کہ انشرح نے انتہائی توجہ سے ان تمام باتوں کو سن کر دل میں اتارا تھا اور اس کا ان پر عمل کرنے کا ارادہ بھی تھا۔ علی نے بتایا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور جلد ہی مامی جی اور ماموں اس کا رشتہ لے کر ممی جی کے پاس آئیں گے پھر مامی کی پسندیدہ بہو بننے کے لیے اسے اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرنی ہوں گی جو ایک مشرقی لڑکی کا حسن ہیں اور انشرح کے چہرے کے کھلتے رنگ اسے یہ بتلا گئے تھے کہ منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔

پھر اس نے یہ سارا احوال جا کر حسن کو بتایا تھا۔

"واہ میرے شہزادے! میں نے تو تجھے ممی کو سمجھانے کے لیے کچھ ٹریکس بتائے تھے تو ڈائریکٹ لڑکی کی تربیت پر آگیا، بلکہ مشن امپاسیبل کو پاسیبل بنانے کے سلسلے میں پہلا کامیاب قدم بھی اٹھا لیا۔"

حسن نے جس انداز میں کہا تھا۔ علی ہنس دیا تھا۔

جبکہ اس سے پہلے وہ دل ہی دل میں خود کو بہت ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے انشرح کو چائے بنانے کو بھیجا کہ اسے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ یقیناً یہ تکلیف اسے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی، لیکن حسن کے مخصوص تسلی دینے والے انداز نے اسے خاصا مطمئن کر دیا تھا۔ تین چار دن تو انشرح کے زخم مندمل ہونے میں لگ گئے، اس دوران وہ ممی کی سخت قسم کی نگرانی میں رہی تھی اور یہ چار دن وہ پڑھنے بھی نہیں آئی بس ناشتے یا رات کے کھانے پر ہی اسے دیکھ کر تسلی کر لیا کرتا تھا۔

پر اس واقعے کے چھٹے دن انشرح نے اپنے کپڑے خود پریس کرنے کی کوشش کر کے یقیناً" ممی کے غضب کو آواز دی تھی، ہوا کچھ یوں تھا کہ اس بار اس نے ہاتھ تو نہیں جلایا تھا پر شرٹ کو جلا کر اس کا ستیاناس ضرور کر دیا تھا۔ اصل شرمندگی اسے علی کے سامنے ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں ہر کام مجھ سے غلط کیوں ہو رہا ہے۔" وہ یہ سوچ کر ہونٹ چبا رہی تھی، جبکہ ممی اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں کیا ضرورت ہے انشرح! تمہیں ہر کام میں دخل اندازی کرنے کی۔۔۔ کیوں کر رہی ہو ایسا بچے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" کہتے کہتے انہوں نے شدومد سے ناشتے میں مصروف علی پر بھی ایک مشکوک نظر ڈالی تھی۔

"تمہارے ہاتھ اور پاؤں کا زخم ابھی ہرا ہے اور تم نے استری فل پر کر کے کپڑے پر رکھ دی۔۔۔ میرا تو یہ سوچ کر جی ہول رہا ہے کہ اگر وہ گرم استری تمہارے ہاتھ کو لگ جاتی۔۔۔ اف میرے خدا! بس میں کہہ رہی ہوں آئندہ میں ایسی کوئی حماقت کرتے ہوئے تمہیں نہ دیکھوں۔۔۔ یہ ناشتا کرو اور آج بھی کالج جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھی ہے اپنی شکل کیسے زرد ہو رہی ہے۔۔۔ تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ باقی ہر کام کے لیے تمہاری ماں موجود ہے بیٹا۔" انہوں نے پہلے ذرا ترشی اور بعد میں بے بسی سے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا ممی۔۔۔ کام کرنے سے ہی آتا ہے نا۔۔۔ جب تک میں کام کروں گی نہیں تو مجھے کام کیسے آئے گا۔۔۔ سچ ممی جب کالج میں لڑکیاں باتیں کرتی ہیں اپنے گھر کے روزمرہ کے احوال بتاتی ہیں تو میں یہ جان کر حیران رہ جاتی ہوں کہ اسٹڈیز کے باوجود تقریباً" لڑکیاں کون سا ایسا کام ہے جو کرنا نہیں جانتیں اور پھر اس وقت شرمندہ بھی ہو جاتی ہوں جب وہ حیرانی کا اظہار کرتی ہیں کہ مجھے کچھ بھی کرنا نہیں آتا۔

پتا ہے لاسٹ منتھ ون ڈش پارٹی میں سب نے ہی

طے کیا کہ ہر لڑکی اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا کے لے آئے گی۔ پتا ہے میں نے اس دن چھٹی کیوں کی۔ کیوں کہ مجھے کچھ بنانا ہی نہیں آتا تھا۔" وہ منہ لٹکا کر بولی تھی۔ پہلے تو ممی حیران ہو کر اسے دیکھتی رہیں کہ ان کی انشرح اتنا بھی بول سکتی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ' پھر اچانک ہی بول اٹھی تھیں۔

"تو مجھے بتاتیں بیٹا! چھٹی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی میری جان! میں آپ کو آپ کی پسند کی کوئی ڈش بنا دیتی۔" وہ بے حد پیار سے بولیں۔

"کوئی بات نہیں آنٹی۔۔۔ یہ نارمل سی خواہشات ہیں جن کا اظہار انشرح کر رہی ہے۔۔۔ ہلکے پھلکے کام جو یہ کرنا چاہ رہی ہے وہ کرنے دیا کریں آپ اسے۔۔۔ آپ کی ہیلپ بھی ہو جائے گی اور انشرح کو کام کرنا بھی آجائے گا۔" علی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا تو بول اٹھا۔ ممی کو اگرچہ اس کی بات سے بہت اختلاف تھا پھر بھی کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں۔

"کل میری ماموں اور مامی جی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بہت سلام کہہ رہے تھے آپ کو اور جلد ہی آنے اور آپ سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ جواباً" اس نے انشرح کا سرخ پڑتا چہرہ بھی محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں ہاں بیٹا کیوں نہیں' ضرور تشریف لائیں ان کا اپنا گھر ہے۔" ممی نے بھی جواباً" خوش دلی کا مظاہرہ کیا کہ ماموں اور مامی جی کی آمد کا مقصد شاید سمجھی نہیں تھیں۔

"انشرح! آپ اپنے کمرے میں جا کر پڑھو بیٹا۔۔۔ کل کالج بھی جانا ہے۔" وہ رات کے کھانے کے بعد فارغ بیٹھے تھے جب ممی نے انشرح کو بہانے سے اٹھا دیا تھا۔

"بیٹا آپ میرے بچوں کی طرح ہیں تو اس لیے آپ سے ایک مسئلہ ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔" چند ہی لمحوں بعد جب انشرح اپنے کمرے میں جا چکی تو ممی نے بے حد جھجک کر کہا۔

"جی جی آنٹی۔۔۔ آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔۔۔ فرمائیے کیا بات ہے؟" وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں اس گھر میں بہت عرصے سے ہوں۔۔۔ شروع سے ہی اوپر والے پورشن میں جو لوگ رہائش پذیر تھے یقین مانو تو رشتہ داروں سے بڑھ کر ساتھ دیا انہوں نے میرا۔۔۔ بزرگ تھے جو اس گھر کے انہوں نے مجھے بیٹی کہا ہی نہیں سمجھا بھی' انشرح تو ان کو نانا کہتی تھی اور سمجھتی تھی جب تک وہ رہے مجھے کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوا۔۔۔ بجلی' فون' گیس کے بل سے لے کر پلمبر تک کو بلانے کا کام وہی کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دکانوں کا کرایہ بھی ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو لا کر میری ہتھیلی پر دھر دیتے۔۔۔ پھر مہینہ کا سودا سلف جب اپنے گھر کا لینے جاتے مجھ سے بھی لسٹ لے جاتے۔۔۔ طویل عرصہ ایسے ہی گزرا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ باہر کی دنیا کے کیا مسائل ہوتے ہیں۔ یا کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے' پھر آپ کے آنے سے دو ماہ پہلے ہی ان کا جو بیٹا بیرون ملک رہائش پذیر تھا اس نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنے پاس ہی بلوا بھیجا' وہ صاحب اپنی بیٹی کو لے کر بیٹے کے پاس چلے گئے۔۔۔ وہ اللہ بھلا کرے بھائی صاحب کا کہ تمہیں انہوں نے میرے پاس بھیجا تو اس بات کا یقین آگیا کہ میرا اللہ کسی بھی انسان کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔"

علی اس دوران منتظر نظروں سے ان کو دیکھتا رہا کہ اس سارے قصے میں پرابلم کہاں تھی' یہ سب تو ماموں اسے مختصراً" بتا چکے تھے۔

"مہینے کا سودا سلف تو بیٹا میں کسی نہ کسی طرح لے ہی آتی ہوں۔ باقی چھوٹے چھوٹے مسائل تو زندگی کا حصہ ہیں' لیکن کیا ہے کہ تینوں دکانوں کے دکاندار کرایہ دینے میں پس و پیش کر رہے ہیں میں تین بار پہلے بھی جا چکی ہوں ان کے پاس' اور دو بار ملازمہ جو صفائی کے لیے آتی ہے اسے بھی بھیج چکی ہوں' ہر بار کہ چکر پر ایک نئی تاریخ دے دیتے ہیں۔ شاید پتا چل گیا ہے ان کو کہ کسی مرد کا آسرا نہیں رہا' اب بے سہارا عورت ہوں اس لیے۔۔۔" ان کی آواز بھرا گئی

تھی۔

علی تو جیسے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ تو کرایہ ادا کر کے خود کو ہر ذمہ داری سے بری الذمہ سمجھتا تھا' یہ جانے بغیر کہ بظاہر زندہ دل اور خوش باش نظر آتی آنٹی کو کتنے مسائل درپیش تھے۔ سو وہ بے حد شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جتنا وہ اس کا خیال کرتی تھیں' اس لحاظ سے گھر کا واحد مرد وہی تھا' اسے خود ہی ان ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے تھا۔

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں آنٹی۔۔۔ خود ہی کہہ رہی ہیں آپ کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیا کرتا ہے۔ مجھے تو خود پر افسوس ہو رہا ہے کہ ایسی تمام نزاکتوں کا مجھے خیال کیوں نہیں آیا' آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں اور آئندہ کرایہ کا مسئلہ ہو' پلمبر کا یا بل کی ادائیگی' آپ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صرف ان دکانداروں کے نام مجھے بتا دیں' بس آگے میں جانوں اور میرا کام۔"

جس مضبوط لہجے میں اس نے کہا تھا اس سے ممی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کے بیشتر مسائل تو حل ہو جائیں گے کہ اللہ ایک در کے بند ہونے سے سو در اور کھول بھی دیتا ہے۔ کئی دنوں کی طاری پریشانی کو انہوں نے خود سے دور ہوتا محسوس کیا اور مطمئن ہو کر اٹھ گئیں۔ علی بھی اٹھ کر اپنے پورشن میں آ گیا تھا۔

محض تین دن ہی لگے تھے اسے ان تمام مسائل کو حل کرنے میں جن کے لیے ممی بے حد پریشان تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن علی تو علی' ممی بھی حیران رہ گئیں جب انشرح نے ان کے ہاتھ سے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

"پلیز ممی! مجھے بہت شرم آتی ہے آپ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے۔۔۔ میں بچی تو نہیں ہوں نا۔۔۔ ابھی آپ کو سارا ناشتا خود کر کے دکھاتی ہوں نا۔" اس نے صرف کہا ہی نہیں ممی کے ہاتھ میں پکڑا سلائس ہاتھ میں لے کر کھانا بھی شروع کر دیا۔

"انشی کیا ہو گیا ہے بیٹا! میں اگر آپ کو کھلاتی ہوں تو اس میں خوشی محسوس کرتی ہوں' ایسے سمجھ لو میری ممتا کی تسکین ہوتی ہے اس سے۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد گویا ہوئیں۔۔۔ علی کو اگرچہ اس پل ممی کے چہرے کی بے بسی دیکھ کر ترس ضرور آیا تھا' اس پل ان سے ہمدردی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

"اچھا آنٹی اب میں چلتا ہوں۔" ان ماں بیٹی کے بیچ دخل دیے بغیر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا' کیوں کہ وہ محسوس کرتا تھا بہت سی باتیں جو وہ دونوں ایک دوسرے سے کرنا چاہتی تھیں' محض اس کی وجہ سے خاموشی اختیار کر جایا کرتی تھیں۔

"اور ہاں ممی! آپ بے شک مجھے کالج وین تک چھوڑنے ضرور آیا کریں' لیکن ڈرائیور انکل اور لڑکیوں سے بحث مت کیا کریں کہ انشرح کو یہاں بٹھاؤ وہاں بٹھاؤ۔۔۔ گاڑی آہستہ چلانا۔۔۔ اس وقت تو سب چپ رہتے ہیں بعد میں ان ہی باتوں کی وجہ سے میرا مذاق بنتا ہے۔" جاتے جاتے جو کچھ علی کے کانوں میں پڑا تھا۔ اس نے اسے خاصا سکون دیا تھا کہ انشرح کی سوچ میں تبدیلی آنے کی دیر تھی کہ اسے اب بات کرنا اور پوری کروانا آتا جا رہا تھا۔ بس تھوڑے دن اور لگنے تھے پھر اس کی منزل دور نہیں تھی۔ لگتا ہے جلد ہی ماموں سے بات کرنی پڑے گی۔

پھر ایک دن جب کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے آنٹی علی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں۔ انشرح نے نہ صرف ممی کے اور اپنے کپڑے دھوئے تھے بلکہ دال چاول بھی بنا لیے۔۔۔ ممی تو لگتا تھا بے ہوش ہونے کو تھیں۔

"تت۔۔۔ تم کیوں گئیں کچن میں انشی! اگر کچھ ہو جاتا۔"

"ارے ممی! میری خوشی کو ضائع مت کریں پلیز اور

چکھ کرتا ئیں کہ کیسا بنا ہے کھانا' پانے میں یہ ترکیب ایک لڑکی سے کچھ دن پہلے ہی نوٹ کر کے لائی تھی' موقع کے انتظار میں تھی' آج آپ کے جاتے ہی میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور کچن میں آگئی' سب کچھ بہت ہی آسان تھا' پر ایک دو دفعہ فاطمہ کو فون کرنا پڑ گیا' اور سب ٹھیک ہو گیا۔ آپ کے پکائے سے کم اچھے لگ رہے ہیں چاول' لیکن پہلی دفعہ بنایا ہے تو ایسا ہی بننا تھا اگلی بار آپ دیکھیے گا۔" وہ خوشی خوشی ان کو پکڑ کر ٹیبل تک لے آئی۔

"پڑھائی میں تو بہت اچھی ہے انشرح' آنٹی! اگر گھر داری میں بھی اچھا ہونا چاہتی ہے تو آپ اسے مت ٹوکیں' بلکہ جب بھی کوئی کام کریں اس کے سامنے کریں اور اگر وہ کوئی کام کرے تو ایسا رویہ اختیار کرنے کے بجائے اس کی تعریف کریں۔" ممی دال چاول کھاتے بار بار انشرح کو دیکھتیں جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو کہ یہ سب اس نے کیا ہے' تاہم علی کی اس بات کے جواب میں وہ کچھ بولیں نہیں بس' پھیکا سا مسکرا دی تھیں۔

"کیا میں مامی کو بتادوں کہ ان کی ہونے والی بہو ایک سگھڑ لڑکی بننے کی تیاری کر رہی ہے۔" ایک دن موقع ملتے ہی اس نے دھیرے سے کہا تو وہ مسکرا کر سر جھکا گئی۔

پھر یوں ہوا کہ ممی نے اسے ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کر کے اتنی خوش دکھائی دیتی کہ انہیں اسے ٹوکنا مناسب نہ لگتا ہاں کچھ حد بندیاں ضرور لگائی تھیں انہوں نے کہ وہ صرف شام کی چائے بنائے گی' چھٹی والے دن کھانا بنانے میں ان کی مدد کروائے گی اور ایک احسان یہ بھی کیا تھا کہ اپنے کپڑے خود استری کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

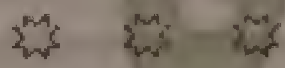
پھر ایک دن موسم بدلتے ہی ممی کو فلو اور زکام نے ایسا جکڑا کہ وہ شدید بخار کی زد میں آگئیں۔ نقاہت حد سے سوا تھی۔ انشرح کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے' وہ علی کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ ان کی دوائی' ناشتا' کھانا سب وہ خود دے رہی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ علی کچن کے کاموں میں اس کی مدد کرا دیا کرتا تھا کہ بہت کچھ سیکھ جانے کے باوجود ابھی بہت سے کاموں میں نابلد تھی وہ۔ کالج سے بھی اس نے تین دن کی چھٹیاں لی تھیں اس دن جب ممی کو بخار تو نہیں تھا' البتہ کمزوری وہ محسوس کر رہی تھیں۔ خود ہی آہستہ آہستہ چلتی ٹیبل تک آگئی تھیں۔

"ارے ممی آپ۔ اپنے کمرے میں لیٹیں نا۔ میں کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو لاتی ہوں۔" اپنی جھونک میں کچن سے نکلتی انشرح لپک کر ان کے پاس آئی۔

"بس بیٹا! لیٹ لیٹ کر برا حال ہو گیا میرا تو۔ یہیں بیٹھتی ہوں۔ علی کہاں ہے آج نیچے نہیں آیا؟ ناشتا نہیں کرنا اسے۔" اتنا سا بولنے میں سانس پھول گیا ان کا۔

"لیجیے جناب آنٹی جی! آپ نے علی کو یاد کیا اور علی حاضر ہے' یہ بتایے طبیعت کیسی ہے آپ کی۔"

وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ان کی طبیعت دریافت کرنے لگا' جبکہ دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر انشرح ایک بار پھر کچن کی طرف بڑھ گئی پھر ممی جی نے دیکھا کہ اس نے ان ہی کے انداز میں ناشتا بنایا اور ان دونوں کو سرو کیا تھا۔ پر اس بار انہیں اس پر غصہ نہیں، پیار آیا تھا۔



اسی شام جب علی واپس لوٹا تو ماموں جی اور مامی جی کی اچانک آمد اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ لپک کر ان سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ رات کو ماموں نے بڑے بھاؤ سے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو ممی جو ابھی تک خوش باش بیٹھی ان کے ساتھ بول ہنس رہی تھیں' ایک دم چپ کر گئیں۔ انشرح چائے بنانے میں مصروف تھی' جبکہ علی' ماموں کے اشارے پر ابھی اٹھ کر اوپر گیا تھا۔

"دیکھیے بھائی صاحب۔ یقین مانیں تو کچھ دنوں پہلے تک میرا انشرح کی شادی عمر بھر کرنے کا کوئی ارادہ

نہیں تھا کہ ساری عمر اپنی بیٹی کی حفاظت اور خدمت میں گزار دوں گی' پر اسے شادی جیسے برزخ میں نہیں دھکیلوں گی کہ میں نے اپنی بچی کو بہت لاڈوں سے زمانے کے گرم و سرد سے چھپا کر جیسے پالا ہے یا تو میں خود جانتی ہوں یا میرا خدا۔ پر اپنی اچانک بیماری پر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ اگرچہ معمولی سا بخار ہی تھا پر سوچ کو بدلنے کا محرک تو ایک نقطہ بھی بن سکتا ہے۔ رات اچانک ایک سوچ میرے ذہن میں در آئی کہ جس نے بقیہ کی ساری رات مجھے سونے نہیں دیا اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری بچی کا کیا ہوگا۔۔۔ کہاں جائے گی' کوئی سہارا تو ہو جینے کے لیے پھر مجھے اس کی شادی کا خیال آیا' جس نے اگرچہ کچھ دیر کے لیے میری سانسوں کو روک دیا۔ ہو سکتا ہے ہر ماں کی ایسی حالت نہ ہوتی ہو۔۔۔" مامی جی کے چہرے پر حیرت انگیز تاثرات دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"ہر والدین خصوصاً" مائیں اپنی اولاد سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں' لیکن ایک فرض ہے' ذمہ داری ہے پھر سب سے بڑھ کر حکم اللہ و رسول بھی تو ہے۔۔۔ بیٹیاں تو انبیاء کی بھی گھر نہیں بیٹھیں' پھر ہم جیسے ادنیٰ لوگ تو ان کے پیروں کی خاک بھی نہیں۔۔۔ بلکہ کچھ کام تو ایسے ہم پر فرض کر دیے گئے ہیں' جن میں تاخیر بھی گناہ کا باعث بنتی ہے' جن میں سے ایک حکم جوان ہونے کے بعد لڑکی کی شادی کر دینے کا ہے۔" ماموں جی آہستہ آہستہ بولتے چلے گئے۔ ممی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' لیکن انشرح کو چائے لاتا دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

"شکریہ بیٹا! ایسا کرو۔۔۔ علی کو دیکھو کہاں ہے اسے بھی چائے دے دو۔" ممی کے کہنے پر وہ اثبات میں سر ہلاتی واپس مڑ گئی تھی۔

"بولیے بہن آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔" مامی جی سے مزید صبر نہ ہو سکا تو ممی کو چپ دیکھ کر واپس اسی موضوع کی طرف لائیں کہ لاڈلے بیٹے کا آرڈر تھا کہ ممی کو قائل کر کے ہر صورت رشتہ یہیں جوڑا جائے۔

"آپ نے جو کچھ کہا سب ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ میں بھی اپنی بچی کو محفوظ ہاتھوں میں دے کر مرنا چاہوں گی' پر اس کے لیے میری ایک شرط ہے کہ علی کو گھر داماد بننا پڑے گا۔" اپنی بات کہہ کر وہ اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگیں۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ پہلے تو ایسا ممکن ہی نہیں ہے پھر اگر ہم مان بھی جائیں تو علی کبھی بھی نہیں مانے گا۔" مامی نے کچھ تیز لہجے میں کہا کہ ان کی باتیں انہیں اگر عجیب لگی تھیں تو شرط اس سے بھی عجیب تر تھی' تاہم ماموں جی نے آنکھ کے اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے بہن کہ شادی ہو جانے کے بعد آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں۔ رشتے میں آپ میری بہن تو ہیں ہی' انشرح کی طرف سے جن خدشات کا آپ کو اندیشہ ہے' بیٹی کو سامنے دیکھ کر وہ بھی نہیں رہیں گے۔" ماموں کے رسان سے کہنے پر مامی جی کے منہ کے زاویے بہرحال بگڑ گئے تھے کہ رشتے کی بھلے بہن تھیں' تھیں تو عورت نا اور حقیقی بہن بھی نہیں تھیں' وہ تو شکر ہوا کہ ممی جی نے یہ تجویز ماننے سے کھٹ انکار کر دیا تو مامی جی نے سکون کی سانس لی تھی۔

"نہیں بھائی صاحب ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے۔۔۔ آپ میرے انکار کو ہرگز بھی دل پر مت لیجیے گا' اسے میری بیٹی سے محبت کی شدت جانیں یا خود غرضی میں اپنی بیٹی کو اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتی' نہ ہی یہ گھر چھوڑ کر کہیں جا سکتی ہوں۔" ممی نے معذرتی لہجے میں کہا تو ان کی مجبوری جان کر ماموں چپ ہو گئے' البتہ مامی ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں' جیسے بمشکل خود کو بولنے سے باز رکھا ہو۔ کیوں کہ انشرح انہیں بے حد پسند آئی تھی پھر علی کا اصرار بھی تھا۔

"ٹھیک ہے بہن ہم سوچ کر علی سے مشورہ کر کے آپ کو بتا دیں گے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد ماموں نے معاملہ فہمی سے کہا کہ وہ اس بارے میں کچھ سوچنا چاہتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں علی کے پاس اوپر آ گئے تھے' حسب توقع ان کی بات سن کر علی بھتے سے

الجھ گیا۔

"یہ کیسی فضول قسم کی فرمائش ہے۔۔۔ اف یہ ممی بھی۔" وہ ہاتھ پر مکا مار کر بڑبڑایا۔

"گھر داماد میں بننا نہیں چاہتا اور انشرح سے دستبردار ہونا بھی ناممکن ہے میرے لیے 'بتایئے نا ماہی جی میں کیا کروں۔" بے بسی سے کہتا وہ ماہی جی کے مقابل آکر بیٹھا۔

"بچی تو ہمیں بھی بہت پسند آئی ہے بیٹا' لیکن اس کی ممی صاحبہ کی نامعقول قسم کی فرمائش کا کیا کریں۔"

"میری بات سنو علی! گھر تو تمہیں بسانا ہی ہے۔ بیوی کو بھی وہیں رکھتے جہاں تم رہتے ہو' مطلب جہاں تمہاری جاب ہے' ایسی صورت میں ایک بے ضرر عورت کے ساتھ رہنے میں کیسی قباحت۔۔۔ ہاں کچھ شرائط تم اپنی منوا لینا۔ اوپر والے پورشن کا کرایہ تو دیتے ہی ہو اب باقی کے اخراجات کا خرچ بھی تم خود اٹھانا کہ نہ تو تم خود کو ان کے زیر دست محسوس کرو نہ وہ کسی قسم کی احساس برتری کا شکار ہوں۔ باقی کبھی تم لوگ چکر لگا لیا کرنا کبھی ہم لوگ لگا لیا کریں گے۔ پھر اگر اپنے شہر واپس گھر آنے کا ارادہ ہے۔۔۔ تو اس سلسلے میں آہستہ آہستہ تمہیں اپنی بیوی کو رام کرنا پڑے گا وہ مان گئی تو اس کے لیے اپنی ماں کو منانا مشکل نہیں ہوگا' کیوں کہ وہ اپنی بیٹی سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں۔

میرے پاس تو یہی حل ہے اگر یہ منظور ہے تو بتادو ہم ابھی جاکے انشرح کو انگوٹھی پہنا کے شادی کی تاریخ لے لیتے ہیں' ویسے بھی اگلے ہفتے اس کے امتحان ہونے والے ہیں' امتحانوں کے بعد شادی رکھ لیں گے۔" ماموں جی نے نہ صرف حل پیش کیا بلکہ پورا پروگرام بھی سامنے رکھ دیا۔

"پر میں ایسے نہیں چاہتا نا ماموں۔۔۔ یا میں ایسے کرتا ہوں کوئی مکان کرائے پر دیکھتا ہوں پھر ممی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔" وہ اچانک پرجوش ہوا۔

"بات تو پھر بھی وہیں کی وہیں ہے وہ اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں نہ ہی کہیں جانے کو تیار ہیں' یہ آپشن میں پہلے ہی ان کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ ویسے اگر دیکھا جائے اپنے حساب سے وہ بھی ٹھیک ہی ہیں۔ ایک ہی بیٹی ہے اس کو کہیں بھیج کر وہ خود کیسے اکیلی رہ سکتی ہیں اور کہیں اور جاکر رہنا ان کی انا گوارا نہیں کرے گی خصوصا" وہ بھی ایسی خوددار عورت کے لیے جس نے ساری زندگی اپنے بل بوتے پر کسی کی مدد کے بغیر اپنی بچی کو پالا ہو۔"

"اور۔۔۔ اور میری انا؟ وہ کچھ نہیں آپ کی نظر میں۔" ماموں کی بات کے جواب میں وہ ناراضگی سے انہیں دیکھ کر بولا۔ ماموں نے اب ایک طرف خاموش بیٹھی ماہی جی کو اشارہ کیا کہ وہ بھی کچھ بولیں۔

"دیکھو علی۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہر انسان کو ہر چیز حسب منشا نہیں ملتی' یہاں لڑکی تمہیں بھی پسند ہے ہمیں بھی۔۔۔ تم ان کی ایک شرط مان کر اس گھر میں زندگی تو لازمی نہیں ان کی مرضی سے گزارو۔ اب اپنی بھابھیوں کو دیکھ لو۔ بیمار باپ ہے دونوں کا پندرہ دن وہ جاکر گزارتی ہے باپ کے گھر تو دوسری پندرہ دن ہمارے پاس رہتی ہے پھر جب پہلی واپس آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے۔ انسان کے ساتھ جڑے رشتے قربانیاں بھی مانگتے ہیں۔ آگے زندگی تمہاری اپنی ہے' فیصلہ بھی تم نے کرنا ہے۔ اگر دل مطمئن ہو تو جیسا چاہو گے ہمیں خوشی ہوگی۔ خوب اچھی طرح سے سوچ بچار کرلو پھر اپنے فیصلے سے ہمیں آگاہ کردینا۔" ماموں اور ماہی جی تو اپنی کہہ اور سن کر سو گئے تھے۔

وہ ساری رات سوچتا رہا تھا پھر فیصلہ انشرح کے حق میں ہی کیا تھا اس کے دل نے۔۔۔ اگرچہ دماغ درمیان میں آکر اپنے دلائل کے ساتھ کچھ نہ کچھ کہتا رہا تھا' لیکن جہاں بات محبت کی آجائے وہاں دل دماغ کو پچھاڑ کر ایک دم آگے آجاتا ہے۔

صبح ہی صبح واپسی کے لیے روانہ ہونے والے ماموں اور ماہی جی شام کو ہی واپس جاسکے تھے کہ اس کا فیصلہ سن کر انہوں نے ممی کو اپنی ہاں کا عندیہ دے کر انشرح کو انگوٹھی پہنائی تھی اور اس کے امتحانات کے بعد شادی کی تاریخ رکھنے کا کہہ کر لوٹ گئے تھے۔ پھر یہ

دن کیسے پر لگا کر اڑ گئے ان دونوں کو پتا ہی نہ چل سکا۔ تاہم علی نے کچھ باتیں اپنی ضرور ممی سے منوالی تھیں۔



انشرح کے پیپرز بھی ہو گئے اور شادی کا دن آن پہنچا۔ ماموں کی ساری فیملی پہنچ چکی تھی، نکاح کے وقت انشرح کی ہلکی سی سسکی پر ممی کی دھاڑیں نکلیں پھر وہ بے ہوش بھی ہو گئیں، اور تب سے لے کر ایک دن میں یہ تیسری بار کی بے ہوشی تھی جو ممی پر طاری ہوئی تھی، شادی کے پہلے ہی دن علی کو اپنے بال نوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ولیمے کے بعد ماموں اور ان کا خاندان لوٹ گئے تھے بلکہ ان لوگوں کو بھی آنے کی دعوت دے کر گئے تھے۔

علی نے نوٹ کیا تھا کہ شادی کی بات طے ہونے کے بعد ممی نے انشرح سے پہلے والا برتاؤ ایک بار پھر شروع کر دیا تھا۔ اوہ ناٹ اگین۔ وہ بھنا گیا۔ کہ شادی کی مصروفیات میں وہ اس سب کو نظر انداز کر گیا تھا۔

"ممی!" اس نے ناشتا بناتی ممی کو ہاتھ سے تھاما اور لا کر کرسی پر بٹھا دیا۔

"انشرح! کہاں ہو بھئی، کتنی غلط بات ہے اب یہ صرف تمہاری ممی نہیں میری بھی ہیں۔ اب ان سے کام کراؤ گی۔" انشرح کے کمرے سے باہر آتے ہی وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"بہت دن سے ہم ماں بیٹے نے تمہارے ہاتھ کا ناشتا نہیں کیا۔"

"میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گئی کہ علی کی خفگی کا سوچ کر اس کی جان پر بن آئی تھی، ویسے بھی ابھی پچھلی بار کی ناراضی پر اس نے مشکل سے اسے منایا تھا اس وعدہ پر کہ وہ اسے نظر انداز نہیں کرے گی۔

ممی! "ارے ارے سنو! علی بیٹا! انشرح!" کرتی رہ گئیں علی نے انہیں باتوں میں لگائے رکھا۔

"انشرح میری بچی!" اس کے آفس سدھار جانے کے بعد وہ لپک کر اس کے پاس آئیں۔

"وہ۔ وہ ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ... تم خوش تو ہو نا؟ یہ... یہ رکھو سب میں خود کر لوں گی۔" اسے ٹیبل سے برتن سمیٹتا دیکھ انہوں نے اس کے ہاتھ سے ڈش لے کر واپس ٹیبل پر رکھی اور خود اسے کرسی پر بٹھا کر بے چینی سے اس کے چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔ انشرح ماں کی اس قدر محبت پر مسکرا دی تھی۔

"آف کورس... بہت خوش ہوں ممی۔ بہت ہی خوش۔ علی جیسے مرد تو نصیب والیوں کا مقدر بنتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں بہت اچھے۔" جذب سے اس نے کہا تو اس دوران اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں نے ممی کو کچھ مطمئن کر دیا، شریفاں اس دوران آ کر کام کاج میں لگ گئی تھی۔

"شریفاں تم ایسا کرو۔ یہ صفائی مکمل کر کے یہ کچھ چیزیں لا دو... آج صاحب کی پسند کا کھانا میں خود بناؤں گی۔" انشرح کے کہنے کی دیر تھی کہ ممی فوراً اس کی مدد کو آئیں۔

"پاگل ہوئی ہو انشی! چھوٹے موٹے کام اگر تمہیں کرنے کی اجازت دی ہے میں نے تو صرف تمہاری خوشی کے لیے، یہ نہیں کہ پورا گھر ہی اپنے کندھوں پر اٹھا لو... بس رہنے دو یہ کھانا وانا بنانا... لوگ ہی کتنے ہیں ہم... تین۔ تو پہلے بھی میں بنا لیا کرتی تھی اب تو شریفاں بھی اچھی خاصی مدد کرا دیتی ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں، شاباش۔" وہ اسے کسی اگر مگر کی اجازت دیے بغیر ہاتھ پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گئیں اور اسے بیڈ پر بٹھا کر خود اس کی الماری کھول کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ لو یہ والا سوٹ پہنو اور مجھے اچھا سا تیار ہو کر دکھاؤ... ہاں زیور پہننا نہیں بھولنا۔" ساتھ ہی میچنگ جیولری بھی۔ انہوں نے خود ہی نکال کر دی۔ پھر جب پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر باہر آئی تو ممی نے خوب لپٹا لپٹا کر اسے پیار کیا اور بلائیں۔

"بس یہاں آؤ۔ بیٹھو اور میری بات سنو!" انہوں

نے اپنے بالکل پاس ہی اسے صوفے پر بٹھالیا۔
"جو باتیں میں آج تمہیں بتا رہی ہوں محض مفروضہ نہیں ہیں' بلکہ اپنے تجربات کی بنیاد پر بتا رہی ہوں۔" انشرح ان کے لہجے سے ٹھٹھک گئی' پر کچھ بھی بولے بغیر صرف ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"دیکھو انشرح! علی بھلے تم سے جتنی بھی محبت کرتا ہو' کبھی بھی مرد کو اتنا سر پر مت چڑھاؤ کہ وہ تمہارے سر پر چڑھ کر ناچنے لگے اور تمہیں پاؤں کی جوتی ہی بنا ڈالے۔ اس کی بات سنو ضرور' لیکن کرو وہی جو تمہارا دل چاہے۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم خود کو گھریلو کاموں میں خود زیادہ ہی انوالو کررہی ہو۔ ابھی سے خود کو اور اس کو جس روٹین کا عادی بناؤ گی ویسے ہی سب سیٹ ہوگا' خود کو دوسرے کی مرضی کے مطابق اتنا بھی مت ڈھالو کہ خود ہی گم ہو جاؤ۔ یاد ہے تمہیں ہوٹلنگ کا کتنا شوق تھا' پر میں نے ہمیشہ تمہاری یہ خواہش نظر انداز کی کہ اکیلی عورتیں ہیں ہم لوگ' تو اکیلی عورتوں کو زندگی پھونک پھونک کر گزارنا پڑتی ہے۔ اب ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہو۔ خوب گھومو پھرو۔ آؤ جاؤ اور ہاں سب سے بڑی اور اہم بات ابھی سے فیملی مت بنانے بیٹھ جانا' بہت عمر پڑی ہے ان الجھنوں کے لیے' ابھی صرف اسے اپنا بناؤ کہ بچے میں' اس کی مصروفیات میں گھری عورت کو مرد جلدی فراموش کردیتا ہے۔"
علی کی کال آنے پر ممی کے لیکچر کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔
"کیا کررہی تھیں؟"
"کچھ نہیں ویسے ہی ممی سے باتیں کررہی تھی۔
اچھا! پانچ دن کا دلہا اپنی دلہن کے فراق میں آفس میں بیٹھا آہیں بھر رہا ہے' کسی کام میں دل نہیں لگ رہا یار۔ ایک فائل اٹھائی ہے صبح سے اسی کا کام مکمل نہیں ہو رہا۔"
"وہ کیوں؟" اس نے اترا کر پوچھا۔
"وہ اس لیے کہ ہر صفحے' ہر سطر پر محترمہ انشرح مسکراتے ہوئے براجمان ہو جاتی ہیں۔" اس کا لہجہ اس قدر بے چارگی لیے ہوئے تھا کہ انشرح کھلکھلا کر ہنس دی۔
"اچھا سنو اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا۔ وہ بلیک وائٹ اسٹونز والا سوٹ پہن لینا۔ ڈنر باہر کریں گے اس کے بعد لانگ ڈرائیو۔"
"اوکے اور کوئی حکم۔" وہ مسکرائی۔
"وہ واپس آکر بتاؤں گا۔" کہتے ساتھ اس نے فون بند کردیا تھا۔ انشرح کتنی دیر علی کی خوب صورت باتوں میں کھوئی رہی' وہ تو ممی نے آکر بلایا کہ وہ کھانا کھالے آکر کیونکہ علی دوپہر کا کھانا وہیں آفس میں کھالیا کرتا تھا۔
"زبردست ممی۔ بہت ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں۔ میں نے ایک دو دفعہ کوشش کی ہے آپ جیسا بنانے کی پر ذائقہ تو ذائقہ' شکل میں بھی ویسا نہیں ہوتا جیسا آپ کے بنائے کھانے کا ہوتا ہے۔"
"تو تم بناؤ ہی کیوں؟ میری جان جس وقت جو چیز کہے گی ممی بنا دیں گی نا۔" انشرح ہمیشہ اتنی محبت پر مغرور ہو جایا کرتی تھی۔
شام تک کا وقت اس نے سو کر گزارا تھا' پھر گھڑی دیکھ کر وہ جلدی سے فریش ہو کر تیار ہونے لگی کہ علی کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔
"ارے یہ کیا انشی! یہ کیا پہن لیا تم نے۔ فوراً جاؤ اور اتار کر کوئی اور سوٹ پہنو۔ نئی نئی بیاہتا اور کلر دیکھو بلیک اوڑھ پہن کر کھڑی ہوگئی ہے' میں تو کالا رنگ بری میں بھی نہیں رکھنا چاہ رہی تھی۔ پر علی لے آیا تھا تو چپ ہوگئی تھی میں اس وقت' لیکن سوچ ضرور لیا تھا کہ آچکا ہے اب کچھ نہیں کہتی' لیکن پہننے نہیں دوں گی تمہیں' تمہیں نہیں پتا کہ یہ رنگ جب بھی تم نے پہنا' کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور کھڑا ہوا ایک بار سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گئیں' دوسری بار شدید بیمار ہوگئی تھیں۔"
ممی نے بولتے بولتے ہی خود اس کی وارڈ روب سے دوسرا سوٹ کھینچ کر اسے ڈریسنگ روم کی جانب ہاتھ پکڑ کر خود چھوڑ آئیں۔
"وہ ممی علی کو پسند۔" اس نے منمناتے ہوئے

ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ وہ یوں گویا ہوئیں۔
"وہ تو مرد ہے۔ مرد بھلا ایسی باتوں کی نزاکتوں کو کیا جانیں۔ اگر کبھی کہے بھی بلیک کلر کے لیے تو کہنا نہیں ہے پسند' بس جاؤ فورا"۔" انشرح نے ڈھیلے ہاتھوں سے ان کے ہاتھ میں پکڑا پنک کلر کا سوٹ پکڑا اور تبدیل کرنے چل دی۔
"وعلیکم السلام! بہت پیاری لگ رہی ہو' لیکن اگر یاد ہو تو ناچیز نے ایک فرمائش کی تھی اور خیالوں میں ویسے ہی دیکھتا آیا ہوں جناب کو۔" اس کے سلام کا جواب دے کر وہ اس کے قریب آکر بولا۔
"وہ علی! ایسا ہے کہ بلیک کلر مجھے پسند ہی نہیں ہے تو۔" اٹک اٹک کر کہی گئی اس بات نے علی کے مسکراتے لبوں کو سکیڑ دیا۔
"کوئی بات نہیں' یہ سوچ کر پہن لیتیں کہ میں نے کہا ہے' مجھے پسند ہے اور میں بہت ارمانوں سے صرف تمہیں تصور میں رکھ کر لایا تھا۔" اس کے نرمی سے کہنے پر انشرح بہت شرمندہ ہو گئی۔
"وہ علی!"
"اٹس او کے یار! کوئی بات نہیں جلدی سے اپنے نازک ہاتھوں کو تکلیف دے کر چائے بنایئے۔ بندہ فریش ہو کر ابھی حاضر ہوتا ہے۔" اس کے چہرے پر شرمندگی دیکھ کر وہ اس کے گال کو نرمی سے چھوتا واش روم کی جانب بڑھ گیا۔
کیا تھا جو ممی' علی کی خواہش پوری کرنے دیتیں مجھے' وہ ڈھیلے قدموں سے چلتی ہوئی کچن کی طرف جا ہی رہی تھی کہ ممی کے استفسار پر اس نے چائے کا کیا بتایا' ان کا موڈ بگڑ گیا۔
"اتنے اچھے کپڑوں اور میک اپ کے ساتھ تم کچن میں جاؤ گی؟ کوئی ضرورت نہیں ہے جاؤ' میں چائے بھجواتی ہوں۔"
"شریفاں!" دو ٹوک اس کو کہہ کر انہوں نے چائے بنانے کے لیے شریفاں کو آواز دی۔
"کیا ہوا؟ بیگم صاحبہ آپ کو چائے بنانے بھیجا تھا غالباً"۔" شیشے میں وہ بالوں کو کنگھی کر رہا تھا جب اس کے ابھرتے عکس کو دیکھ کر اس کی طرف مڑا۔
"وہ ممی نے کہا کہ وہ شریفاں کے ہاتھ بھجوا رہی ہیں کہ میں کیا اب بن سنور کر کچن میں جا کھڑی ہوں۔" انگلیاں چٹخاتے اس نے کہا تو علی کو اس پر بے اختیار پیار آگیا جو اس کے لیے اس کی مرضی کے لیے اپنے آپ کو بہت تبدیل کر چکی تھی۔ کر رہی تھی' بس یہ ممی درمیان میں دخل اندازی نہ کرتیں ہر کام' ہر بات میں تو وہ اس کو اپنی پسند میں ڈھال بھی چکا ہوتا' خیر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔
"اچھا بھئی یہ بتاؤ کہ دن کیسے گزرا کیا کیا آج کے دن؟" وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے صوفے تک لایا اور اپنے بالکل پاس بٹھا کر نرمی سے سوال کیا کہ انشرح کی جھجک اور شرم ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی' جبکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ہر وہ بات شیئر کرے جو اس کے دل میں ہے' جو وہ چاہتی ہے۔
شریفاں چائے لے آئی تھی۔ چائے پی کر جس وقت وہ دونوں باہر آئے' علی ابھی سامنے کھڑی ممی کو کہنے ہی والا تھا کہ وہ اور شریفاں کھانا کھالیں' وہ دونوں باہر جا کر کھائیں گے کہ ممی کی ہدایات سن کر ٹھٹھک کر رک گیا' جو وہ شریفاں کو دے رہی تھیں کہ وہ سب ڈنر کے لیے باہر جا رہے ہیں' وہ کھانا کھا کے دروازے وغیرہ لاک کر کے سو جائے وہ آٹومیٹک لاک سے خود ہی دروازہ کھول کر آجائیں گے اور جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔
"آنٹی آپ۔ آپ بھی چل رہی ہیں ہمارے ساتھ۔" وہ ہکلا کر بولا تھا کہ اپنی نصف بہتر کی طرف سے جواب سن کر اسی کی جانب مڑا جو اسی کے پیچھے آرہی تھی۔
"ہاں نا علی! امی بھی میرے بغیر اکیلی کہاں رہی ہیں گھر میں۔ میں نے ان کو کہا تھا چلنے کو۔" بے نیازی حد سے سوا تھی۔ اسے اپنے انتہائی فیصلے کی سنگینی کا احساس پہلی بار ہوا۔
"آنٹی جانا چاہتی ہیں تو ضرور چلیں مجھے خوشی ہو گی' لیکن اگر صرف تنہائی سے گھبرا کر چل رہی ہیں تو بھی

شریفاں کو فل ٹائم ڈیوٹی پر رکھا ہی اسی لیے ہے کہ ایسی کوئی پرابلم نہ ہو۔" امی نے آنٹی کو روکنے کی ایک کوشش کرنی چاہی۔

"پرابلم تو کوئی نہیں ہے۔ انشی کے ساتھ بہت دن ہو گئے باہر گئے' لیکن اگر تم نہیں چاہ رہے ہو تو میں رک جاتی ہوں۔" آنٹی نے کچھ تیز لہجے میں کہا تو انشرح بجلی کی تیزی سے ماں کی طرف آگئی۔

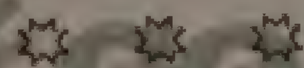
"ارے ممی یہ کیوں ناراض ہوں گے' یہ تو آپ کے آرام کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔"

"چلیں نا۔ میں باہر ہوں آجائیں آپ لوگ۔"

وہ ماں بیٹی کی محبت سے بے زار ہوتا باہر کی جانب چل دیا کہ ایک تو اس ماحول اور محبت کے مظاہرے کو مزید برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی' پھر اب باہر نکل کر کوئی ٹیکسی دیکھنی تھی کہ پہلے تو اس کا انشرح کو اپنی بائیک پر لے جانے کا ارادہ تھا۔

"ممی اور بیٹی دونوں ہی پاگل ہیں غالباً؟" وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا ان دونوں کا انتظار کرنے لگا' پھر انہوں نے صرف کھانا ہی کھایا تھا اور باتیں بھی برائے نام ہی کی تھیں کہ ممی کے سامنے چاہ کر بھی اپنی نئی نویلی دلہن کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لانگ ڈرائیو کا پروگرام ملتوی کرتے وہ گھر آگئے تھے۔ سب سے زیادہ کوفت علی کو اس وقت اٹھانی پڑتی' جب رات کو کم از کم دو دفعہ ممی صاحبہ' لاڈلی بیٹی کی خیریت دریافت کرنے تشریف لے آتیں' کبھی ان کا دل گھبرا جاتا تو کبھی وہ کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ کر دوڑی آتیں۔

پہلے دن اور پہلی دفعہ تو ایسی ہی صورت حال پر وہ خود دروازہ کھولنے آیا تھا کہ شدید قسم کی دستک پر وہ دونوں ہی پریشان ہو کر نیند سے اٹھ گئے تھے' لیکن اب دستک سن کر علی جاگ بھی رہا ہوتا تو کروٹ بدل کر نیند میں ہونے کی ایکٹنگ کرتا کہ اسے پتا تھا۔ ایسی غیر مناسب حرکت پر یہ نہ ہو اس کے منہ سے کچھ الٹا سیدھا ممی کی شان میں نکل جائے اور ممی تو ممی' بیگم صاحبہ کی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑے۔



اس کے دفتر کے جن لوگوں نے گھر میں یا ہوٹل میں اس کی دعوت کی تھی' ممی تب بھی ان کے ساتھ گئی تھیں اور وہاں انہوں نے اگر انشرح کو اپنے ہاتھ سے کھلایا نہیں تھا تو اس سے کم بھی نہیں کیا تھا' انشرح کی ناز برداری میں اس حد تک بڑھ جاتیں کہ علی خواہ مخواہ ہی کوفت محسوس کرتا رہتا' ایک دو دوستوں نے تو مذاق مذاق میں ایک' دو باتیں بھی سنائیں۔ اب ایک بار پھر وہ اپنا مسئلہ لے کر حسن کے سامنے حاضر تھا۔

"یار عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب تو ممی نام سے نفرت ہو گئی ہے مجھے۔ ممی نہیں ایک مستقل عذاب ہے' جو میں نے اپنے سر مول لے لیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی زندگی میں حد درجہ انوالوڈ تھیں' پر اب انہیں خود سمجھنا چاہیے کہ شادی شدہ زندگی کے الگ ہی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان کی بیٹی میرڈ ہے۔ صبح صبح آکر وہ اپنی بیٹی کے کپڑے نکالیں گی۔ کپڑا' کلر' ہر چیز ان کی پسند کی ہوتی ہے۔ میں کچھ کہہ دوں تو ممی کی لاڈلی کا منہ اتر جاتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا جاؤں تو کہاں جاؤں۔" وہ ایک ساتھ پانی کے دو گلاس چڑھا گیا۔

"کول ڈاؤن یار۔ دنیا میں کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل نہ ہو۔" پہلے پہل تو حسن اس کی روداد سن کر بے تحاشا ہنسا تھا' پھر اس کے چہرے پر حقیقی بے چارگی دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں تو بتا نا حل۔" وہ اسے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

"آہستہ یار۔ میں تیرا دوست ہوں ممی نہیں' جو غصہ مجھ پر اتار رہا ہے۔ تیری بیوی اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔ دیکھ تو کچھ کہے گا تو تیری بات کو محسوس بھی کر سکتی ہیں' پر اولاد کی بات کوئی بھی ماں باپ محسوس نہیں کرتے۔ تو بھابھی کو آہستہ آہستہ سمجھا۔ وہی باتوں باتوں میں ممی کو احساس دلائیں کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور اس کی شادی شدہ زندگی میں ان کی حد درجہ دخل اندازی بہت سے مسائل کو جنم دے سکتی ہے۔"

"او بھائی میرے' بات تو یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے کہ میری بیوی میری اگر ہر بات مانتی ہے تو ماں کی حکم عدولی

کو گناہ سمجھتی ہے۔ ان کے ماتھے کی ایک شکن اس کی راتوں کی نیند اڑا دیتی ہے' میں کچھ کہتا ہوں۔ ممی کچھ کہتی ہیں' ناتی دونوں کی ہے' پر جہاں ہمارے نظریات ٹکرا جائیں وہ ہراساں ہو جاتی ہے۔ مجبوراً مجھے ہی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے۔" اس کا مسئلہ واقعی سیریس تھا۔ وہ بہت دیر بیٹھے رہے' پر کوئی حل سمجھ نہیں آیا' لیکن یہ تھا کہ علی جب حسن کے پاس سے اٹھا اس کے کشیدہ اعصاب آج نارمل تھے۔

اس دن کے بعد اس نے اپنا ہنی مون پروگرام خود ہی کینسل کر دیا کہ ممی کا کچھ بھروسہ نہیں تھا ساتھ ہی چل دیتیں۔

"تیری ممی کا بندوبست ہو گیا' سمجھو۔" اگلے دن حسن اس کے پاس آکر بولا۔

"کیا مطلب؟" اس نے کمپیوٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"مطلب یہ کہ میرے انکل اس شہر کے ایک جانے مانے سائیکاٹرسٹ ہیں' کل بالکل اچانک ہی ان سے ملاقات ہو گئی تو باتوں باتوں میں تمہارا مسئلہ بیان کرنے کی دیر تھی کہ انہوں نے کہا یہ تو کچھ بھی نہیں وہ تو ایسے ایسے مریضوں کو ٹھیک کر چکے ہیں جنہیں ان کے گھر والے لاعلاج قرار دے کر ان کے حال پر چھوڑ چکے تھے۔

تمہاری ساری بات سے تو میں بھی متفق ہوں بلکہ مجھے تو بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے ان کی شخصیت میں کہ ایسی شدت پسندی ہے ان کی ذات میں۔"

"ان کو تو کوئی مسئلہ' کوئی بیماری ہی نہیں کہ جس کا بہانہ بنا کر میں ان کو انکل کے پاس لے جاؤں اور ڈاکٹرز سے تو ویسے ہی ان کی جان جاتی ہے۔" وہ کچھ مایوسی سے بولا۔

"اچھا چل تو پریشان نہیں ہو۔ اس کا بھی کوئی حل نکالتا ہوں۔" حسن نے کچھ سوچ کر کہا۔

☼ ☼ ☼

"انشرح! میں نے یہ والی میچنگ شرٹ استری کرنے کو کہا۔ یہ کون سی کر دی تم نے۔" وہ وارڈ روب کھنگال کر بولا تو انشرح اس کی مدد کو آئی۔

"لائیں میں یہ کر دیتی ہوں۔" وہ کہتی باہر چلی گئی۔

وہ جو بھی کام انشرح کو کہتا ممی پہلے تو خود کرنے کی کوشش کرتیں ورنہ شریفاں سے کروا دیتیں' جبکہ انشرح اس کا کوئی بھی کام اپنے ہاتھوں سے کرے' یہ احساس اسے خوشی دیتا تھا اور یہی ہوا وہ صرف یہی دیکھنے باہر چلا آیا کہ انشرح کو خود بھی احساس ہوتا ہے یا وہ بھی ذمہ داری سے جان چھڑا لیتی ہے۔

"شریفاں کو تو میں نے ایک کام سے باہر بھیجا ہے۔ لاؤ میں کر دیتی ہوں۔ تمہیں کہاں آتے ہیں کپڑے استری کرنے۔" اخبار کا مطالعہ کرتی ممی اٹھ کے آئیں اور شرٹ انشرح کے ہاتھ سے لے لی۔

"جب تک یہ کوئی کام کرے گی نہیں تو آئے گا کیسے آنٹی! لائیے میں خود ہی کر لیتا ہوں۔" خاموش کھڑی انشرح پر ایک ناراض سی نظر ڈال کر وہ ان کے ہاتھ سے شرٹ لے کر فوراً" ہی اندر چلا گیا۔

"ممی میرے خیال میں علی ناراض ہو گئے ہیں۔" انشرح ہراساں ہو کر بولی۔

"ارے جاؤ بھی انشی! یہ مرد ایسے ہی ایٹی ٹیوڈ دکھاتے ہیں عورتوں کو نیچا دکھانے کو۔ اسے اس بات سے کیا سروکار کہ کام کس کے ہاتھ سے ہو رہا ہے' اسے تو ہر چیز وقت پر مل رہی ہے نا' لیکن تم کیا جانو مردوں کی فطرت' عورتوں کو پاؤں کی جوتی بنا کے رکھنے میں ہی انا کی تسکین ہوتی ہے۔"

غصے میں وہ بغیر ناشتے کے ہی گیا تھا اس دن اور دن میں تین چار بار کال کر کے انشرح کا حال احوال پوچھنے والے علی نے ایک دفعہ بھی نہ تو کال کی' نہ کوئی میسج کیا' وہ سارا دن بے کل' بے کل سی پھرتی رہی۔ اوپر سے ممی کے فرمودات الگ اسے بے زار کرتے رہے۔

شام کو ابھی علی نے آکر کپڑے ہی تبدیل کیے تھے کہ حسن کسی مہمان کو لے کر ساتھ چلا آیا۔ علی کو خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ بہت زیادہ دوستی کے باوجود

حسن کبھی ان کے گھر نہیں آیا تھا' ہاں وہ ایک آدھ بار ان کے ہاں جا چکا تھا' بلکہ حسن نے تو ان کی ہوٹل میں دعوت بھی کی تھی' جس میں انشرح اور علی کے ساتھ ممی بھی شریک ہوئی تھیں۔

"حسن کی زبانی سنا تھا کہ کیسے آپ نے تنہا ہو کر ایک بچی کے ساتھ دنیا میں سروائیو کیا۔" چائے پینے کے دوران ہی وہ اچانک خاموش بیٹھی ممی سے مخاطب ہوئے۔ جہاں انشرح ہوتی تو یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ممی وہاں نہ ہوتیں۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔

"میں رشتے میں حسن کا انکل ہوتا ہوں' لیکن یہ مجھے اپنے والد کی طرح مانتا اور عزت دیتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ میرا بیٹا ہے۔ علی کا بیسٹ فرینڈ ہونے کے ناطے اس نے مجھے بتایا تھا آپ کے بارے میں۔ یوں سمجھیں غائبانہ تعارف رکھتا ہوں میں آپ لوگوں کا۔" وہ ایک سائیکالوجسٹ تھے' اور جانتے تھے کہ کہاں' کیسے' کس طرح اور کیسی بات کرنی ہے' اکثر مریض ان کے پاس لائے جاتے' پر کچھ پیچیدہ مریض ایسے بھی ہوتے جو خود کو بیمار سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے' ایسے میں اگر ضرورت پڑتی تو ان کو خود بھی جانا پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔ حسن نے ایک دو بار سرسری ان سے ذکر کیا تھا علی کی ممی کا' انہوں نے کہا تھا وہ ایسے کیسے کسی پیشنٹ کو ملے اور دیکھے بغیر کچھ کہہ سکتے ہیں' پر اس بار حسن پوری سنجیدگی کے ساتھ ان کے پاس آیا تھا کہ علی منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار ہے' وہ کوئی حل نکالیں' ورنہ ان کی ازدواجی زندگی ہمیشہ اسی تناؤ کا شکار رہے گی۔

اس کا کہنا تھا کہ علی کی ساس ایک ایسی ہی مریضہ ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیٹی کی زندگی کو ڈسٹرب کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ پھر اپنے شیڈول سے فارغ وقت دیکھ کر انہوں نے حسن کو ایک تاریخ دے دی تھی۔

"میں خواتین کی بہبود کے لیے کام کرنے والی ایک کمیٹی سے بھی منسلک ہوں میڈم۔ بہت سا کام کیا ہے ہم نے مظلوم خواتین کی فلاح کے حوالے سے بہت سے منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ آپ جیسی بہادر اور باہمت خاتون اگر ہماری کمیٹی سے منسلک ہو جائے تو ہمارے ادارہ کی خوش نصیبی ہو گی۔ دیکھیے نا بہت سی خواتین جو کسی مسئلے کی وجہ سے اکیلی رہ جاتی ہیں۔ ماں باپ نہ ہونے کی وجہ سے' شوہر کی طلاق یا شوہر کی خدانخواستہ ڈیتھ کے بعد یہ معاشرہ ایسی خواتین کے لیے کوئی جگہ یا مقام نہیں رکھتا' نتیجتاً" وہ ہمت ہار کر زندگی کے تلخ حقائق کی نظر ہو جاتی ہیں۔ آپ جیسی خواتین کو ہم ان خواتین کے لیے رول ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں' میں نہیں جانتا کہ آپ کیوں تنہا ہیں اب تک۔ آپ کی فیملی کہاں ہے' لیکن جس ہمت اور حوصلے سے آپ نے اپنی بچی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا' اپنے کردار کی حفاظت کے ساتھ وہ قابل تحسین ہے۔"

وہ اپنے شعبے میں ایک ماہر ڈاکٹر تسلیم کیے جاتے تھے اور اس کا ثبوت آج انہوں نے آدھے پونے گھنٹے کی اس میٹنگ میں دے دیا تھا۔ ان کے آنے کے بعد سے ایک طرف بیٹھی ممی ان کے جانے کے بعد ان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یتیم اور بے سہارا عورتوں کے ادارہ والی بات بھی غلط نہیں کی تھی' یہ ادارہ ان ہی کا قائم کردہ تھا تاہم اس کی ایڈمنسٹریشن کے لیے انہوں نے قابل بھروسہ لوگ رکھے ہوئے تھے کہ ان کی بے تحاشا مصروفیات انہیں فل ٹائم اس ادارہ کی دیکھ بھال کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

پھر اگلی بار ڈاکٹر صاحب اپنے ادارہ کے کچھ پمفلٹس اور تصاویر کے ہمراہ اکیلے ہی حاضر ہوئے تھے' اس بار حسن ان کے ہمراہ نہیں تھا اور حسن کی حسب ہدایت علی نے انشرح کو بھی وہاں سے ہٹا دیا تھا کہ وہ دونوں مل کر کچن میں شریفاں کی ہیلپ کرا سکیں۔ ممی کسی عقیدت مند کی طرح انہیں سنے جا رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار شاید انشرح ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور انہیں احساس تک نہ ہو سکا تھا۔ ممی نے باقاعدہ ممبر شپ کارڈ پر سائن کر دیے اور ہفتے میں

ایک دفعہ اس پروگرام میں شرکت کی حامی بھی بھری' جو ادارہ میں بے سہارا خواتین کے لیے منعقد کیا جاتا تھا۔ پھر علی کے لیے وہ دن گویا عید کا دن تھا' جب ممی کو وہ اس ادارہ میں چھوڑ کر آیا تھا۔

ممی نے تو انشرح کو بھی ساتھ لے جانے پر خاص زور دیا تھا' پر علی نے رات کو ہی انشرح کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ ممی اسے لے جانے کی ضرور کوشش کریں گی تاہم اس نے ہرگز بھی جانے کی حامی نہیں بھرنی۔

"نہیں ممی میں نہیں جارہی۔ اصل میں رات نیند پوری نہیں ہوئی تو دن کو تھوڑا ریسٹ کا ارادہ ہے میرا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ نیند کیوں پوری نہیں ہوئی؟ کیا ہوا میری جان؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

اف یہ ممی اور ان کی بیٹی۔ میری جان لے کر چھوڑیں گی۔ اس نے دل میں بے حد کوفت محسوس کرتے ہوئے اپنی نازک سی بیوی کو دیکھا' جو اب ممی کو اپنی طبیعت کی طرف سے خوب تسلیاں کرا رہی تھی' مبادا وہ جانے کا ارادہ ہی نہ ملتوی کردیں۔

"ارے آنٹی بے فکر رہیں۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے ہی آفس جاؤں گا' پھر ہاف لیو لے کر آجاؤں گا۔ انشرح کی طرف سے بے فکر رہیں پھر شریفاں تو ہے ہی نا۔" لہجے میں شہد بھرتے اس نے کہا تو اسے اور شریفاں کو ہزار ہدایات انشرح کے حوالے سے دیتی — وہ علی کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

علی کا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ ممی کے سخت آرڈرز کے باعث وہ کبھی اپنی شادی شدہ زندگی کی چھوٹی موٹی خوشیوں کو محسوس ہی نہیں کرپایا تھا کہ ممی جی ایک ننگی تلوار کی مانند ہر پل لٹکتی دکھائی دیتیں۔ ہاف لیو کا تو اس نے ممی کو کہا تھا' ورنہ اس کا ارادہ آج پورا دن بھرپور طریقے سے انشرح کے ساتھ گزارنے کا تھا۔ اس نے حسن کو بھی فون کرکے آفس میں اپنا کام سنبھال لینے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

ممی نے خود کو بہت دنوں بعد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا کسی بھی ذمہ داری کے احساس کے بغیر۔ وہ بہت سی عورتوں سے ملیں۔ انہیں بھرپور تسلی دیتے ہوئے اپنی ہر قسم کی مدد اور تعاون کا بھی یقین دلایا۔ وہ ادارہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ بڑا اور منظم تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو پروگرام میں شریک دیکھ کر انہیں خوش گوار سی حیرت ہوئی' اور ان کی طرف سے دیا گیا پچاس ہزار کا چیک ڈاکٹر صاحب کو حقیقی خوشی دے گیا کہ وہ خالی خولی دعوے کرنے والی خاتون نہیں تھیں' بلکہ اپنے دل میں انسانیت کا درد بھی رکھتی تھیں۔

وہ علی کو فون کرنے کا ارادہ کررہی تھیں کہ انہیں آکر لے جائے کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری بخوشی اٹھالی۔

"اب آپ آہی گئی ہیں تو میرے چھوٹے سے کلینک کو بھی تشریف آوری کا شرف بخشتی جایئے۔" ڈاکٹر صاحب باتوں باتوں میں انہیں بتا چکے تھے کہ وہ مسیحائی کی فیلڈ سے منسلک ہیں تاہم ان کا طریقہ کار عام ڈاکٹرز سے مختلف ہے۔

"دو مرلے کے اس چھوٹے سے گھر میں جہاں آٹھ بچے پہلے ہی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے' ہرگز ایک اور بچی کی آمد کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا' پر قدرت کو جس روح کو دنیا میں بھیجنا ہوتا ہے وہ بھیج ہی دیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے دو کمروں پر مشتمل اس گھر میں جب میں پیدا ہوئی تو میرے والدین کو ہرگز میری ضرورت نہیں تھی کہ وہ غریب لوگ تو پہلے سے موجود آٹھ جانوں کے پیٹ کا ایندھن پورا کرنے کی تگ و دو میں بری طرح سے مصروف تھے۔"

ڈاکٹر صاحب کا ان کو یہاں لانے کا مقصد ہی ان کی ذات کی ان گرہوں کو سلجھانا تھا جو الجھی ہونے کے باعث کئی لوگوں کے لیے آزار کا باعث بن رہی تھیں' سو باتوں ہی باتوں میں اپنے مخصوص طریقے سے اپنی ذات کے بند دروازے کھولنے کے لیے کمک فراہم کی اور وہ کسی تنویمی کیفیت میں بولتی چلی گئیں۔

"لاڈ' پیار' محبت' فرمائشیں سب بھرے پیٹ کے

جو نچلے ہیں، جہاں لوگ دو چھوڑ ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہوں، وہاں بھوک ہی سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آسکی تھی کہ میں زندہ کیسے رہ گئی تھی؟ کہ آکسیجن کی فراہمی ہی مجھ تک آسانی سے ممکن ہو پاتی تھی، ورنہ ڈاکٹر صاحب آپ یقین بھی نہیں کریں گے میری بڑی بہن بتاتی تھیں کہ چار ماہ تک میری ماں کے پاس مجھے پہنانے کے لیے کپڑے تک موجود نہیں تھے ان چاہی وہ نومولود کسی میلے کپڑے میں لپٹی ایک طرف لیٹی انگوٹھا چوستی رہتی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے نا آٹھوں پہر میں کوئی ایک پل فراغت کا میسر ہونے پر بھوکی بچی کو چھاتی سے لپٹا کر اس کی بھوک کا مداوا کرہی دیا کرتی تھی۔ ایک سال کی عمر تک یہی رابطہ میری ماں کا، مجھ سے واحد واسطہ تھا، پھر کھانے کے لیے جو کچھ بھی نصیب ہوتا۔ مٹھی بھر چاول یا تین چار روٹیوں میں سے کوئی بڑی بہن ایک آدھ نوالہ میرے پیٹ کا نصیب بنا ہی دیا کرتی تھی۔ کچی بستی میں رہنے والے ان مکینوں کے لیے بھوک ہی ان کا مسئلہ تھا، بھوک ہی تعلیم اور بھوک ہی رواج۔

پانچ سال کا ہونے پر میں نے گھر میں کچھ آسانی دیکھی کہ میری بڑی بہن کو محض چند ٹکوں کے عوض بڑے شہر کی ایک بڑی فیملی اپنی کسی بیمار بزرگ کی خدمت کے لیے لے گئی پھر میرے ماں باپ کو بیٹی کی کبھی یاد نہ آئی، بلکہ ہر مہینے اس کی خدمت کا معقول معاوضہ ہی بیٹی کی محبت پر پردہ ڈال دیتا۔ دوسرے اور تیسرے نمبر کے بھائی موٹر مکینک کے پاس بٹھا دیے گئے۔ پھر یہ ہوا کہ میرے ماں باپ کو اپنے بچوں کو بیچ کر کمانے کی بری لت نے گھیر لیا۔ بڑی بیٹی کو ملازمت کے نام پر بیچا تھا انہوں نے پھر بعد کی بیٹیوں کو شادی کے نام پر بیچتے چلے گئے۔ ان ہی دنوں بڑی کی طرف سے پیسے آنے بند ہوگئے۔ اماں ابا پریشان تو ہوئے پر بیٹی کے لیے نہیں پیسے کے لیے۔ بہتیرے فون کیے ابا تو ایک دو چکر بھی ان کے گھر کا لگا آیا تھا۔ نہ وہ گھر وہاں پر تھا نہ مکین وہی تھے پتا چلا کہ چند ماہ قبل ہی یہ فیملی گھر بیچ باچ کر غیر ملک سیٹل ہوگئے تھے۔ ہمارا واسطہ یا تعلق اپنے ماں باپ سے ایک اولاد والدین کا نہیں تھا، دکاندار اور مال کا سا تھا۔

بھائی دونوں آوارہ چرسی ہوگئے تھے۔ وہ بھی اب اس گھناؤنے کھیل میں ماں باپ کے برابر کے شریک تھے، جو بیٹیوں کے بیوپار کا تھا۔ پہلی بیٹی کو ماں باپ کا لالچ نجانے کہاں لے گیا تھا کہ چوتھے نمبر والی کی اچانک موت کا پتا چلا۔ آج تک یہ معمہ حل نہیں ہوسکا کہ تین ماہ کی وہ بیاہی، خود جھلس کر مرگئی کہ غریب ہونے کی وجہ سے اسے مار دیا گیا۔ شادی، گھر، مرد، سسرال میرے لیے ایسی بڑی بڑی عفریت کے نام تھے جو لوگوں کو زندہ نگل جاتے ہیں۔ پھر ایک دن مجھ سے بڑی گھر سے اچانک ہی چلی گئی تھی کہ اس کا جو سودا میرے ماں باپ نے کیا تھا شاید وہ اسے منظور نہ تھا کہ وہ تیرہ برس کی معصوم بچی اور وہ ستر سالہ تین بیویاں بھگتا چکا ایک گھاگ مرد۔"

اذیت کی یہ داستان سناتے سناتے ہی ممی کی حالت غیر ہونے لگی وہ گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب سمجھتے تھے مریض کی ایسی حالت کو کہ اپنی ذات کی کھوج کے سفر میں انسان یونہی نڈھال ہوجایا کرتا ہے۔ انہوں نے انہیں پانی پلایا تھا۔

"پھر میں تھی، جس کو اپنے نام کی صحیح پہچان ہی نہ تھی کہ نویں ان چاہے بچے کا کون نام رکھتا ہے، بس پیدائش کے تیسرے دن کسی نے منی بلایا تو بارہ سال تک منی ہی رہی۔ پھر منی کی باری بھی آہی گئی تھی۔ ماں، باپ، بھائی اس کی اور اپنی قسمت پر رشک کررہے تھے کہ اسے خریدنے والا کوئی عام شخص نہ تھا۔ اچھا خاصا امیر تھا، پر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اس کی امارت اس کی اپنی محنت کا شاخسانہ نہیں بلکہ اس کی بیوی کی ——— ماں باپ کی طرف سے دی گئی مارکیٹ میں تین چلتی ہوئی دکانیں تھیں۔ اس کی بیوی کی ہی خواہش تھی کہ صرف اولاد کے لیے نکاح کا ڈرامہ رچانے کے لیے کوئی میرے جیسی غریب اور مسکین لڑکی ہی ڈھونڈی جائے جس کو فارغ کرنے کے

بعد کوئی ولی وارث پوچھ گچھ کرتا نہ آن پہنچے میں ان کی مطلوبہ خصوصیات پر بدرجہ اتم پوری اتری اور قرعہ فال میرے نام نکل آیا۔ میرا نام نہاد شوہر ایک جہنم سے نکال کر مجھے دوسرے برزخ میں لے گیا جہاں میرا مقام ایک فل ٹائم ملازمہ کا ٹھہرا تھا کہ میرے جاتے ہی ایک جز وقتی ایک کل وقتی ملازمہ کو کام سے فارغ کر دیا گیا۔

ضرورت کے تحت باندھے گئے اس رشتے نے آخر مجھے اس مرتبے پر فائز بھی کر دیا کہ جس کے لیے میں لائی گئی تھی۔ وہ ظالم عورت اور مرد بار بار میری اوقات اور حیثیت یاد دلاتے ہوئے بتاتے کہ انہوں نے ایک معقول رقم میرے ماں باپ کو دے کر فقط اسی مقصد کے لیے خریدا تھا اور اس کے بعد مجھے طلاق دے کر فارغ کر دیا جائے گا ان کی بلا سے میں جہاں جاتی۔

اوپر والے پورشن میں انشرح کے باپ کے چچا رہائش پذیر تھے وہی خاندان تھا جو انہیں اس ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ "بیٹا! بیوی نہ سہی تمہاری اولاد کی ماں تو ہو گی ناں یہ بچی۔ پورے حقوق نہ بھی دے سکو تب بھی گھر کی چھت نہ چھینو کسی مظلوم کی آہ اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ بہت سخت پکڑ ہے اس کے ہاں حقوق العباد سے نفی کرنے والوں کی۔" جب بھی مجھے روتا دیکھتے وہ اس شخص کو ضرور تلقین کرتے جو بدقسمتی سے میرے شوہر کے مرتبے پر فائز تھا۔ پھر اذیت و درد کے طویل صحرا کو عبور کر کے میں نے انشرح کو جنم دیا تھا اسپتال میں۔ پھر شاید اس شخص کے دل میں خدا نے رحم ڈالا تھا یا اس کے چچا کی باتوں نے دل پر اثر کیا تھا کہ اس نے فی الحال مجھے طلاق جیسے کلنک سے بچا لیا تھا، پر اصل ظلم کی داستان تو یہیں سے شروع ہوئی۔ اس عورت نے انشرح کو جھپٹ کر میری گود سے لیا تھا اور مجھے دھکیل کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، میری ممتا تڑپتی اسے دیکھنے کو، پر مجھے اجازت نہیں تھی، بچی کو اٹھانا تو ایک طرف دیکھ بھی سکوں۔

پھر جس دن میرے دودھ نے میری بچی کو پکارا وہی عورت اس بار بھی آڑے آئی تھی۔ "مرے جاؤ تم جیسی کمین کا دودھ پیے گی میری بچی اس بھول میں بھی مت رہنا اور نہ ہی آئندہ ایسی جرات لے کر میرے پاس آنا ورنہ اس گھر میں تمہارا آخری دن ہو گا۔"

سارا دن گھر کے بکھیڑوں میں الجھی میں اپنی بچی کو دیکھنے، اٹھانے اور سینے سے لگانے کو ترستی رہتی اس شقی القلب عورت کو پھر بھی رحم نہ آتا۔ مٹی کا مادھو میرا مرد یہ سب دیکھتا اور چپ رہتا۔ جس عورت کے دودھ کو نیچ کہا تھا اس عورت نے اس عورت کی کوکھ جنے بچے کو کیوں سینے سے لگائے پھرتی تھی یہ بات میری کبھی سمجھ میں نہ آسکی۔

پھر ایک دن جب میری انشرح چھ ماہ کی تھی، پہلی بار مجھے اپنی بیٹی کے لمس کو محسوس کرنے کا شرف حاصل ہوا کہ وہ سوئی ہوئی تھی، بہت گہری نیند، جب ہی بچی کے اٹھ کر رونے نے بھی اس کی نیند میں خلل نہ ڈالا میں بھاگ کر بچی کے پاس گئی اور لپک کر سینے سے لگا لیا اور ابھی محبت کی ماری ممتا تسکین نہ لے پائی تھی کہ دو ظالم ہاتھوں نے بچی کو جھپٹ لیا۔ "کم بخت نامراد کہا بھی تھا میری بچی کو ناپاک ہاتھ مت لگا۔" وہ عورت چیخ رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس مرد کا آنا میری بدقسمتی میں مزید اضافہ کر گیا تھا۔

"آج اس نے بچی کو ہاتھ لگانے کی جرات کی۔ کل اس کو پیار کرے گی۔ پرسوں میرے خلاف کر کے اسے میرے مقابل کھڑا کر دے گی۔ اسے طلاق دو فوراً"۔ میں کہتی ہوں فوراً "اسے منع کرو۔"

پھر اس مرد نے مجھ پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر تین الفاظ کہہ کر اس عورت کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی اور میرے کلیجے کو آگ بنا دیا۔

"شام جب میں اس گھر میں لوٹوں تو تم اس گھر سے اپنی منحوس صورت لے کر جا چکی ہو۔" نہ صرف یہ بلکہ اس نے میرے کچھ کپڑے اٹھا کر بیگ میں رکھے، رقم بھی رکھی اور میاں اور میری بچی کو لے کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے اپنی ماں کے گھر نکل گئی تھی شاید۔ غم کی شدت نے اور اپنے آنے والے کل کے خوف نے

مجھے میرے پیروں پر کھڑا رکھنے سے انکار کردیا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر ہوش میں آنے پر اس بزرگ اور اس کی بیٹی کو خود کے پاس پاکر یہ زخمی داستان سنائی ہی تھی کہ باہر اٹھتا شور اور ان کی سرگوشی میں کہی بات نے مجھے خاموش کرا گئی تھی۔

''بس اب اپنی طلاق کا ذکر کبھی زبان پر مت لانا۔ رازوں کو رکھنے والا وہ مالک ان ہستیوں کو سنبھال چکا ہے جنہوں نے ظلم کی حد کرتے وقت خدا کی لاٹھی کو نظرانداز کردیا تھا۔''

''میری بچی!''میں تڑپ کر اٹھی۔

''وہ بچ گئی ہے شاید خدا مزید تمہیں آزمانا نہیں چاہتا تھا۔'' ایسے شدید ایکسیڈنٹ میں جب دونوں میاں بیوی جان سے گزر گئے تھے اس بچی کا بچ جانا معجزہ ہی تھا۔

''وہ دن اور آج کا دن وہی میرے باپ بھی تھے سرپرست بھی، بڑے بھی اور رہنما بھی۔ دو سال پہلے ہی ان کے بیٹے نے انہیں اپنے پاس بلوا لیا۔ علی کے ماموں ان ہی کے بھانجے تھے تب ہی میں نے اس کو کرایہ دار کے طور پر منتخب کیا اور آج وہ انشرح کا خاوند ہے۔''

بے حد ابھرتے درد کو دباتی وہ پھیکا سا مسکرا کر بولیں۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے اپنی زندگی کی اس تلخ کتاب کو اپنی بیٹی سے بھی پوشیدہ رکھا آج تک۔ نجانے کیسے آج پرت پرت آپ کے سامنے خود کو کھول کر رکھ دیا کہ اپنا غم بانٹنے کے لیے انسان کو کسی بھی موڑ پر کسی ایسے انسان کی ضرورت پڑتی ہے، جب وہ اپنے اندر کا بوجھ بانٹ کر اس گھٹن کو کم کرنا چاہتا ہے جو اس کی زندگی کو گھن کی طرح کھا گئی ہو۔''



''انشرح۔ انشرح۔!'' علی نے جس طرح دھاڑ کر آواز دی تھی اس سے اس کے غصے کا اندازہ ہوتا تھا۔ انشرح اٹھ کر بھاگنے کو تھی کہ ممی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بیٹھو تم میں خود جاتی ہوں۔ کیا ہو گیا ایسا جو اس طرح سے بلا رہا ہے وہ۔''

وہ اسے وہیں لاؤنج میں بٹھاتی خود اس کے کمرے کی طرف چل دیں۔

''کیا بات ہے علی۔! بات کرنے کا' بلانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے یہ کیا کہ بندہ اگلے کو بوکھلا کے رکھ دے، باہر جاکے دیکھو تو کیسے زرد پڑ گئی ہے میری بچی۔''

ناگواری سے بولتے ہوئے وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں، یہ دیکھے بغیر کہ وہ کس قدر غصے میں تھا اور انشرح کی جگہ ان کو دیکھ کر اس کا پارہ مزید بڑھ گیا تھا۔

''بس آنٹی بہت ہو گیا تماشا اور بہت کرلیا میں نے ضبط۔ انشرح!''

وہ ایک بار پھر زور سے بولا کہ ممی خود سہم گئیں۔ گرتی پڑتی انشرح بھی آگئی تھی۔ پھر جس پل اس نے ہاتھ میں پکڑی وہ گولیاں لہرائیں جو ابھی ابھی اس کی نظر سے گزری تھیں دونوں ماں بیٹی کے چہرے فق ہو گئے۔

''میں نے ہمیشہ آپ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت کی قدر کی، برداشت کیا۔ ضبط کیا، پر آج کے بعد ان سب جذبوں پر ایک ہی جذبہ غالب رہے گا نفرت کا۔ مجھے آنٹی جی! آج تک آپ کی بیٹی سے محبت سمجھ ہی نہ آسکی، ارے اس سے بڑھ کر دشمن بھی ہو گا اپنی اولاد کا جو بیٹی کا گھر نہ بسنے دے۔ اس کی اولاد نہ ہوسکے اس کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے اپنائے۔''

اس نے وہ گولیاں ان کے پاؤں میں پھینک دیں۔

''علی میری بات۔''

''بس مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دیں۔ تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہو کہ اچھی بری جس راہ پر چلایا جائے چل پڑتی ہو۔ میں نے تمہیں اپنی ماں کا حکم ماننے سے کبھی نہیں روکا ایسے کہ بہت بار اپنی ماں کی مرضی نہ ہونے پر تم نے میرے جذبات کا خون کیا پر ایسی غلط بات۔''

وہ یہاں وہاں ٹہل کر گویا اپنے ابلتے غصے کو قابو

کرنے لگا۔

"علی مجھے معاف کردیں پلیز! ممی کا کوئی غلط مطلب نہیں تھا، یقین کریں وہ چاہتی تھیں کہ میں اتنی جلدی ان ذمہ داریوں میں نہ پڑوں۔"

وہ زور زور سے روتے ہوئے بولی۔ ممی نے بھی اثبات میں سرہلایا۔

"بہرحال میں اب مزید ایک پل بھی یہاں رکنے کے حق میں نہیں ہوں۔ تمہیں بھی آخری موقع دے رہا ہوں کہ ابھی کے ابھی میرے ساتھ تم یہ گھر چھوڑ کر چل رہی ہو۔" اس کے ایسے سنگین الفاظ و لہجے پر وہ دونوں زرد پڑ گئیں۔

"علی! بس کہہ رہی ہوں ناں کہ ممی۔"

"ممی، ممی، ممی۔ اجیرن کر کے رکھ دیا اس لفظ اور اس عورت نے میری زندگی کو۔ میں اس کی موجودگی میں ایک پل بھی زندگی کی کوئی خوشی محسوس نہیں کر سکتا۔ تمہیں چلنا ہے تو بتاؤ۔"

انشرح نے ایک نظر علی اور دوسری ساکت کھڑی ممی کے چہرے پر ڈالی جن کے چہرے پر کھنڈا دکھ اس قدر واضح تھا کہ وہ بے ساختہ ان کے پاس آئی۔

"ممی! آپ ہی کچھ بولیں ناں۔ علی کو سمجھائیں کہ وہ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا نہیں ہے۔"

علی سے اس سے زیادہ برداشت کرنا ناممکن ٹھہرا تھا، سو وہ ایک نظر ان دونوں کے جذباتی مظاہرے پر ڈال کر گھر سے باہر نکل آیا۔ حسن کو اس نے ایمرجنسی کا بتا کر اپنی پندرہ دن کی چھٹی منظور کرانے کا کہہ کر فون آف کر دیا تھا اور خود بس اسٹاپ تک آگیا۔

اس پل اسے صرف ایک جذباتی سہارے کی ضرورت تھی جو یقیناً" اسے ماموں اور مامی جی کی پرشفقت پناہ میں ہی مل سکتا تھا۔ چار گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ گھر پہنچا تھا۔ سب ہی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بھائی دونوں اپنے آفس میں تھے۔ ایک بھابھی گھر پر اور ایک اپنی ماں کے گھر پر تھیں۔

ماموں، مامی جی کو سامنے دیکھ کر وہ بری طرح بکھر گیا اصل دکھ اسے انشرح کے رویے اور رد عمل پر ہوا اور شادی کے دن سے لے کر آج تک کی کتھا سنا ڈالی۔ دونوں بے حد حیرت اور دکھ میں گھرے اسے دیکھتے اور سنتے رہے۔

"غضب خدا کا میرا بچہ ایسی مشکل زندگی بسر کرتا رہا اور یہاں ہم خوش رہے کہ ہمارا ابتدائی شادی شدہ زندگی میں اتنا مگن ہے کہ ایک بھی چکر بیوی کے ساتھ نہ لگا سکا ماں باپ کے پاس۔ ارے کیا پتا تھا کہ اس عورت نے خوار کر دیا تھا اس کو۔ بس دفع کرو ان سنکی اور عجیب و غریب لوگوں کو۔ دو لفظ دے کر جان چھڑاؤ۔ میں اپنے بیٹے کے لیے خوب چھان پھٹک کرلاؤں گی بہو، جو اس کی اجڑی زندگی میں بہار لے آئے گی۔"

جوں ہی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹا، وہ اس کے سر میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے گئیں۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا۔ اس وقت بھی تمہیں اور تمہارے بیٹے کو جلدی تھی کسی بھی شرط کے اسباب و نتائج کا خیال کیے بغیر ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی، جبکہ میں نے بار بار کہا تھا کہ خوب سوچ سمجھ لو اور اب بھی وہی غلطی پھر دہرانے چلے ہو تم لوگ۔ بیٹا ہے تو بیوی کو چھوڑ کے آگیا اور ماں الٹی پٹی پڑھا رہی ہے کہ فوراً" چھوڑ دو اسے۔ ارے ایسا کب ہوتا ہے شریف لوگوں میں۔ مسئلے مسائل کون سے گھر میں نہیں ہوتے۔ انہیں بیٹھ کر سلجھایا جاتا ہے نہ کہ رشتے توڑ دیے جاتے ہیں۔ گھر بنانے میں برسوں لگ جاتے ہیں اور بگڑنے پہ آئے تو لمحہ بھی نہیں لگتا۔"

ماموں تو بہت ہی جذباتی ہو گئے۔

"ہاں تو آپ بتا دیں حل۔" مامی جی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں فون کروں گا بہن جی کو۔"

"بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اب اس عورت سے کسی قسم کا رابطہ پسند نہیں کرتا نہ اپنا نہ آپ کا۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سنجیدگی سے ماموں سے کہا۔



تھا' ہر بار اس نے اپنی ممی کو علی پر ترجیح دی تھی اور جب اس نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا اسے تو کچھ سوچے بغیر اس کے ساتھ چل پڑنا چاہیے تھا۔ کیسے وہ اپنی ممی کے پہلو میں جاکر گڑگڑانے کھڑی ہوئی تھی گویا علی کی اہمیت اس کے نزدیک بالکل بھی نہ ہو۔ وہ منظر بار بار اس کی نظر میں آکر اس کی ناراضگی کی شدت کو بڑھا جاتا۔

ماموں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلتے ہیں اور دونوں فریقین کی سن کر فیصلہ کریں گے کہ مل بیٹھ کر معاملے سلجھائے جاسکتے ہیں پر وہ ماش کے آٹے کی طرح اکڑ گیا تھا۔

"نہیں ماموں! اس نے میری انا کو چوٹ پہنچائی ہے میں اب بھی اسے زندگی میں لانے کو تیار ہوں پر اب کی بار وہ مجھے پکارے گی۔"

اس نے ماموں سے کہہ کر۔ بھاگ دوڑ کر کے ایک ماہ کے اندر اندر اپنا ٹرانسفر اس شہر کی برانچ میں کرالیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ حسن سے بھی گریزاں تھا اور اس نے وہ نمبر بھی تبدیل کردیا تھا کہ اس شہر سے صرف دکھ اور بے زاری کا رشتہ تھا اس کا۔ مامی اس کی بے زاری، گم صم انداز دیکھ کر روزانہ ماموں سے بحث کرتیں۔ اس کی منتیں کرتیں کہ وہ اس کو ایسا نہیں دیکھ سکتیں اگر وہ انشرح کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے تو اسی کو جاکر لے آئے یا انہیں ہی جانے دے' یا اس سے رشتہ توڑ کر جینا چاہتا ہے تو وہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی کرادیں گی' پر ان کی بات سنتے ہی وہ وہاں سے اٹھ کر چل دیتا۔

پھر وہ بھی ایسا ہی بے زار دن تھا جب وہ آفس کے کام میں مصروف تھا کہ ٹیبل بجا کر اسے کسی نے متوجہ کیا تھا۔

"حسن۔ تو۔!" کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کے گلے لگ گیا کہ اس کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں تھی۔

"بس بس رہنے دے' تیری یہ منہ دیکھے کی محبت۔ تیرے گھریلو جھگڑے اپنی جگہ' پر میں تو دوست تھا ناں تیرا۔" وہ سخت ناراض تھا۔

"بس یار میں اس شہر کی ہواؤں سے بھی خفا ہوگیا ہوں یوں سمجھ' ورنہ تیرے سوا کون ہمدرد تھا میرا وہاں۔" اس نے یاسیت سے کہا۔

"اسی لیے مجھے بنا بتائے چلا آیا۔" وہ طنزاً گویا ہوا۔ "چل باقی گلے شکوے گھر چل کر کریں گے۔" وہ سامان سمیٹتا ہوا بولا' پھر ایڈمن کو بتا کر حسن کو گھر لیے چلا آیا۔ پھر اسے ٹھٹک کر وہیں رک جانا پڑا تھا کہ وہ دشمن جان سامنے ہی مامی جی کے پہلو سے چپکی بیٹھی تھی۔ دل میں موجود ساری خفگی کہیں ہوا بن کر اڑ گئی پر دوسرے صوفے پر نظر پڑتے ہی ممی کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔ "چل آگے چل' ابھی اور بڑے بڑے جھٹکے لگنے ہیں تجھے۔" حسن نے ٹھوکا دیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم' یہ سب کیا ہے؟" وہ الجھ گیا اسی اثناء میں ماموں جی کی نظر ان پر پڑ چکی تھی۔

"حسن! لے آؤ بھئی ناراض ہیرو کو۔ اس کی بیگم سے زیادہ اس کے ساس سسر اس سے ملنے کو بے چین ہیں۔"

ماموں خوش دلی سے بولے تو ان کے جملے پر الجھتا وہ اندر چلا آیا۔ واقعی حیرت کے جھٹکے اتنے شدید تھے کہ اسے ممی کی سائیڈ میں بیٹھے ڈاکٹر صاحب تو نظر ہی نہ آئے تھے پھر ممی کا نسبتاً "سجا سنوارا" روپ۔ وہ آہستہ سے سب کو مشترکہ سلام کرتا ماموں کے پاس آبیٹھا جبکہ حسن نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جگہ بنائی۔ اچانک اس کی نگاہ انشرح پر پڑی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظر ملنے پر ـــ اس نے ان آنکھوں میں پانی کی چمک محسوس کی جو اسے بہت پیاری تھیں۔

"علی بیٹا!" ممی کی نرم آواز پر وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ "دانستہ یا نادانستہ مجھ سے بہت سی غلطیاں ہوئیں' پر انسان کے ہر عمل کے پیچھے کچھ اسباب ہوا کرتے ہیں جو اگر تم جان جاتے تو ہوسکتا ہے میری انشی سے محبت کو صحیح جج کرپاتے' پر خدا گواہ ہے میرا مقصد اپنی بیٹی کا گھر اجاڑنا ہرگز نہیں تھا۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں بیٹا! اب یہ تمہاری صرف ساس ہی نہیں چچی بھی ہیں اور ہم سب اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعے کے بغیر سب ٹھیک ہونے کو ہے اور اس سب کو ٹھیک کرتے کرتے بھی تین ماہ تو لگ ہی گئے۔ تمہاری آنٹی اور میں عمرہ کی نیک سعادت کے لیے جارہے ہیں۔ تمہاری امانت تھی ہمارے پاس' وہی لوٹانے آئے تھے اور تمہاری خوشیوں کی نوید دینے۔ ہمارے حق میں دعا کرنا کہ زندگی کے اس سفر میں انسانوں سے ڈسے دو لوگوں نے تھک کر جہاں پڑاؤ ڈالا ہے' وہاں ان کے لیے خوشی اور سکون ہو۔"

انکل اس کے ایک طرف اور ممی دوسری طرف بیٹھ گئی تھیں۔ وہ سر کو جھکائے بیٹھا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا ناں علی!" ممی ایک دم ہی رونے لگیں۔ وہ بری طرح سے بوکھلا گیا۔

"ارے نہیں' نہیں آنٹی! بخدا میں تو اپنے اس دن کے الفاظ اور لہجے پر پچھتا رہا ہوں جو غصے میں میرے منہ سے نکلے۔ میں سوچ سکتا ہوں کہ آپ کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔" وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

"مائیں تو اولاد کی بڑی بڑی لغزش معاف کردیتی ہیں بچے! تم نے جو کہا اس میں بہرحال کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں' شدت پسندی ہر چیز میں نقصان دیتی ہے رشتوں میں ہو یا رویوں میں یہ بات میں نے جان لی ہے۔" ان کے کہنے پر علی کو جیسے کرنٹ سا لگا یا اللہ یہ کایا پلٹ کیسے ہوگئی۔

"نو علی! مجھے اگر انشرح کی طرح پاپا کہو گے تو زیادہ خوشی ہوگی کہ ہم دونوں ہی رشتوں کے ترسے لوگ ہیں۔" انکل نے اس کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔

پھر حسن نے ہی موقع پاکر اس کو بتایا کہ اس کے گھر چھوڑ کر چلے آنے پر انشرح نے ذمہ دار اپنی ممی کو ٹھہرایا تھا' جس سے وہ بے حد بیمار پڑ گئی تھیں پھر ایسے مشکل وقت میں انکل ہی تھے جنہوں نے دونوں طرف کا محاذ سنبھالا تھا۔ ممی میرا مطلب ہے آنٹی اور ان کے حالات سے متاثر تو پہلے ہی ہوچکے تھے' شدومد سے ان کی بیماری کے ساتھ نفسیاتی علاج بھی شروع کیا آنٹی کا علاج ابھی بھی جاری ہے' پر جس روز ان کی پہلی نفسیاتی گرہ کھلی انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کرلیا کہ واقعی ان کی شدت پسندی اور بے جا دخل اندازی ان کی بیٹی کے گھر کو خراب کررہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد انکل نے آنٹی کو پرپوز کیا پھر ان کو قائل کرنے کا ایک کڑا مرحلہ تھا' جو میں نے اور انشرح بھابھی نے سر کیا کہ انکل کی زبانی ان کی ذات کی تشنگی کے کئی پہلو سامنے آئے تھے۔ انہیں حقیقت میں کوئی ایسا سہارا چاہیے تھا جو ان کی ساری محرومیاں مٹا کر ان کا دامن خوشیوں سے بھر دے' ایسا بھلا انکل کے سوا کون ہوسکتا تھا کہ آنٹی کی زندگی میں جو لوگ آئے انہوں نے ان سے صرف دکھ ہی اٹھایا تھا' کچھ یہی حال انکل کا تھا' ایسی عورت کا ساتھ ملا تھا انہیں کہ جو ان سے زیادہ دولت مند دیکھ کر اسی پر ریجھ گئی تھی' پھر اس نے انکل سے خود طلاق لے لی تھی۔ بہت سی قدریں مشترک نہ ہوتے ہوئے بھی مشترک تھیں۔ آنٹی جی ہرگز نہ مانتیں پر انشرح بھابھی کی دو دن کی بھوک ہڑتال نے ان کی ناں کو ہاں میں بدل دیا۔" پھر ممی جی کے چہرے پر شرمیلی مدہم سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ سب جان گئے تھے کہ اب خوشیاں انہیں اپنے پروں میں سمیٹ لینے کو تھیں۔ اسی شام کو ڈاکٹر انکل اور ممی کو ایئرپورٹ چھوڑ کر وہ اور حسن واپس آگئے۔ ڈاکٹر انکل اور ممی عمرہ کی ادائیگی کے لیے جارہے تھے۔ نکاح کے بعد وہ ممی کو مستقل اپنے گھر لے گئے تھے انشرح بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہی تھی پھر ان دونوں ماں بیٹی نے جانا تھا کہ گھر کا سکون کیا ہوتا ہے اور انشرح نے جو باپ کی شفقت اور محبت کے قصے کتابوں میں پڑھ رکھے تھے ان کو حقیقی زندگی میں برت لیا تھا۔

حسن کو بس اسٹاپ پر ڈراپ کرکے وہ سیٹی پر شوخ سی دھن بجاتا ہوا ڈرائیو کررہا تھا کہ آج واپسی کے سفر میں اس کے لیے اداسی نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کی ناراض انشرح اس کی منتظر تھی۔ جیسے ــــ مناکر اس نے زندگی سے وہ خوشیاں کشید کرنی تھیں جو اپنی اپنی نادانیوں کے سبب وہ کھوچکے تھے۔



نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول





والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی، ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے، جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے، بہانے سے پاس ورڈ حاصل کرکے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور، ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کرکے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی، حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس اوور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی، ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم، فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی، زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین، وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہوجاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کرواچکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مرواسکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہوجاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہوجاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔

سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً"... مثلاً "ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کرکے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی، زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین، علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کرلی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو اس کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس لگتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا، حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے۔ ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب، نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کرکے _______ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کرلیتی ہے۔

دسویں قسط

"عقد"

وہ خائن وقت کی کچھ بددیانت ساعتیں ہوں گی
میرے اندر کا "میں" محبوس کر ڈالا گیا، پر ہول
زنداں میں!
بڑا ہی لاابالی وقت تھا
جی ہو گیا ایک مشتعل بچہ!

درِ زنداں میں مقفل کر کے چابی قلزمِ لولاک میں پھینکی
کہیں تو وسعتِ افلاک میں پھینکی
وہ چابی اب نہیں ملتی!
مقفل در نہیں کھلتا!
مجھے تو خود سے ملنا تھا.....
میں کب تک وسعت افلاک چھانوں گا؟
کہاں تک دھند میں کھوئے ہوئے آفاق چھانوں گا؛
(سید نفیر شاہ)

سبزہ زار پہ میری اینجیو کھڑی ابھی تک سعدی سے بات کر رہی تھی۔ جواہرات سینے پہ بازو لپیٹے چلتی قریب آئی تو آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

"میرا خیال ہے، بلکہ جتنا تمہارے بیٹے کے کینسر کو میں نے ریسرچ کیا ہے، وہ آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ بیماری کا جلد علم ہو جانا تو اچھی بات ـــ" وہ اسے تسلی دیتے مڑا تو جواہرات اور شیرو آتے دکھائی دیے۔ سعدی نرمی سے مسکرایا اور سر کو خم دے کر سلام کیا۔

"مسز کاردار! آپ کو پہلے سے بہتر دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

"ان دنوں میں اتنی دفعہ دیکھ چکے ہو، فرق تو نظر آیا ہو گا۔" وہ بظاہر مسکرائی اور عین اس کے سامنے آ رکی۔ سعدی کو..... کچھ محسوس ہوا۔ نگاہیں جواہرات کے کندھے کے پیچھے شیرو تک گئیں، جو تنفر سے اسے گھور رہا تھا۔

"پوچھ سکتی ہوں میری ملازمہ سے کیا بات ہو رہی تھی؟" وہ اب بھی مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں سے شعلوں کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر باہر کو آتی تھیں۔

"میری نے مجھے بتایا تھا اپنے بیٹے کے کینسر کے بارے میں۔ میں نے اس کو انٹرنیٹ پہ سرچ کیا تو....."

"یہ ہاشم کو بتانے والے مسئلے ہیں میری اینجیو 'یا گھر آنے والے ہر دوسرے شخص کو؟" مسکرائی مگر سلگتی آنکھوں سے میری کو گھورا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑا۔ وہ سوری کہتی ندامت سے سر جھکائے الٹے قدموں مڑ گئی۔ سعدی کی مسکراہٹ سمٹی۔ اچنبھے سے جواہرات کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری مسز کاردار! میں آپ کی خیریت پوچھنے آیا تھا اور ـــ"

"خیریت پوچھنے یا یہ معلوم کرنے کہ اورنگ وصیت میں تمہاری بہن کے نام کچھ چھوڑ کر تو نہیں گئے؟"

سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "جی؟" اس نے بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"میرے بیٹے کے خلاف اس کے باپ کے کان بھرتے وقت تمہاری بہن نے ذرا احساس نہیں کیا کہ یہ صدمہ اورنگ زیب کی جان لے سکتا ہے؟ بلکہ صرف وہی کیوں، تم دونوں شامل تھے نا اس ڈرامے میں! کیا سوچا تھا؟ اپنے بیٹے کو ڈس اون کر کے اپنی جائیداد تم لوگوں کے نام لکھ جائے گا وہ؟" مسکراہٹ ہنوز لبوں پہ تھی مگر آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی۔

"مسز کاردار! آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" سعدی نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔ جواہرات کی آنکھوں کی رگیں گلابی پڑنے لگیں۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ دو قدم مزید آگے آئی۔

"وہ کیا تھا اگر تم دونوں اور نگزیب کے بجائے مجھے یا ہاشم کو تنہائی میں وہ سب بتا دیتے، مگر تم نے ذرا اس شخص کا احساس نہیں کیا؟ اس کو اندر ہی اندر یہ غم کھا گیا سعدی! اور وہ اس حالت میں مرا کہ اپنے بیٹے سے ناراض تھا، اور اس سب کے ذمہ دار تم ہو۔" اس بات پہ سعدی نے فوراً سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہاں بالکل، اپنے آپ کو اغوا بھی میں نے کیا تھا اور جھوٹ بول کر باپ سے پیسے بھی میں نے مانگے تھے نا۔" وہ تنے ابرو کے ساتھ ناگواری سے بولا تو جواہرات لمحے بھر کو چپ ہوئی۔

"اے..... میرے باپ کا نام بھی نہ لینا۔" نوشیرواں نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ انگلی اٹھا کر تنبیہہ

کی۔ "تم لوگوں نے ان کو میرے خلاف ورغلایا تھا' اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"میں معافی مانگ بھی نہیں رہا۔ میں صرف مسز کاردار کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔" وہ بمشکل ضبط کر پایا۔

"میری طبیعت دیکھ لی تم نے؟ میرا شوہر اس حالت میں مرا کہ وہ شیرو کو ڈس اون کرنے والا تھا۔ دیکھ لیا ہم کتنی اذیت میں ہیں؟"

نوشیرواں نے قدرے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ سعدی کو دیکھتی تکلیف اور برہمی سے کہہ رہی تھی۔

"اس سے پہلے بھی تم شیرو کی زندگی تنگ کرتے رہے ہو' مگر اس دفعہ تم لوگوں نے حد کر دی سعدی!" یہ آخری فقرہ شیرو کو دیکھ کر ادا کیا' جس پہ اس کا غصہ مزید بڑھا اور اس نے نفرت سے (ہونہہ) سر جھٹکا۔

سعدی نے ایک ناپسندیدہ نظر دونوں پہ ڈالی۔ سر کو خم دیا (بہت اچھا)۔ دو قدم پیچھے ہٹا' اور پھر نوشیرواں کو مخاطب کیا۔

"تم نے کبھی وہ کچرے کے ڈبے دیکھے ہیں نوشیرواں! جو سڑک کنارے نصب ہوتے ہیں۔ ان پہ لکھا ہوتا ہے' Use Me۔ تم نے بھی خود پہ یہی حروف لکھوا رکھے ہیں۔ جو بھی آئے' اپنا کچرا صاف کرنے کے لیے تمہیں استعمال کرے (جواہرات پہ تیز نظر ڈالی) اور چلا جائے۔ سو میں مزید آپ کے ان گیمز کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اللہ حافظ۔"

وہ مڑا اور مخالف سمت چلتا گیا' اور جب تک نوشیرواں کو اس کا طنز سمجھ آیا' وہ دور جا چکا تھا۔

"الو کا..." وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ "اگر یہ دوبارہ ادھر آیا نا ممی تو۔"

"اگر غیرت ہو گی تو دوبارہ اس گھر میں داخل نہیں ہو گا' اور اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ غیرت والوں میں سب سے زیادہ غیرت والا ہے۔"

جواہرات اذیت سے مسکرائی' اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ نوشیرواں کے اندر کی آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔ ڈھیلے پڑتے ہوئے اس نے گہری سانس لی' اور مڑنے لگا' پھر یکایک رکا۔

"وہ آپ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا تھا نا؟ ڈیڈ مجھے ڈس اون تو نہیں کرنے لگے تھے نا؟"

جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا جو قدرے تذبذب' مگر امید سے اسے دیکھ رہا تھا۔

جواہرات کی مسکراہٹ پھیکی پڑی' آنکھوں کی سفیدی گلابی ہوئی۔ نم گلابی۔

"نہیں' وہ تمہیں... تمہیں کبھی ڈس اون نہیں کر سکتے تھے۔ یہ میں نے صرف... بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا تھا۔"

اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔ بہت سے آنسو اندر اتارے۔ نوشیرواں پرسکون سا ہو کر آگے بڑھ گیا۔ جواہرات نے ہاتھوں کی نمی چھپانے کے لیے مٹھیاں بند کر لیں۔ پھر گردن موڑ کر برآمدے میں کھڑی میری کو دیکھا۔ اس کا کیا کرے؟ اصل گواہ جو خود بھی اپنی گواہی سے لاعلم تھا' وہ تو ابھی ادھر ہی تھا۔



ترک تعلقات کوئی مسئلہ نہیں
یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی

سعدی سرخ کانوں اور تنے تاثرات کے ساتھ قصر کاردار کے داخلی گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا' تاکہ اپنی کار تک جائے کہ سامنے سے زمر کی کار آتی دکھائی دی۔ وہ قدم قدم چلتا سڑک پہ جا کھڑا ہوا۔ پہاڑی پہ بل کھاتی سڑک ویران تھی۔ اردگرد کوسوں کے فاصلے پہ اونچے محلات تھے' جو کاردارز کے قصر کی مانند وسیع سبزہ زار میں گھرے تھے' سوائے سڑک سے آس پاس کی محض دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ زمر نے کار وہیں روک دی۔ اسے اشارہ کیا۔ وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھا۔

"آپ ادھر کیسے؟"

"جنازے کے بعد دوبارہ آ نہیں سکی' سو اب مسز کاردار کے لیے آئی تھی۔ وہ ہسپتال میں مجھے وزٹ

کرنے اکثر آتی تھیں' میرا آنا بنتا ہے۔" خشک' سپاٹ انداز میں' ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے وضاحت دی۔ سعدی نے ڈیش بورڈ پہ نظریں جمائے انتظار کیا کہ وہ شاید کہے (جب تم میرے پاس نہیں تھے' تب وہ آتی تھیں) مگر وہ گلہ ہی تو نہیں کرتی تھی۔

"اور تم ادھر کیسے؟" چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تو سعدی نے بھی اس کی جانب گردن پھیری۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ دل کی بات نہیں کہنی۔

"مسز کاردار کو دیکھنے آیا تھا اور اب اچھے سے دیکھ چکا ہوں۔ سو واپسی کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔"

زمر چند لمحے خاموش رہی۔ پھر نرمی سے کہنے لگی۔

"میں نے معلوم کیا تھا' ہاشم اس کیس میں ملوث نہیں ہے۔ کم از کم بظاہر تو نہیں ہے۔"

"خود معلوم کیا یا کسی اور نے کر کے دیا؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا' کیونکہ اس کے نزدیک دونوں میں اتنا فرق تھا جتنا پہلے اور ساتویں آسمان میں۔

"خود نہیں کیا مگر۔" وہ رکی "بصیرت صاحب نے اسے چیک کیا تھا' اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اس معاملے سے' مگر تم بتاؤ' تمہیں ایسا کیوں لگا کہ ہاشم اس میں ملوث ہو سکتا ہے؟"

"مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگا۔ بس جس کا نام منہ میں آیا بول گیا۔ آئی ایم سوری' مجھے یوں کسی پہ الزام نہیں لگانا چاہیے تھا۔" اس نے سادگی سے معذرت کر لی۔

زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تم نے اس کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی' میں اتنے دن اس کی پوچھ گچھ کرواتی پھر رہی تھی اور اب تم کہہ رہے ہو کہ تم نے یونہی کہہ دیا تھا؟" شدید غصے کو بمشکل اس نے ضبط کیا۔ تو وہ سارے دن جو اس نے فارس کے حق میں کوئی بھی بات ڈھونڈنے میں صرف کیے' وہ سب ایک مذاق تھا؟

"میری سمجھ میں نہیں آیا کس کا نام لوں۔ بس ان کا لے لیا۔ یہ لوگ۔" انگلی سے قصر کاردار کی جانب اشارہ کیا "اب میرے ساتھ پہلے کی طرح برتاؤ نہیں کرتے۔ مجھے شاید اسی بات کا غصہ تھا۔" وہ بمشکل ضبط کرتی اسے گھورتی رہی۔ اس نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ آہستہ سے بولا۔ "سوری!"

"اور تم نے ہاشم سے یہ کیوں کہا کہ وہ آڈیو میں نے نکلوا کر دی تھی؟" سعدی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"یعنی انہوں نے آپ سے پوچھا؟" "تو پھر کیا کہا آپ نے؟"

"جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔"

"معلوم ہے۔ تب ہی یہ کہا تھا۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے اس نے سوچا تھا۔

"میں ان سے خفا تھا' کیونکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح فارس ماموں کو قاتل خیال کرتے ہیں' اور اب چونکہ میں ماموں کے لیے کوشش کر رہا ہوں' تو وہ مجھ سے خفا ہیں۔ مگر مجھے اچھا لگا کہ آپ نے میرا مان رکھا۔ اور آپ ماموں سے ملنے جیل گئیں' اس کے لیے شکریہ۔"

"کیا تمہارے ماموں نے تمہیں یہ بتایا کہ اس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑنے کی کوشش کی؟"

سعدی کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "کیا مطلب؟"

زمر نے محض چند فقرے تفصیل بتانے پہ ضائع کیے' جس کے بعد سعدی کی رنگت زرد پڑتی چلی گئی۔

"آئی ایم شیور پھپھو! کوئی غلط فہمی ہوئی ورنہ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ میں ان سے۔"

"سعدی! میں تھک گئی ہوں!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو بولنے سے روکا۔ "میں نے اس کیس سے بھی خود کو الگ کر لیا ہے۔ میں مزید فارس کے مسئلوں میں نہیں الجھنا چاہتی۔ پھر بھی میں دوبارہ الجھی۔ اتنے دن میں نے پہلی دفعہ فرض کرنا شروع کیا کہ وہ بے گناہ ہو سکتا ہے' مگر اس نے پھر وہی کام کیا۔ مجھے مزید مت سمجھاؤ۔ اپنے ماموں کو سمجھاؤ کہ خدارا اپنے اور دوسروں کے اوپر رحم کرے۔ مجھے مزید مت ستائے۔ میں نے اس کا کیس خود ریکیوز نہیں کیا'

میں اب گواہی واپس لے چکی ہوں اور کیا چاہتے ہو تم لوگ مجھ سے؟ اب میرا دل کہتا ہے کہ وہی میرا مجرم ہے تو مجھے زبردستی اس کو بے گناہ کہنے پہ مجبور مت کرو۔ میں نے گواہی واپس لی تھی، میں ہر چیز ایک طرف رکھ کر اس کے پاس گئی۔ اس کے بیٹے ہاشم کو بھی مشتبہ سمجھا۔ مگر اس نے پکڑوا ہی لیا۔"

وہ کتنی ہی دیر چپ بیٹھا رہا۔ سر جھکائے۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے آپ کو ان کے پاس جانے کے لیے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ کی تکلیف ہم میں سے سب سے زیادہ ہے۔ وہ جیل سے چھوٹ جائیں، تب بھی نئی زندگی شروع کرسکتے ہیں، آپ نہیں شروع کرسکتیں۔ کم از کم اتنے آرام سے نہیں۔ آئی ایم سوری۔ اب ہم اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔ لیکن۔" اس نے چہرہ اٹھا کر امید سے زمر کو دیکھا۔ "مجھ سے ایک وعدہ کریں۔ ایک دن میں آؤں گا آپ کے پاس ثبوت لے کر، تب آپ کا مجھے سننا ہوگا اور اگر وہ ثبوت قابل قبول ہوا تو اسے ماننا بھی ہوگا۔"

"شیور!" اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "میں تو تم سے ہمیشہ کہتی رہی ہوں، مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جو میں مان بھی سکوں۔ تو میں ضرور مان لوں گی۔" پھر وہ چپ ہوگئی۔ "سعدی میں تم سے پھر کہہ رہی ہوں، اگر کوئی ایسی بات ہے، جو فارس کے حق میں جاتی ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں ایک دفعہ پھر اس کی یہ حرکت بھی نظرانداز کر کے اس کے لیے کوشش کرنے کو تیار ہوں۔ اگر کوئی تیسرا شخص ملوث ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"نہیں پھپھو۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ جو سوچتی ہیں، ابھی وہی سوچتی رہیں۔ کچھ ملا مجھے تو آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ آپ بس اپنا خیال رکھیں۔"

"میرے لیے افسردہ مت ہو بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔" اس سے نگاہ ملائے بنا وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"آپ کی برتھ ڈے ہے اگلے مہینے، میں نے ایک کتاب آپ کے لیے رکھی ہے۔ کبھی وقت ملے تو اسے پڑھیے گا۔ اس میں دل کی بیماریوں کی شفا ہے۔" خاموشی دوبارہ دونوں کے بیچ حائل ہوگئی۔ پھر زمر نے اسے دیکھا، وہ ہنوز اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زمر کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہاتھوں پہ پھسلیں اور سیاہ کی چین پہ آٹھہریں جو اس نے انگلیوں میں پکڑ رکھی تھی۔ اس پہ سنہرے حروف میں لکھا تھا۔

"Ants Everafter"

"نئی لی ہے؟" گوکہ اب وہ تعلق نہیں رہا تھا، نہ بے تکلفی، مگر وہ پوچھ بیٹھی۔ اس نے جواباً گردن جھکا کر کی چین کو دیکھا، نفی میں سر ہلا دیا۔

"اونہوں۔ علیشا نے حنین کو دی تھی، حنین کے لیے اس کے ساتھ تکلیف دہ یادیں جڑی ہیں، سو میں نے رکھ لی۔ آج صبح گھر سے نکلنے سے پہلے یونہی حنہ کے کمرے میں گیا اور اٹھا لایا۔" سیاہ ہیرے نما پتھر پہ انگلی پھیرتے وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ بالخصوص یہ عبارت۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" اس کی آواز میں قدرے نرمی در آئی تھی۔ پوچھتے ہوئے وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی بچہ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا؟

"جب میں چھوٹا تھا پھپھو تو ابو کے ساتھ فجر پڑھنے مسجد جایا کرتا تھا۔ تب وہاں مسجد کی دیوار پہ چھت سے فرش تک چیونٹیوں کی قطار ہوتی تھی۔ ہر موسم میں، ہر گھڑی میں۔ تب ابو کہا کرتے تھے 'اگر مجھے کچھ ہو جائے سعدی تو تم اپنے خاندان کا خیال رکھنا۔ بڑے ابا ایک کمزور مرد ہیں مگر تمہیں بہادر بننا ہے۔ تم سعدی! میرے بعد اس خاندان کے بڑے مرد ہو گے۔ اور تمہارے خاندان کی عورتیں، بوڑھے اور بچے، یہ سب چیونٹیوں کی طرح ہیں، کمزور اور نازک۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بادشاہ اور چیونٹیاں۔ تم سعدی اپنی چیونٹیوں کو جوڑ کر

رکھنا۔ تم سعدی! میرے بعد اپنے خاندان کے سربراہ ہو گے۔" کی چین سے نظریں اٹھا کر اس نے اداس مسکراہٹ سے زمر کو دیکھا۔ "اور میں پچھلے کئی برس سے یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' اور کرتا رہوں گا۔ آپ' حنہ' امی' سب ایک جیسی ہیں۔ چیونٹیاں' اور معلوم ہے پھپھو' چیونٹیوں میں کیا قدر مشترک ہوتی ہے؟"

وہ کتنا پیارا بولتا تھا' معصوم اور سادہ۔ نگاہیں اس پہ جمائے زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کی جانب جھکا اور آہستہ سے بولا۔

"وہ یہ کہ۔۔۔ ساری چیونٹیاں اندھی ہوتی ہیں۔" اور پھر اس نے لاک کھولا' دروازہ وا کیا اور سلام کر کے باہر نکل گیا۔ زمر اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے کتنی دیر وہیں بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ لمحے بھر کو اس کا دل چاہا کہ اسے روک لے' مگر۔۔۔ روکنے کے لیے کوئی بہانا نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ سال تک اس نے سعدی کو نہیں دیکھا۔ نہ وہ اس کی موجودگی میں آیا' نہ وہ ان کے گھر گئی۔ یہاں تک کہ ہاشم نے ایک روز آ کر اس سے کہا کہ وہ سعدی کو سونی کی سالگرہ کا کارڈ دے آئے۔۔۔ اور چار سال بعد زمر کو وہ بہانہ مل ہی گیا جس کی لاشعوری طور پہ اسے تلاش تھی۔



شوق اپنے بھی کیا نرالے ہیں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

جس وقت زمر اور سعدی باہر کار میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے' قصر کے اندر اپنے کمرے میں اونچی کرسی پہ بیٹھی جواہرات' انگلی کی انگوٹھی گھماتے' سوچ میں گم تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے لاؤنج میں نئی فلپینو لڑکی فیونا بکٹ اور موپ لیے سیڑھیاں صاف کرتی نظر آ رہی تھی۔

دفعتاً" جواہرات نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملا کر اٹھی' دروازہ بند کیا اور پھر فون کان سے لگایا۔

"جی ڈاکٹر آفتاب۔ کیا حال ہیں؟ فیملی کیسی ہے آپ کی؟"

"سب۔۔۔ ٹھیک ہیں مسز کاردار۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ پھیکا سا مسکرا کر بولے۔

"ہوں۔ ایم فائن۔" نخوت سے بولی' ذرا وقفہ دیا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھ لی تھی میں نے۔ میں مطمئن ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیں' کیا کوئی اور غیر مطمئن تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ لمحے بھر کو رکے۔ "ہاشم۔۔۔ اور ان کے سیکیورٹی آفیسر خاور۔۔۔ ان دونوں نے مجھ سے پوچھا تھا' اورنگ زیب صاحب کے چہرے کے بارے میں۔"

"کیا پوچھا تھا؟" اس کا سانس رک گیا۔

"کاردار صاحب کی موت سر کی چوٹ کی وجہ سے نہیں ہوئی' دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسمودرنگ کے باعث ناک اور اس کے اطراف کا حصہ کافی سفید سا پڑ گیا تھا۔"

"تو آپ نے کیا کہا؟" وہ جلدی سے بولی۔

"یہی کہ کاردار صاحب کا استھما بگڑا تھا' وہ اسی وجہ سے گرے تھے' اور چوٹ لگی' موت بھی اسی وجہ سے ہوئی۔ وہ دونوں ڈاکٹرز نہیں ہیں' مطمئن ہو گئے تھے' کیونکہ بہرحال کاردار صاحب کو شدید دمہ تو تھا ہی۔ ویسے بھی homicidal smothering کی تشخیص بہت مشکل سے ہو پاتی ہے۔ سو میں نے وہ بات سنبھال لی تھی۔ یہ ایک طبعی موت تھی۔"

جواہرات کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند معمول کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فیونا صفائی کرتی اب آخری زینے تک آ چکی تھی۔ جواہرات نے اسے ہلکے سے آواز دی۔ وہ چیزیں رکھ کر مودب سی چلی آئی۔

"ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے' دروازہ بند کر دو۔" وہ واپس کرسی پہ آن بیٹھی اور مسکراتی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ فیونا

سبک رفتاری سے دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جواہرات نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ سیاہ بالوں کی پونی بنائے ___ چینی نقوش والی خوش شکل اور کم عمر لڑکی تھی۔

"کام میں دل لگ گیا ہے تمہارا؟"

"جی۔ میری انیجھو نے سب سکھا دیا ہے مجھے۔" قدرے شرما کر بولی۔

"ہوں۔ پیچھے گھر میں کون ہوتا ہے تمہارے؟"

"ماں اور چار بہنیں' ایک بھائی۔ میں سب سے بڑی ہوں۔" سر جھکائے اس نے لب کچلے۔ آنکھوں میں نمی آئی۔

"تمہاری تنخواہ سے ان کا گزر بسر اچھا ہوتا ہو گا مگر بھائی کو پڑھانا' عزت دار نوکری دلوانا' یہ سب تو مشکل ہو گا... ہوں؟" وہ اپنے کان کے بندے پہ انگلی پھیرتی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فینونا نے جھکے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"یہ تو ہے۔"

"کاش میں تمہاری تنخواہ بڑھا سکتی' مگر میری انیجھو ہیڈ اسٹاف ہے اور تم صرف ایک ماتحت میڈ۔ ہاں اگر تم میری انیجھو کی جگہ ہوتیں تو لاکھوں میں کھیلتیں' لیکن..." فینونا نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔ امید اور خوف کے ملے جلے تاثر سے اسے دیکھا۔

"لیکن؟"

"اس کی پوزیشن پہ پہنچنے میں تو تمہیں سات آٹھ سال لگ جائیں گے۔ اس کا اگلے تین سال تک کا معاہدہ رہتا ہے ہمارے خاندان سے۔ اور اس کی رو سے میں اسے بے وجہ نکال نہیں سکتی۔" وہ رکی۔ فینونا نے تابعداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی' وہ بہت اچھا کام کرتی ہے۔"

"مگر وہ تمہاری طرح تیز اور پھرتیلی نہیں ہے۔ اس کو اپنے بچے کی فکر کھائے جاتی ہے' جس کو وہ فلپائن میں چھوڑ آئی ہے۔ تم اس سے بہتر ہیڈ اسٹاف بن سکتی ہو۔"

"مگر... یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ اگلے کئی سال تک اسی پوسٹ پہ رہے گی اور آپ اسے نکال بھی نہیں سکتیں۔" قدرے مایوسی اور بے دلی سے کہتے اس کی آنکھیں پھر جھکیں۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے نکال نہیں سکتی۔ چاہوں تو ابھی نکال دوں۔ کھڑے کھڑے... مگر اس کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے۔"

"وجہ؟" فینونا نے چونک کر اسے دیکھا۔ الجھن سے ابرو سکیڑے۔

"ہاں' جیسے چوری۔" بندے کو دو انگلیوں سے مسلتے وہ مسکرائی۔

"جس دن اس نے چوری کی' وہ ڈی پورٹ کر دی جائے گی۔ اور مجھے معلوم ہے وہ جلد یا بدیر چوری ضرور کرے گی۔ اسے اپنے بچے کے علاج کے لیے پیسے درکار ہیں' تنخواہ سے بھی کئی گنا زیادہ۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ یہ باکس..." سنگھار میز پہ رکھے ننھے سے جیولری باکس کی جانب اشارہ کیا... "جس کا کوڈ میری تاریخ پیدائش سے کھلتا ہے اور اس میں میرا ایک قیمتی نیکلس رکھا ہے تو کیا وہ خود کو روک پائے گی؟ اسے اس بارے میں سوچنا چاہیے' ہے نا... فی اونا؟" ٹھہر ٹھہر کر مسکرا کر اس کا نام ادا کیا۔

زمر کے آنے پہ جب فینونا مسز کاردار کے کمرے سے نکلی تو اس کی آنکھیں ایک انوکھے خیال سے چمک رہی تھیں۔



جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

ہاشم کاردار کا آفس جس فلور پہ تھا' اس کی راہداری اسپاٹ لائٹس سے جگمگا رہی تھی' جب سعدی کی لفٹ کا دروازہ کھلا۔ نکلنے سے قبل اس نے لفٹ کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا' ذرا گریبان کا اوپری بٹن کھولا' سویٹر کے آستین اوپر چڑھائے' ماتھے پہ ہاتھ مار کر بال ذرا بکھیرے' پھر باہر نکلا۔ تیز قدموں سے راہداری پار کی۔ لمحے بھر کو ہاشم کے آفس کے باہر بنے

ڈیسک پہ رکا۔

"ہاشم اندر ہیں مس حلیمہ؟" ڈیسک پہ لگی نیم پلیٹ پہ نظر ڈال کر سنجیدگی سے پوچھا۔ خوب صورت سی سیکرٹری نے ٹائپ کرتے ہاتھ روکے اور نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جی' مگر وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس اپائنٹمنٹ ہے؟"

"ضرورت نہیں۔" تلخی سے کہہ کر وہ آفس ڈور تک آیا اور دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہو گیا۔ حلیمہ ہڑبڑا کر پیچھے لپکی۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" بہت غصے سے وہ اس کی میز تک جا پہنچا۔ ہاشم' جو کوٹ پیچھے لٹکائے' شرٹ اور ویسٹ میں ملبوس بیٹھا فائل پہ کچھ لکھ رہا تھا' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر پیچھے آتی حلیمہ کو اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ رکی اور پھر پلٹ گئی۔ کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگاتے' اس نے اب سنجیدگی سے سعدی کو دیکھا جو غصیلی آنکھوں اور سرخ کانوں کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" بنا کسی غصے یا تلخی کے ہاشم بولا تو آواز سخت تھی۔ اسے سعدی کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

"یہ تو آپ بتائیں گے۔" دونوں ہاتھ میز پہ رکھے وہ سامنے کو جھکا۔ "زمر کو کیوں بتایا جو حنین نے آپ کو بتایا تھا؟"

"کیا اتنی بڑی قیامت آگئی ہے سعدی کہ تم اپنے مینرز بھول گئے ہو؟" اب کے اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ قلم میز پہ رکھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے' ٹیک لگاتے اس لڑکے کو دیکھا۔

"لعنت بھیجتا ہوں میں مینرز پہ۔ مگر آپ کے مینرز کیا ہوئے جب حنہ اور میرا اعتماد توڑا؟"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ زمر تم لوگوں کے لیے غیر ہے۔ بتانے کا شکریہ۔ اب میں کام کرلوں؟" تلخی سے اس کو گھورتے سامنے فائلوں کے ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔ "اور تم بھول گئے ہو تو یاد دلا دوں کہ میں اہم معاملات میں الجھا ہوں اور اپنی تمام کمپنیز اور کارٹیل کی ان دنوں سربراہی کر رہا ہوں' کیونکہ میرا باپ سات دن پہلے مرا ہے۔"

"میرا باپ دس سال پہلے مرا تھا' اس لیے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم باپوں کو درمیان سے نکال کر بات کریں۔" اس انداز پہ ہاشم نے لب "اوہ" میں سکیڑے' تعجب سے ابرو اٹھائے۔

"تو تم مجھ سے لڑنے آئے ہو؟" اس نے زور سے فائل بند کر کے پرے کی اور ڈھیروں غصہ ضبط کیا۔ سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔

"میری کیا مجال کہ میں آپ سے لڑوں؟ میں صرف آپ کو کنفرنٹ کرنے آیا ہوں اور کنفرنٹ کرنے کے لیے آپ کے آفس سے بہتر جگہ کوئی نہیں تھی۔ سو مجھے بتائیں' کیوں بات کی آپ نے زمر سے؟ انہوں نے مجھ پہ اعتماد کیا تھا' اب کیسے دوبارہ کریں گی؟" وہ کافی بدتمیزی سے کھڑا بول رہا تھا۔

"کیا میں نے تم سے جواب مانگا تھا جب تم نے میرے کیے وکیل کو فائر کیا تھا؟" وہ تلخی مگر ضبط سے بولا تو سعدی مزید بھڑک اٹھا۔

"مانگیں جواب۔ میں دوں گا ہر جواب۔" ساتھ ہی میز پہ زور سے ہاتھ مارا وہ انتہائی غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"تو کیوں کیا میرے وکیل کو فائر؟"

"کیوں کہ وہ وکیل بھی آپ جیسا تھا ہاشم بھائی۔ آپ کی طرح اسے بھی فارس غازی کی بے گناہی کا یقین نہیں تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے' میں بچہ ہوں؟ اونہوں!" نفرت سے اسے دیکھتے سر نفی میں ہلایا۔ "میری سب سمجھ میں آگیا ہے۔"

"پھر؟ کیا کرو گے تم؟" وہ اب بھی برداشت کر رہا تھا۔

"میں آپ سب پہ ثابت کروں گا کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیے تھے۔ آپ' زمر سب ایک جیسے ہیں۔ آپ سب نے ان کو اکیلا کر دیا ہے۔ اتنے سال میں آپ ایک دفعہ ان سے ملنے جیل نہیں گئے۔ لوگوں کی

باتیں آپ کے دل میں بھی بیٹھ گئی ہیں' اور آپ بھی... آپ بھی باقیوں کی طرح ہی ہیں۔" کہتے ہوئے وہ بے حد ہرٹ اور دکھی سا لگتا پیچھے ہٹا۔ ہاشم تختی اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وکیل کے بدلاؤ پہ باز پرس کرنے پہ تم مجھ سے ایسے بات کرو گے' تو میں اس ذکر کو نہ چھیڑتا۔" ہاشم کا صدمہ اور غصہ' حقیقی تھا۔

"مجھے آپ کی بات سے فرق نہیں پڑتا۔" وہ پیچھے ہٹتے مزید بلند آواز میں غصے سے بولا تھا۔ "آپ کا امیج میری نظروں میں تباہ ہو چکا ہے۔ اس لیے بتادوں' آپ کے والد کے چہلم کا دعوت نامہ آیا تھا' میں نہیں آؤں گا' میرے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ آئندہ ہمیں کسی بھی دعوت پہ بلانے کی زحمت نہیں۔ تہینہ گا' انکار سن کر آپ کو خود شرمندگی ہو گی۔" تنفر سے جذباتی انداز میں کہتا وہ مڑا اور باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کرتے اسے اندر کا منظر جو نظر آیا اس میں ہاشم غم و غصے اور قدرے صدمے میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر دروازہ بند کردیا۔

راہداری میں چلتے سعدی نے گہری سانس لی۔ دانستہ بھڑکائے اور تنے اعصاب کو گویا ڈھیلا کیا۔ ہاتھ اب بھی قدرے لرز رہے تھے' اور دل دھڑک رہا تھا۔ لفٹ کے پاس رکا تو اس کے دھاتی دروازے میں اپنا عکس دیکھتے خود کو شاباش دی۔

"اچھی پرفارمنس تھی سعدی! اگر جواہرات پہ نہ کرتی' تب بھی میں نے ان کے گھر نہ جانے کا کوئی تو بہانہ ڈھونڈنا ہی تھا کہ اب ان کے ساتھ ایک میز پہ کھانا کھانا' ہنس کر بات کرنا' سب عذاب تھا۔ ہر جگہ وارث کا خون نظر آتا۔ سو اچھا کیا تم نے سعدی۔ اب ہاشم بھائی کم از کم یہ نہیں جان سکیں گے کہ میں ان کی اصلیت جانتا ہوں۔ اسے صرف اعتماد توڑنے کا غصہ خیال کریں گے' اگر یہ نہ کرتا تو میرے کھنچے کھنچے رویے سے وہ سمجھ جاتے۔ بہت اچھا کیا سعدی۔ روز ان کی شکل نہ دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا!" لفٹ میں کھڑے اترائی کا سفر طے کرتے وہ خود کو نارمل کرتا' داد دے رہا تھا۔ دل البتہ ویران سا تھا۔ آنکھوں میں بار بار نمی آتی جسے وہ سویٹر کی آستین سے رگڑ لیتا۔

☼ ☼ ☼

بھولنے والا لوٹ تو آیا
وقت مغرب یا عشاء کا تھا

چھوٹے باغیچے والے گھر میں کچن سے پکتے کھانے کی مہک یوں پھیل رہی تھی جیسے پانی کے گلاس میں ٹپکا انک کا قطرہ پھیلتا ہے۔ ساری فضا اشتہا انگیز خوشبو سے معطر ہو گئی تھی۔ ایسے میں حنین' سعدی کے خالی کمرے میں بے مقصد کرسی پہ بیٹھی تھی۔ کہنیاں میز پہ ٹکائے' چہرہ ہتھیلیوں پہ گرا دیا۔ عینک اتار کر سائیڈ پہ رکھ دی۔ کچھ دیر انگلی سے میز پہ لکیریں کھینچتی رہی۔ پھر یکایک چونکی۔

قریب میں سفید جلد والی کتاب رکھی تھی۔ ساتھ ریپر اور کارڈ۔ سعدی وہ کتاب کسی کو تحفے میں دے رہا تھا؟ اچنبھے سے اس نے کارڈ اٹھایا۔ سالگرہ کا کارڈ' زمر کے نام۔ اوہ۔ پھپھو کی سالگرہ تھی نا چند دن بعد۔ تو سعدی وہ کتاب زمر کو دینے جا رہا تھا۔ یہ وہی کتاب تھی' جو برسوں پہلے اس نے ایک دفعہ یونہی کھول لی تھی۔ اب دوبارہ کھولی تو پہلے صفحے پہ ہاشم کا نام لکھا تھا۔ اس نے نام پہ انگلی پھیری اور مسکرا دی۔ پھر بے مقصد صفحے پلٹتی رہی۔ دفعتاً" درمیان میں ایک ورق پہ رکی۔

سات سو برس پہلے کے زرد زمانوں کو جاتا دروازہ سامنے تھا۔ حنین نے رک کر سوچا کہ اندر جائے یا نہیں' پھر بنا مزید کچھ سوچے اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے دھکیلا۔ لکڑی کے قدیم منقش پٹ وا ہوئے۔ وہاں سے ڈھیروں روشنی کا سیلاب لڈ آیا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

روشنی قدرے تھمی تو اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ قدیم دمشق کے اس زردے مکان کے باہر کھڑی تھی جو مسجد سے ملحقہ تھا۔ ایک زمانے میں اس نے یہاں مجمع میں گھرے ایک "بیمار" کو دیکھا تھا۔ آج یہاں ویرانی تھی۔ سناٹا تھا۔ زرد سی شام اتر

رہی تھی۔ روشنی اب ختم ہو چکی تھی۔ مکان کے اندر چراغ جل رہے تھے۔ پاجامے ' لمبی قمیص اور ہیئر بینڈ لگے بالوں والی حنین اس سارے زرد منظر نامے میں واحد رنگین شے تھی۔ اس نے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بلی کی چال چلتی ' پھونک پھونک کر قدم رکھتی مکان کے اندر آئی۔ پہلے کمرے کا پردہ ہٹایا اور سر نیچا کر کے اندر داخل ہوئی۔

اس مطالعاتی کمرے میں جگہ جگہ دیے جل رہے تھے یا چند ایک موٹی موم بتیاں۔ دیوار میں بنے خانوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے فرش پہ دوزانو ہو کر شیخ معلم بیٹھے تھے ' اور چوکی پہ دھرے کورے پرچے پہ قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھتے جا رہے تھے۔

وہ سینے پہ بازو لپیٹے چوکھٹ میں کھڑی تنقیدی نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ پھر دل کڑا کر کے پکارا۔

"کیا آپ نے اپنی کتاب ختم نہیں کی؟" وہ سر جھکائے لکھتے رہے۔ حنین نے آنکھیں ناراضی سے سکیڑیں۔ اردگرد سب زردی مائل تھا ' جیسے پرانے زمانے کا رنگ ہو اور ایک وہی کلر فل تھی۔ پھر قدم قدم چلتی قریب آئی۔ چوکی کے عین سامنے۔ سر ترچھا کر کے گویا جھانکا۔

"کیا آپ کی کتاب میں واقعی دل کی بیماریوں کا علاج ہے؟" پوچھتے وقت شکل یوں بے نیاز بنائی گویا جواب میں دلچسپی نہ ہو ' مگر ساری حسیات جواب پہ لگی تھیں۔

"ہر مرض کی دوا ہے۔ جو اسے جانتا ہے ' وہ اسے جانتا ہے ' اور جو اسے نہیں جانتا۔" سر جھکائے لکھتے ہوئے وہ بولے تھے۔

"آہ ' آپ کے زمانے کے مرض!" اس نے گویا مایوسی سے ہاتھ جھاڑے۔ پھر سامنے بیٹھی ' چوکی پہ کہنی رکھی اور ہتھیلی پہ تھوڑی گرائی۔

"طاعون اور دوسرے وبائی مرض ہمارے زمانے میں نہیں ہوتے۔ ہمارے مسئلے اور ہیں ' یو نو۔ مگر نہیں ' آپ کو کیا پتا۔" پھر جیسے اسے غصہ آیا۔ تیوری چڑھا کر بولی۔ "آپ سات سو سال قدیم کے ایک بوڑھے ہیں۔ ایک نائیو (naive) بوڑھے۔ آپ کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ کمپیوٹر کیا ہوتا ہے ' انٹرنیٹ کیا ہوتا ہے ' ٹی وی شوز کسے کہتے ہیں۔۔۔ اور وہ زندگی کیسے تباہ کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔۔۔ اف!" جیسے کراہ کر سر جھٹکا۔ افسوس سے ان کو دیکھا۔

"آپ کی کتاب میری مدد نہیں کر سکتی ' کیونکہ اس میں میرے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

وہ ہنوز قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھتے جا رہے تھے تو زچ ہو کر حنین ان کے پرچے پہ جھکی۔ گردن ترچھی کر کے پڑھا۔

"اے ایمان والو! بے شک خمر اور میسر ' اور انصاب اور ازلام شیطان کے گندے کاموں میں سے ہیں ' پس ان سے بچو تاکہ تم نجات پاؤ۔" حنین نے سر اٹھایا ' آنکھیں سکیڑ کر مشکوک نظروں سے ان کو دیکھا۔

"مجھے پتا ہے یہ آیت ہے ' مطلب بھی پتا ہے۔ خمر ہوتی ہے شراب۔

میسر ہوتا ہے جوا۔

انصاب ہوتے ہیں بت اور ازلام۔۔۔"

آنکھیں میچ کر ذہن پہ زور دیا۔ "ہاں ' فال کے تیر وغیرہ ' رائٹ؟

مگر اے شیخ! یہ میرے ملک کی میرے جیسی مڈل کلاس کی لڑکیوں پہ اپلائی نہیں ہوتا۔" نہایت افسوس سے ان کو دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کے زمانے میں ہوتے ہوں گے دمشق میں شراب کے مٹکے۔ وہ جیسے نسیم حجازی کے ناولز میں ہوتے تھے ' ہم تو اس مشروب کا نام بھی نہیں لیتے ' لینا پڑے تو انگریزی میں الکحل کہہ دیتے ہیں ' انگریزی میں چیزیں کم بیہودہ لگتی ہیں۔"

رازداری سے آگے ہو کر ان کو اطلاع دی۔ وہ سنے بغیر لکھتے جا رہے تھے۔

"بہرحال ' شراب ' جوا ' بت ' پانسے ' کسی سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں میرا۔۔۔ سو۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھی۔ "آپ کی کتاب میرے کسی کام کی نہیں۔ جیسا

کہ میں نے کہا' آپ سات سو برس پرانے ایک نائیو بوڑھے ہیں۔" قدرے مایوسی' قدرے خفگی سے وہ واپس جانے کو مڑی۔

دو زانو بیٹھے' قلم سے پرچے پہ لفظ اتارتے شیخ نے ہولے سے پکارا۔

"جب شراب حرام کی گئی تھی تو وہ برتن بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ پی جاتی تھی۔" وہ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے' "غالباً" لکھتے ہوئے اونچا بول رہے تھے۔ حنین نے تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

"جیسا کہ میں نے کہا' آپ کے اور میرے زمانے کے مسائل مختلف ہیں۔"

قدیم دیوان خانے کی موم بتیاں ہنوز جھلملا رہی تھیں۔ وہ ان کی مدھم روشنی میں راستہ بناتی آگے آئی اور چوکھٹ کا پردہ ہٹا دیا۔ دوسری جانب مہیب تاریکی تھی۔ اس نے تاریکی میں قدم رکھا اور.... اور کتاب بند کر دی۔ سر اٹھایا تو بھائی کی اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ کمرہ سفید ٹیوب لائٹ سے روشن تھا۔ لاؤنج سے بولنے کی آواز آرہی تھیں۔ حنین نے بے دلی سے کتاب واپس رکھی' اٹھی ہی تھی کہ سعدی اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر رکا' پھر نظریں چرا کر الماری کی طرف چلا گیا۔

"ناراض ہیں آپ؟" وہ بے قراری سے اس کے پیچھے آئی۔ چند لمحے وہ یونہی کھڑا رہا' پھر اس کی طرف گھوما۔

"نہیں میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔" گہری سانس لے کر بولا۔

"دل سے کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ اس کے سامنے آیا۔ نرمی سے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ پہ بٹھایا اور قریب بیٹھا۔ وہ سر جھکائے اپنے گھٹنوں کو دیکھتی رہی۔

"تم کسی کی موت کی ذمہ دار نہیں ہو حنہ۔ اوسی پی صاحب کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا تمہارا۔ ان کو تم پہ نہیں اللہ پہ بھروسا کرنا چاہیے تھا۔ امی کے پاس جاتے' تمہاری حرکت بتاتے' تو امی تمہیں دو تھپڑ لگا کر ان کا کام بھی کروا تیں اور معافی بھی مانگنے کو کہتیں۔ ان کو پیپرز بھی نہ دینے پڑتے اور کام بھی ہو جاتا۔ مگر انہوں نے بزدلی کا راستہ منتخب کیا۔ یہ ان کی بھی غلطی ہے۔ سو اب بہتر ہے کہ ہم اس واقعے کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔" حنین نے جھکے سر کو نفی میں ہلایا۔

"میں ایڈمیشن نہیں لے رہی۔ میں بی اے کروں گی۔"

"ٹھیک ہے' اب تم انجینئر نہیں بنو گی۔ تم یہ ڈیزرو نہیں کرتیں۔ سب کہتے تھے' حنہ کو ہر وقت کمپیوٹر کے آگے مت بیٹھنے دیا کرو' بچی بگڑ جائے گی' مگر میں نے تمہارا انٹرنیٹ' کمپیوٹر' گیمز' کچھ نہیں روکا کبھی۔ مجھے تم پہ اعتبار تھا۔ تم نے میرا اعتبار توڑا ہے۔ حنہ ایک لفظ کی چیٹنگ بھی آپ کی ڈگری کو "ناجائز" بنا دیتی ہے۔ جو لوگ چیٹنگ کر کے میڈیکل میں ایڈمیشن لیتے ہیں' وہ ساری عمر مفت علاج بھی کرتے رہیں' تب بھی ان کی کمائی پاک ہو گی کیا؟ اللہ کے اصول بدلے نہیں جاتے۔ یو نو واٹ حنہ میں تمہیں اس کے لیے معاف کر رہا ہوں' کیونکہ تم میں اور وارث ماموں کے قاتل میں فرق ہے۔ تم نے کہا ان کو گلٹ محسوس ہوا ہو گا' تمہیں وہ بھی نہیں ہوا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں' مجھے بھی لگتا ہے ان کو گلٹ ہوا ہو گا' وہ ماموں کی قبر پہ بھی گئے ہوں گے' ان کے نام پہ چیرٹی بھی کی ہو گی' آج بھی ماموں کے قاتل اگر ماموں کی بچیوں کو دیکھ لیں تو ان کے لیے بہت دکھ محسوس کریں گے' مگر کیا دکھ ہونا کافی ہوتا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بڑے گناہوں کے کفارے ہوتے ہیں' خالی خولی گلٹ اور دکھ جائے بھاڑ میں۔ ذرا دیر کو زرتاشہ کا سوگ انہوں نے بھی منایا ہو گا' اور پھر؟ کیا اعتراف جرم کیا؟ کیا کفارہ ادا کیا؟ خود کو قانون کے حوالے کیا؟ نہیں! تم ان جیسی نہیں ہو۔ تم نے کفارہ ادا کیا ہے اور حنہ! کفاروں کے بعد گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ او سی پی صاحب کی جان تم نے نہیں ان کی بیٹی اور ان کی بزدلی نے لی ہے۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں' مگر مجھے بہت عرصہ لگے گا دوبارہ تم پہ اعتبار کرنے میں' اور اب تم جو

بھی پڑھنا چاہتی ہو پڑھو' لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو گی۔ ایک پکا عہد کہ تم دوبارہ یہ کام نہیں کرو گی۔ کیونکہ حنہ! اگر کبھی مجھے یہ پتا چلا کہ حنین نے دوبارہ بیپر میں چیٹنگ کی ہے' تو اس دن ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔" انگلی اٹھا کر سختی سے وہ تنبیہہ کر رہا تھا۔ "مجھے دوبارہ کبھی یہ سننے مت دینا حنہ! کہ تم نے پھر سے یہی کام کیا ہے۔"

حنین نے جھٹ سر اثبات میں ہلا دیا۔ (ایسا تو کبھی بھی نہیں ہو گا' کبھی بھی نہیں۔ اسے یقین تھا۔)

"مگر حنہ! فی الحال' بی اے کرنا بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے مسئلہ تمہاری ایڈکشن ہے۔ کمپیوٹر اور ٹی وی ڈراموں کی ایڈکشن۔"

"ایڈکشن؟" وہ چونکی۔ بری طرح۔ ایک دم سب رک گیا۔ وہ سات صدیاں پہلے کے شیخ معلم کے نیم تاریک دیوان خانے میں بیٹھی تھی' اور دور کہیں سعدی بول رہا تھا۔

"میں بھی دو تین ڈرامے فالو کرتا ہوں۔ پچھلے دو سال سے Suits اور چار پانچ سالوں سے Grey's Anatomy دیکھ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ڈرامے مت دیکھو' فلمیں مت دیکھو' میں یہ کہوں گا تو تم نہیں مانو گی۔ میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ حد میں رہ کر دیکھو۔ زیادتی کسی بھی چیز کی ہو نقصان دیتی ہے۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی' چپ چاپ سوچے گئی۔

"کیا سوچا پھر تم نے؟"

"خمر شیطان کی گندگی میں سے ہے۔" وہ ہولے سے بولی تو سعدی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اسے بات کا موقع محل سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ دور کسی اور زمانے میں بیٹھی بول رہی تھی۔

"شیخ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہر شخص کا خمر مختلف ہوتا ہے۔ پتا ہے الکحل کیوں حرام ہے؟ کیونکہ وہ نشہ کرتی ہے' اور لت ڈالتی ہے۔ ہر نشے والی چیز خمر ہوتی ہے۔ چاہے وہ مشروب نہ ہو یا اس کا رنگ سرخ نہ ہو۔ میرا خمر یہ سب تھا۔ یہ کمپیوٹر' موبائل' انٹرنیٹ' ٹی وی۔ سو اب۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گی۔" کوئی عزم تھا جو اسی لمحے کر لیا۔ سعدی نے بے اختیار سمجھانا چاہا۔

"حنہ' کوئی بھی چیز بذات خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا....."

"بالکل بھی مت کہیے گا یہ فضول بات' جو لوگ دہرا دہرا کر نہیں تھکتے۔" وہ غصے سے بولی۔ "ہر چیز کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بذات خود اچھی یا بری نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کا برا استعمال ان کے اندر برائی کا اثر اتنا راسخ کر دیتا ہے کہ ان میں آپ کے لیے اچھائی ختم ہو جاتی ہے۔ جب خمر ممنوع ہوئی تھی تو ان برتنوں کو بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ پی جاتی تھی۔ آپ خمر کے برتن میں آب زمزم نہیں پی سکتے بھائی۔"

"خیر' آج کل کے برتنوں کو دھو کر استعمال کیا جا سکتا ہے' وہ اس زمانے میں کدو کے برتن تھے جو۔" وہ اسے فتویٰ اور فقہ بتا رہا تھا مگر حنین نے نفی میں سر ہلایا۔

"زمانہ نہیں بدلا بھائی۔ اب بھی مسئلے وہی ہیں' جو سات سو سال پہلے کے دمشق میں ہوا کرتے تھے۔ کسی اور کے لیے یہ چیزیں بری نہیں ہوں گی' مگر میرے لیے ہیں۔ میں ان کو اب ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔" نفی میں سر ہلاتی حنین کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

"لیکن حنہ' الکحل بھی اکٹھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ منع کی گئی تھی۔ تین حصوں میں۔ ایک دم سے ان چیزوں کو زندگی سے نکالو گی تو اپنا ایک حصہ ان ہی کے ساتھ کھو دو گی۔ اڈیکٹڈ آدمی کو ایک دم سے منشیات سے نہیں ہٹایا جاتا۔ ڈوز ہلکی اور مزید ہلکی کی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ چھوڑو۔ خود کو دبا کر' جبر کرو گی تو کتنا عرصہ ضبط ہو گا؟ ایک دن اسپرنگ کی طرح واپس وہیں آ جاؤ گی۔"

"نہیں۔ اگر ابھی نہیں چھوڑا تو کبھی نہیں چھوڑ سکوں گی۔" وہ ناں میں گردن ہلائے جا رہی تھی۔ سعدی نے مزید سمجھانا چاہا' مگر حنہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اگر وہ اپنا ضبط نفس آزمانا چاہتی تھی' تو

سعدی کو اسے روکنا نہیں چاہیے۔
اگلے روز ندرت نے جب کچن کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر لاؤنج میں جھانکا تو دیکھا' وہ کمپیوٹر پیک کر کے سعدی کے کمرے میں شفٹ کر رہی تھی۔ اسمارٹ فون میں سے اس نے پہلے ہی سم نکال کر اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا اور امی کی سم چھوٹے پرانے نوکیا سیٹ میں ڈال کر انہیں دے دی کہ میں اب یہ نہیں استعمال کروں گی۔ ندرت کو سعدی نے پتا نہیں کیا کہہ کر سمجھایا تھا کہ وہ پہلے تو چپ رہیں' پھر ڈانٹنے لگیں' انہیں اس کے انجینئرنگ میں ایڈمیشن نہ لینے کا بہت دکھ تھا' مگر وہ بے حس بنی سنتی گئی۔ کتنے دن ندرت نے اس کے ساتھ سر پھوڑا' پھر خود ہی تھک کر خاموش ہو گئیں۔ زندگی میں اور بھی غم تھے حنین کے سوا۔
اور اس تنہائی اور خاموشی کی نئی سرنگ میں داخل ہونے کے بعد حنین یوسف کے لیے ایک ہی روزن تھا۔ اپنا عہد! اگلے بورڈ ایگزام میں (ای اے کے فائنل ایگزام میں) وہ اپنی محنت سے پاس ہو گی جیسے سیکنڈ ایئر سے پہلے ہر سال ہوتی آئی تھی' اور جس دن ایمان داری کا رزلٹ آئے گا' اس کے دامن پہ لگا بے ایمانی کا داغ دھل جائے گا۔ بھائی اس پہ پھر سے اعتماد کرنے لگے گا۔ اب وہ کبھی بھی اس کو یہ سننے کا موقع نہیں دے گی کہ حنین نے چیٹنگ کی ہے۔ اب حنین ایسا کبھی بھی نہیں کرے گی۔ سعدی نے کہا تھا اگر اسے دوبارہ ایسا کچھ پتا چلا تو اس دن وہ دونوں الگ ہو جائیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہو گا' اسے یقین تھا۔
وہ غلط تھی۔



یہ عیاں جو آب حیات ہے اسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے!

جیل کا ملاقاتی کمرہ مایوسی اور ڈپریشن کی فضا سے بوجھل ان دونوں کے گرد موجود تھا۔ فارس پیچھے کو ٹیک لگائے' ٹانگ پہ ٹانگ جما کر' منہ میں کچھ چباتا' نظریں آگے پیچھے کی چیزوں پہ دوڑا رہا تھا' جبکہ سعدی دبے دبے غصے اور خفگی سے اسے گھور رہا تھا۔
"اور وہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ نے انہیں استعمال کرنے کی کوشش کی۔"
"بریکنگ نیوز سعدی! ہر بات تمہاری پھپھو کی وجہ سے نہیں ہوتی۔" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔
"اتنی مشکل سے وہ راضی ہوئیں آپ سے ملنے کے لیے اور آپ نے سب کچھ غارت کر دیا۔" وہ دبا دبا چلایا تھا۔
"تو کیا کروں؟" فارس نے برہمی سے سعدی کو گھورا۔ "مزید ڈھائی سال یہاں گزاروں؟"
"جب میں نے کہا تھا کہ آپ کو یہاں سے نکال لوں گا تو... ؟ کیا ضروری تھا زمر کو دوبارہ خود سے بدظن کرنا؟" اس کا غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔
"وہ ہمیشہ سے مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ تمہاری ذہین فطین پھپھو (طنز سے اسے دیکھا) اتنا تو پتا نہیں لگا سکیں کہ فارس غازی بے گناہ ہے!"
اس بات پہ وہ پیچھے ہو کر بیٹھا' آنکھیں سکیڑ کر چبھتی ہوئی نظروں سے فارس کو گھورا اور پھر چبا چبا کر بولا۔
"فارس غازی صاحب! میری پھپھو آپ سے کئی گنا زیادہ اسمارٹ اور سمجھ دار ہیں' آپ کی طرح وہ ہاتھوں سے نہیں سوچتیں' دماغ سے سوچتی ہیں۔ اور ہاں' اگر آپ کی جگہ وہ جیل میں ہوتیں تو ڈھائی سال کیا' ڈھائی دن میں باہر نکل آتیں۔"
"تھینک یو ویری مچ سعدی! میں بہت مرعوب ہوا ہوں۔" اس نے اتنی ہی برہمی سے سر جھٹکا۔
"آپ کو یہ بات حیران کر رہی ہے کہ اتنی اسمارٹ ہو کر بھی ان کو آپ کی بے گناہی کا یقین نہیں ہے؟"
کچھ دیر بعد وہ قدرے ہموار لہجے میں بولا۔ فارس کچھ کہے بنا اسے دیکھنے لگا۔ "ماموں! آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ بات ذہانت یا بے وقوفی کی نہیں ہے۔ امی کو دیکھ لیں۔ امی بالکل بھی ذہین نہیں ہیں۔ دودھ چولہے پہ رکھ کر بھول جاتی ہیں۔ ان سے پوچھو کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پہ حملہ کب ہوا تھا تو تاریخ یا سن یاد نہیں ہو گا'

مگر کہیں گی، تب سعدی فلاں کلاس میں تھا۔ ان کا کیلنڈر ان کے بچوں کی پیدائش، ان کے چلنے، بولنے، یا فلاں کلاس میں ہونے کے مطابق ان کے ذہن میں فٹ ہے۔ بالکل ہی بھولی ہیں امی۔ مگر جب میں نے ان سے کہا کہ ماموں کی جعلی ٹیپ سن لیں تو انہوں نے نہیں سنی، سن لیتیں تب بھی نہ مانتیں۔ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ان کو جتنے ثبوت آپ کے خلاف مل جائیں، وہ آپ کو گناہ گار نہیں مانیں گی۔ پتا ہے کیوں؟"

"کیونکہ ان کو مجھ پہ اعتبار ہے اور۔" وہ ٹھہرا، اثبات میں سر ہلایا۔ "اور میڈم زمر کو مجھ پہ اعتبار نہیں ہے!" بہت سالوں بعد اس کو وہ بات سمجھ آئی تھی۔

"بالکل۔ وہ آپ پہ اعتبار نہیں کرتیں، سو اب آسمان سے فرشتے اتر کر بھی آپ کے حق میں گواہی دیں، وہ تب بھی نہیں مانیں گی، کیونکہ ٹوٹا اعتبار جوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور وہ کیوں کریں آپ پہ اعتبار؟ وہ آپ کو جانتی ہی کتنا ہیں؟ چند ماہ کے لیے آپ ان کے اسٹوڈنٹ رہے تھے، وہ کبھی بھی آپ سے بے تکلف نہیں تھیں، آپ کام کے علاوہ ان سے کبھی کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کام پڑنے پہ آپ سے رابطہ کر لیتیں یا خاندانی تقریبات میں آپ سے سرسری سی ملاقات ہو جاتی اور بس۔ وہ آپ کو ویسے نہیں جانتی تھیں جیسے ہم جانتے ہیں۔ جیسے امی جانتی ہیں۔ جس دن وہ آپ کو جاننے لگیں گی، اسی دن اعتبار بھی کرنے لگیں گی، اس لیے پلیز، ان کو دشمن سمجھنا چھوڑ دیں۔" ایک ایک لفظ پہ زور دیتا وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ "زمر دشمن نہیں ہیں، زمر وہ واحد انسان ہیں جن کو میں اپنے ساتھ کھڑا کرنا چاہتا ہوں اس جنگ میں، مگر ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ان کو الزام مت دیں۔ میں آپ کو باہر نکال لاؤں گا، ٹرسٹ می۔ صرف چند ماہ۔ مجھے چند ماہ کا وقت دیں۔ میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔" سینے پہ ہاتھ رکھے، آگے جھکے، وہ خفگی سے ہی سہی التجا کر رہا تھا۔ فارس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ مگر اسے ساتھ ہی تیکھی نظروں سے بھی دیکھا۔

"اور تم کیا کرو گے؟"

سعدی نے گہری سانس لی، پیشانی انگلی سے کھجائی۔

"جو بھی کرنا پڑا۔"

"اے... بات سنو۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا، ورنہ چار دن میں ادھر جیل میں بند ہو گے۔" بے زاری اور غصے کے پیچھے جیسے وہ فکر مند ہوا تھا۔ سعدی لب بھینچے آگے ہوا، جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میری جو مرضی آئے میں کروں گا، جو بھی کرنا پڑا کروں گا۔ زیادہ مسئلہ ہے آپ کو تو مجھے گرفتار کروا دیں۔" ڈھٹائی سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس نے بے بسی بھری برہمی سے اسے گھورا۔

"کچھ غلط کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں آپ پہ احسان کرنے جا رہا ہوں، اس امید پہ کہ شاید کبھی آپ بھی ایسا ہی احسان میرے اوپر کرنے کے قابل ہوں۔ اوہ اینڈ یو آر ویلکم!"

مسکرا کر سر کے خم سے اس کا وہ شکریہ قبول کیا جو اس نے نہ کہا تھا نہ کہنا تھا۔ اور پھر جب وہ مڑا تو اس نے سنا، فارس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا تھا۔

"سنو۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"



سمجھتا کیا ہے تو دیوانہ گان عشق کو زاہد!
یہ ہو جائیں گے جس جانب، اسی جانب خدا ہو گا!

سعدی قدم قدم زینے چڑھتا اوپر آیا۔ راہداری کے سرے پہ عمارت کا فلور نمبر لکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی چٹ سے پتہ ٹیلی کیا اور ادھر ادھر گردن گھمائی۔ آگے پیچھے فلیٹس کے بند دروازے تھے۔ وہ دائیں طرف کے دوسرے دروازے پہ آیا اور بیل بجائی۔

"کون ہے؟" اندر سے مردانہ آواز سنائی دی۔

"مجھے... مجھے احمر شفیع سے ملنا ہے۔"

دروازہ کھلا، ذرا سی درز سے اس نوجوان نے باہر

جھانکا۔ ماتھے پہ بکھرے بال' ٹراؤزر پہ شرٹ پہنے' وہ سیاہ آنکھوں والا نوجوان تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک سعدی کا جائزہ لیا جو جینز پہ گول گلے کا سوئیٹر پہنے کھڑا متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کوئی پیزا آرڈر نہیں کیا۔" وہ بے زاری سے دروازہ بند کرنے لگا۔ سعدی جلدی سے بولا۔

"میں سعدی ہوں۔ فارس غازی کا بھانجا۔" (کیا میں دیکھنے میں ڈلیوری بوائے لگتا ہوں؟)

بند کرتے کرتے وہ رکا' پھر دروازہ پورا کھول دیا۔ اب کہ نوجوان نے قدرے غور سے اسے دیکھا' پھر سر ترچھا کر کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سعدی قدرے ہیجان سے اندر آیا۔

"آپ حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے ہیں' ماموں نے بتایا تھا۔" چھوٹے سے فلیٹ کو طائرانہ نظروں سے دیکھتے' وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑا برائے بات بولا۔ جواب میں احمر نے شانے اچکائے۔

"ہوں۔ میرے وکیل نے سارے ثبوت مٹا دیے اور اس گھنگھریالے بالوں والی چڑیل پراسیکیوٹر کو نتیجتاً" چارجز ڈراپ کرنے پڑے۔" وہ اوپن کچن میں آیا' فریج کھولا۔ دو کوک کے کین نکالے اور مڑا تو سعدی صوفے کے ساتھ کھڑا بالکل چپ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھو۔" اس نے اسی لاپروائی سے اشارہ کیا مگر وہ نہیں بیٹھا۔

"وہ گھنگھریالے بالوں والی پراسیکیوٹر میری سگی پھپھو ہیں۔"

دانت سے کین کا منہ کھولتے احمر کو گویا ہچکی آئی۔ بمشکل سنبھالتے وہ چہرے پہ معذرت خواہانہ تاثر لایا۔

"آئی ایم سوری' میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ وہ بہت اچھی ہیں' میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ بیٹھو نا!"

ایک لمحے کو سعدی نے راہداری کو جاتے دروازے کو دیکھا گویا وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو' مگر یہ تو وہ جان گیا تھا کہ پہلے تاثر سچ نہیں ہوتے' سو سر ہلا کر صوفے پہ بیٹھا۔ احمر نے دوسرا کین اس کی طرف اچھالا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں کیچ کیا۔ (یونہی بنا نہیں کیوں تو شیرواں یاد آیا)

چند منٹ بعد وہ دونوں صوفوں پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سعدی گھٹنے برابر رکھے' آگے ہو کر' اور احمر صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' ایک پیر جھلاتا' اپنی سیاہ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں' جج فارس غازی کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اس کے لیے میں کیا کروں؟ ماموں نے کہا تھا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

احمر نے کین اونچا کر کے گھونٹ بھرا' پھر اسے نیچے کیا۔ ابرو اچکائے۔

"وہ سمپل۔ ایک Presentation تیار کرو' اس میں غازی کے حق میں سارے ثبوت ڈالو اور یہ دکھاؤ کہ وہ کتنا اچھا انسان ہے' پھر اسے ایک فلیش ڈرائیو پہ ڈالو' اور وہ ڈرائیو جج کے گھر لے جاؤ' اس سے درخواست کرو کہ وہ یہ دیکھ لے' اس کے کمپیوٹر پہ اسے چلاؤ۔ پھر اس کی خوب منت کرو کہ وہ اسے رہا کر دے۔"

"کیا صرف منت کرنے سے وہ رہا کر دے گا؟"

"اے نہیں یار!" احمر نے بدمزہ ہو کر ناک سے مکھی اڑائی۔ "جو فلیش تم اس کے کمپیوٹر میں لگاؤ گے' وہ اس کے سسٹم میں ایک mole داخل کرے گی۔ اس کے بعد جج صاحب اس کمپیوٹر پہ جو کچھ لکھیں گے' یا دیکھیں گے' اس کی لحہ بہ لحہ خبر تمہارے کمپیوٹر پہ آجائے گی۔ چند ہفتوں میں تمہیں اچھا خاصا مواد مل جائے گا جج کے خلاف۔ پہلے گمنام طریقے سے اسے بھیجنا۔ اگر وہ ڈر جائے اور جھانسے میں آجائے' تو کھلم کھلا بلیک میل کرنا۔ چند مہینوں میں غازی باہر ہو گا۔"

سعدی کا منہ کھل گیا۔ پھر آہستہ سے اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ (واؤ) احمر اب آخری گھونٹ اندر انڈیل رہا تھا۔

"ایک اور کام بھی ہے۔"

"بولو۔" اس نے کین رکھ کر سنجیدہ متوقع نظروں

"بلکہ۔۔" احمر رکا، تھوڑی پہ دو انگلیاں رکھے کچھ سوچا۔ "مسز شہرین سے کیش لینا۔ چیک نہیں۔ اسے یہ نہیں پتا چلنا چاہیے کہ یہ کام مجھ سے کروا رہے ہو۔"

"کیوں؟"

"وہ اپنے شوہر کو بتادے گی اور وہ سارا غصہ مجھ پہ نکالے گا۔ اسے ویسے ہی میں ناپسند ہوں۔"

"ارے نہیں۔ وہ دونوں علیحدہ ہو چکے ہیں' اور وہ تو خود اسے ہاشم بھائی سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔" اس کی بات پہ احمر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"پتا ہے عورتوں کا مسئلہ کیا ہوتا ہے؟" قریب آکر قدرے رازداری سے پوچھا۔ سعدی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "وہ کسی نہ کسی کے سامنے کبھی نہ کبھی بول ہی پڑتی ہیں' سو آج نہیں تو دو سال بعد وہ ہاشم کو ضرور بتائے گی۔ Always a Kardar Once a Kardar اس لیے۔" ابرو اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"اوکے۔ سمجھ گیا۔" اور اس کا پھر سے شکریہ کہتا باہر جانے کو مڑا۔

"ویسے غازی کے کیس سے شہرین کاردار کا کیا تعلق؟" ٹھوڑی کھجاتے ہوئے اس نے قدرے پرسوچ انداز میں پوچھا۔ سعدی کے قدم تھمے۔ احمر کی جانب پشت تھی' سو تھوک نگل کر قدرے اعتماد سے پلٹا۔

"شہرین والا معاملہ ایک ذاتی فیور ہے۔ اس کا ماموں کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"آہاں۔" احمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا مطمئن ہو گیا ہو۔ اس سے زیادہ اسے دلچسپی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ حقیقت ہے جہاں ٹوٹ کے چاہا جائے
وہاں بچھڑنے کے بھی امکان ہوا کرتے ہیں

قصر کاردار پہ گہری سیاہ شام پھیل چکی تھی' جب ہاشم بیرونی دروازہ عبور کرکے لاؤنج میں داخل ہوا۔ ملازم اس کا بریف کیس لیے پیچھے تھا۔

جواہرات اپنی مخصوص اونچی کرسی پہ براجمان تھی' اور نوشیرواں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کوئی بات کر رہے تھے' ہاشم کو دیکھ کر خاموش ہوئے۔ خلاف معمول وہ سیدھا اوپر نہیں گیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا' قریبی صوفے پہ آبیٹھا۔ تھکا تھکا اور کسی سوچ میں لگ رہا تھا۔

"خیریت؟" جواہرات نے محتاط نظروں سے اس کا چہرہ تکا۔

"سعدی آیا تھا آج۔" وہ سر تلے بازوؤں کا تکیہ بنائے' پیر میز پہ رکھے' سامنے دیوار کو دیکھتے سوچتے ہوئے بولا تو جواہرات اور شیرو نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیوں کیا کہہ رہا تھا؟" گردن کی موتیوں کی لڑی پہ خوامخواہ ہاتھ پھیرتے وہ سرسری سا بولی۔ آنکھوں میں بے چینی امڈ آئی تھی۔

جواب میں وہ ساری بات اسی سوچ میں گم انداز میں بتاتا گیا' جسے سن کر جواہرات کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے' شیرو نے بھی گہری سانس لی۔

"میں نے وکیل کے بدلاؤ کی بات پہ باز پرس کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے کبھی مجھ سے ایسے بات نہیں کی۔ مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانہ چاہتا تھا۔" پھر ایک دم چونک کر گردن موڑی۔ فیونا اسپرے کی بوتل اٹھائے گزر رہی تھی۔ ہاشم نے اسے پکارا تو وہ رکی۔

"سعدی کو جانتی ہو نا؟ کیا وہ آج گھر آیا تھا؟" فیونا نے جواب دینے سے قبل ایک ذرا کی ذرا نظر جواہرات پہ ڈالی' جو دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی' پھر ہاشم کو دیکھا اور مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"نو سر۔ آخری دفعہ میں نے اسے چار روز قبل ادھر دیکھا تھا۔" ہاشم نے سر ہلا کر اسے جانے کو کہا۔

"آپ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی اس سے؟" اب وہ جواہرات کو الجھے انداز میں مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

"نہیں' کیوں؟ ہمارا کیا تعلق؟"

"نہیں مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانا ڈھونڈنے آیا تھا۔"

سے سعدی کو دیکھا۔ وہ قدرے متذبذب تھا۔
"ایک معزز خاندان کی لڑکی کی ایک گالف کلب کے ریکارڈ میں کچھ فوٹیجز ہیں جو...."
"کیسی فوٹیجز؟ جوا؟ ڈرگز؟ یا کچھ اور؟" وہ جو رک رک کر بتا رہا تھا احمر نے اتنی ہی سادگی سے پوچھا۔
سعدی نے گہری سانس لی۔ فجر پہ اٹھ کر قرآن پڑھنے والوں کو غلط باتیں کرنا زیادہ ہی غلط لگا کرتا ہے۔
"وہ کارڈز کھیل رہی تھیں۔ آف کورس 'جوا۔'" اس نے شانے اچکائے۔
"مطلب فوٹیجز غائب کرنی ہیں؟ ہو جائیں گی۔ کلب کا نام کیا ہے؟ ویسے مجھے اندازہ ہے یہ کدھر ہوا ہو گا' بہرحال' نام' تاریخ' لڑکی کی تصویر' سب دے دو۔ میں کرلوں گا۔"
"مگر آپ اس کے شوہر کو نہیں بتائیں گے۔" احمر نے اچنبھے سے ابرو سکیڑے۔
"کیا میں اس کے شوہر کو جانتا ہوں؟"
"مسز شہرین کاردار۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔
احمر چونک کر سیدھا ہوا۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی' حیرت سے اسے دیکھا۔ "ہاشم کاردار کی بیوی' اوہ ہو۔ یہ تو کافی شرمناک ہو گا کاردار صاحب کے لیے۔ بیوی کی گیمبلنگ فوٹیج؟ چچ چچ۔ یہ تو اسکینڈل بن سکتا ہے۔" اس نے ماتھے کو چھوا۔ "ہاشم کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ غازی کا کزن ہے' مجھے پسند نہیں ہے' مگر وہ ایک عزت دار آدمی ہے۔ اوہ تم اس سے ناراض تو نہیں غازی کی طرح؟"
سعدی کے چہرے پہ اس نام پہ آئی ناپسندیدگی دیکھ کر اس نے وضاحت دی۔ "اس نے تو اپنی پوری کوشش کی تھی غازی کو نکلوانے کے لیے' مگر اس کے والد نے اسے روک دیا اور انہوں نے بھی اپنے ایڈوائزر؟ کیا ان کو کسی نے فارس کی مدد نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا؟" پوچھتے ہوئے اس کے ابرو غصے سے تن گئے۔ احمر نے بے اختیار اس کو دیکھا' پھر سینٹر ٹیبل پہ رکھے کانچ کے گلدان پہ نظر ڈالی جو اگر ٹوٹتا تو بہت زور کا لگتا۔ آوچ!
"آ... ہاں شاید کسی نے مشورہ دیا تھا۔ پتا نہیں کون تھا' میں تو اڑتی اڑتی سی ہے!" گڑبڑا کر کہتے اس نے تھوک نگلا۔ سعدی سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر اصل کام یاد آیا۔
"تو کیا آپ شہرین کی فوٹیج غائب کر سکتے ہیں؟" وہ بے چینی سے آگے ہوا۔
"ہاں' لیکن وقت لگے گا' کسی اور سے نہیں کروا سکتا۔ خود کرنا پڑے گا۔"
"آپ کا اس سب پہ وقت کے ساتھ پیسہ بھی لگے گا تو...." کہتے ہوئے سعدی نے جینز کی جیب پہ ہاتھ رکھا گویا بٹوہ نکالنے لگا ہو۔ مگر احمر نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
"نہیں' میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔"
"نہیں پلیز' میں آپ کو ہائر کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو لوگ ایسے کاموں کے لیے ہائر کیا کرتے ہیں تو ظاہر ہے مجھے اچھا نہیں لگے گا اگر میں...."
"سنو بچے۔" سنجیدگی سے کہتے اس نے ہاتھ اٹھا کر سعدی کو مزید بولنے سے روکا۔ "پہلی بات۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا اور دوسری بات' جس جیب پہ تم نے ہاتھ رکھا ہے' تمہارا بٹوہ اس میں نہیں' بلکہ دوسری جیب میں ہے۔ شرمندہ مت ہونا' مجھے پتا ہے تم اپنی خودداری کی وجہ سے کہہ رہے ہو' اس لیے سنو' میں بھی اپنی خودداری کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔"
سعدی نے تکان سے ٹھنڈی سانس بھری' اب شرمندہ کیا ہونا؟ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تھینک یو' فری سروسز کرنے کے لیے۔" اور ہلکا سا مسکرایا۔
"ایک منٹ بھائی ایک منٹ!" احمر اٹھ کر آیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا "اب یہ نہیں کہا کہ فری کام کروں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا' مگر شہرین بی بی سے کہنا' میرا چیک تیار رکھیں۔"
"اوہ۔ شیور!" وہ سنبھل کر مسکرا دیا۔

کسی اور بات پہ خفا تھا اور غصہ کسی اور طرح نکلا۔" پھر ہولے سے سر جھٹکا۔ "شاید میں زیادہ ہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ اتنے سال جس لڑکے کے ساتھ میں اتنی شفقت سے پیش آتا رہا' وہ اس طرح بات کیسے کر سکتا ہے' مجھ سے؟" اسے کافی دکھ ہوا تھا۔ شیرو نے بمشکل ناگواری چھپائی۔

"وہ تو اسی طرح کا ہے۔ بدتمیز اور احسان فراموش۔ آپ کو ہی اس کی اصلیت دیر سے پتا چلی۔ مگر آپ اب بھی اس کے ساتھ وہی چھوٹے بھائی والا رویہ رکھیں گے مجھے پتا ہے۔"

"اب نہیں۔" ہاشم کے چہرے پہ تلخی گھل گئی۔ آنکھوں میں بے پناہ سختی اتر آئی۔ اس کے دل میں سعدی کے لیے گرہ پڑ گئی' سو پڑ گئی۔ "جس طرح وہ آج بدتمیزی سے بولا میں دوبارہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" پیر نیچے اتارے اور جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا۔

"یہی بہتر ہے۔" جواہرات نرمی سے مسکرائی اور شیرو کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

ہاشم تسمہ کھول کر سیدھا ہوا اور جیب سے ایک کی چین نکال کر شیرو کی جانب اچھالی' جو اس نے بروقت کیچ کی۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر چابیاں دیکھیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"تمہاری نئی کار۔" بیٹھے بیٹھے چہرہ اٹھا کر وہ تکان سے مسکرایا۔ نوشیرواں نے بے یقینی سے اسے دیکھا' اور پھر چابیوں کو۔

"نہیں' یہ وہ اسپورٹس کار نہیں ہے' جو تم چاہتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ایگزیکٹو لگژری کار دے کر میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں نوشیرواں' کہ تمہاری کمپنی جو ڈیڈ نے تم سے لی تھی' میں نے تمہیں واپس کردی ہے' تمہیں ہر وہ چیز نہیں ملے گی جو تم چاہتے ہو' بلکہ وہ دی جائے گی جو تمہارے لیے بہتر ہو۔" اور پھر نرمی سے مسکرایا۔

"تھینک یو سو مچ بھائی۔" وہ حیران' خوش' میزی

سے باہر بھاگا۔ ہاشم اب اٹھ کر اوپر جا رہا تھا۔ جواہرات مسکراتے ہوئے' سکون اور اطمینان سے دونوں بیٹوں کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ لاؤنج میں اکیلی رہ گئی تو میز پہ رکھے شیرو کے فون کی بپ بجی۔ اس نے بنا توقف کے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ شہرین کا میسج تھا۔

کوئی عام سی بات کہی تھی اس نے' مگر جواہرات کے ابرو تن گئے۔ پرسوچ انداز میں بیرونی دروازے کو دیکھا' جہاں سے شیرو گیا تھا اور پھر... انگلیوں کو حرکت دی' پیغام مٹایا۔ فون واپس رکھا' اور اسی شان سے اس کرسی پہ بیٹھی رہی جو کسی ملکہ کا خاصا ہوتی ہے۔ تنی گردن' بے نیاز مسکراہٹ اور ایک عظیم الشان سلطنت کے خیال سے چمکتی آنکھیں۔

وہ آزاد تھی۔ اورنگ زیب کی غلامی کی زنجیروں سے یکسر آزاد۔ سوا گلا ڈیڑھ برس بہت اچھا گزرا۔ ہاشم نے کاروبار' گھر' سب سنبھال رکھا تھا۔ سونی شہرین کے پاس ہوتی' کبھی آجاتی تو اچھا لگتا۔ شہرین آتی تو اچھا نہ لگتا' مگر وہ اس کو فی الوقت تحمل سے برداشت کیے ہوئے تھی۔ شیرو کا شیری کی جانب بڑھتا رجحان بھی اس کی نظر میں تھا' مگر ابھی اسے برداشت کرنا تھا۔

سعدی اور اس کے خاندان کا داخلہ یہاں اب بند تھا۔ سونی کی اگلی پارٹی پہ (جو اورنگزیب کی وفات کی پانچ ماہ بعد ہوئی) اس نے سعدی کو دعوت نامہ بھجوایا' مگر وہ نہیں آیا۔ ہاشم بھی اب اس کا ذکر نہیں کرتا تھا' سوائے ایک دو دفعہ کے' جب اس نے بتایا سعدی اسے اپنے آس پاس نظر آیا ہے' کبھی کسی ہوٹل تو کبھی کسی اور پبلک پلیس پہ' جیسے وہ کسی چیز کے پیچھے ہے' تو جواہرات نے نظر انداز کیا۔ مگر ہاشم زیادہ عرصہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عرصہ بھی اس لیے توجہ نہیں کر سکا کہ باپ کے مرنے کے بعد ٹیک اوور کرنا' ہر شے سنبھالنا' ان سب بکھیڑوں نے اسے مصروف کر دیا تھا۔ ایسے میں کس کے پاس اتنا وقت تھا' کہ جیل میں جہنم واصل ہوئے کزن یا اس کے بھانجے کی فکر کرے؟ اسے جس دن سعدی کو "چیک" کرنے کا خیال آیا فارس اسی دن رہا ہو کر ان کی زندگیوں میں

واپس پہنچ گیا' اور جیسے پُرسکون ندی میں زوردار پتھر آن گرا تھا۔

آج ڈیڑھ سال بعد کی اس خاموش سہ پہر' جب جواہرات زمر کے گھر سے فارس کے ہمراہ لوٹی تھی' اور اپنے خالی گھر میں اسی اونچی کرسی پہ بیٹھی تھی' تو اپنے کان کے بندوں پہ انگلی پھیرتے' نم آنکھوں سے اسے وہ سب یاد آ رہا تھا' جو یاد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور ہاں' ایک بات وہ اب بھی جانتی تھی۔ ہاشم اعتراف کرے یا نہیں' وہ آج بھی سعدی سے محبت کرتا تھا۔ وہ آج بھی اسے مس کرتا تھا۔

تو پھر۔ بالآخر... ہم بھی ڈیڑھ برس قبل کے سرما کے سرد ماضی کی کہانی کو وہیں دفن کر کے مکمل طور پہ "حال" کے موسم گرما کی جانب بڑھتے ہیں' جہاں فارس غازی کی رہائی کے بعد سب کی زندگی بدل رہی تھیں۔



رک گیا میں سزا سے کچھ پہلے
اس کو احساس خود خطا کا تھا

یوسف صاحب کے روشن گھر پہ مئی کی گرم شام اُتری تھی اور وہ ڈرائنگ روم میں عین اسی جگہ وہیل چیئر پہ بیٹھے تھے جہاں دوپہر میں تب براجمان تھے' جب فارس اور جواہرات ادھر تھے۔ البتہ اب حاضرین بدل چکے تھے۔ ندرت سامنے صوفے پہ بیٹھیں' دھیمی آواز سے بڑے ابا کو تسلی دے رہی تھیں اور سعدی' وہ جو آفس سے فارس کا فون سن کر گویا بھاگتے ہوئے امی کو لیے ادھر آیا تھا' کھڑکی کے ساتھ کھڑا' نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر ان کی جانب مڑا تو چہرے پہ خفگی تھی۔

"آپ کس طرح اپنے منہ سے یہ بات فارس ماموں سے کہہ سکتے ہیں؟ کم از کم امی یا مجھ سے تو بات کرتے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟"

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے' سعدی۔" ندرت خفا ہوئیں۔ "آج کل لڑکی والوں کا کہنا معیوب نہیں سمجھا جاتا' اور اس میں غلط بھی کیا ہے؟ اگر زمر کو اعتراض نہیں تو تم کیوں حواس باختہ ہو رہے ہو؟"

"یہ جس جگہ آپ بیٹھی ہیں' ادھر' بالکل ادھر پچھلے ہفتے فارس ماموں بیٹھے تھے جب زمر آئیں اور ان کو کھڑے کھڑے یہاں سے نکال دیا۔" باقاعدہ انگلی سے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ندرت نے بے اختیار پہلو بدلا۔ "مان ہی نہیں سکتا میں کہ زمر مان گئی ہیں۔" بہت ہی شدت سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بڑے ابا نے گردن اٹھائی۔ بے بسی سے اسے دیکھا۔

"وہ مانی نہیں ہے' بس اس نے کہا کہ جو میری مرضی ہو میں کر دوں۔"

"یعنی کہ آپ لوگ ان پہ دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ایسا مت کریں بڑے ابا۔" وہ ناراض ہوا۔

"اور اسی جگہ کھڑے ہو کر تم نے پچھلے ہفتے سعدی مجھے کہا تھا کہ میں زمر کی شادی کر دوں' فارس سے۔" وہ لمحے بھر کو چپ ہو گیا۔

"مگر ایسے نہیں کہ وہ زبردستی یہ فیصلہ کریں۔"

"تو پھر جاؤ بیٹے' زمر سے بات کرو' اس سے پوچھو کہ بغیر جبر کے بتائے' وہ کیا چاہتی ہے۔ میں وہی کروں گا جو وہ چاہتی ہے۔"

سعدی کھڑا لب کاٹتا رہا۔ وہ الجھا ہوا تھا' خفا بھی تھا۔ کیا چیز غلط تھی' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر کچھ صحیح نہیں تھا۔

"مجھے اس سب میں مسز کاردار کی مداخلت نہیں پسند آئی بڑے ابا۔ وہ کیوں اتنی بے چین ہیں زمر کی شادی کے لیے؟"

"ان کو کہا تھا میں نے کہ زمر کو شادی کے لیے قائل کریں' وہ میرے کہنے پہ مداخلت کر رہی ہیں۔" ان کی وضاحت پہ سعدی نے الجھے الجھے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"مجھے نہیں پتا' مگر مجھے یہ اس طرح ٹھیک نہیں لگ رہا۔" اور اسی متفکر چہرے سے باہر نکل آیا۔

لان میں شام اندھیری ہو چکی تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر جیب سے موبائل نکالا اور جواہرات کا نمبر ملایا۔ فون کان سے لگائے سنجیدہ آنکھوں اور تنے تاثرات کے ساتھ دوسری

جانب جاتی گھنٹی سنتا رہا۔

"سعدی! اتنے عرصے بعد فون پہ تمہاری آواز سنی۔ کبھی کبھی ہمارے لیے وقت نکال لیا کرو۔" وہ نرم خوشگوار انداز میں بولی تھی۔

"آپ یہ گلہ ایسے کرتی ہیں جیسے خود بھی واقف نہ ہوں کہ اب میرے لیے وقت کس کے پاس نہیں ہوتا۔" چاہ کر بھی وہ بے زار۔ نہیں ظاہر کر سکا خود کو۔ ہاشم کی ماں کو ہاشم کے کارناموں سے وہ ہمیشہ الگ رکھتا تھا۔ ہر چیز کے باوجود!

"اس رات شادی میں بھی تم نے مجھ سے خاص بات نہیں کی۔ سونی کی پارٹی پہ اس نیکلس والے واقعے کا۔"

"مسز کاردار، آج آپ نے کیا کیا ہے؟" اس نے اکھڑے خشک انداز میں بات کاٹی وہ تو ترنت بولی۔ "اور کیا کیا ہے میں نے؟"

"مجھے نہیں معلوم، آپ کیوں زمر اور فارس کی شادی کروانا چاہتی ہیں۔ مگر وجہ جو بھی ہو، میں نے بڑے ابا کو کہہ دیا ہے کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے سختی سے کہتے گویا بات ختم کی۔

"تیسری دفعہ، سعدی؟" وہ محظوظ، مزہ لینے والے انداز میں گویا ہوئی تو وہ الجھا۔

"سوری!"

"پہلی دفعہ بچپن میں زمر کے جہیز کو آگ لگانا، اور دوسری دفعہ چار سال پہلے زمر کو ایک خطرناک کیس میں دھکیلنا۔ دو بار تم نے اس کی شادی نہیں ہونے دی۔ اب تیسری دفعہ رخنہ ڈالو گے؟"

"ایکسکیوزمی؟" بے یقینی سے اس نے فون کو کان سے ہٹا کر دیکھا۔

"مشکل بات نہیں کی میں نے۔ تم نے خود بتایا تھا، بچپن میں وہ تمہیں اپنی شادی کی چیزیں دکھا رہی تھی، اور پھر وہ چلی گئی اور تم وہیں کھیلتے رہے، پھر کھیل کھیل میں آگ لگ گئی اور اس کا جہیز جل گیا۔"

"میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار!" کچھ دیر پہلے کے تنے تاثرات غائب تھے اور وہ پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ بمشکل بول رہا تھا۔

"اور تم اچھی طرح جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو۔" وہ شاید مسکرائی تھی۔ "تم سے کھیل میں آگ نہیں لگی تھی۔ تم نے جان بوجھ کر آگ لگائی تھی۔" اس نے محظوظ سی سرگوشی کی اور وہ دم سادھے، سانس روکے بیٹھا رہ گیا۔

"میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار!" مگر وہ کہے جا رہی تھی۔

"وہ تمہاری بیسٹ فرینڈ تھی، اور وہ شادی کے بعد کراچی چلی جاتی۔ تم جیلس ہو گئے تھے، اور ان سیکیور بھی۔ مجھے جب تم نے بتایا تھا، تب میں نے تمہاری آنکھیں پڑھی تھیں، بچے۔ وہ آگ تم نے خود لگائی تھی۔"

"میں اس وقت دس سال کا تھا، مسز کاردار۔" بدقت کہہ کر اس نے نچلے لب میں دانت پیوست کیے۔ جیسے ڈھیروں ضبط کیا۔ آنکھوں میں نمی آئی تھی۔

"مگر اب تم دس سال کے نہیں ہو۔ اب بڑے ہو جاؤ اور اپنی پھپھو کو اس کی زندگی گزارنے دو۔ اس کے رشتے میں مداخلت مت کرو۔ کیونکہ جب تم مداخلت کرتے ہو تو وہ صرف نقصان اٹھاتی ہے۔"

"آپ... آپ یہ اس لیے کہہ رہی ہیں تاکہ... تاکہ میں اس معاملے سے خود کو الگ کر لوں اور آپ کا جو بھی مقصد ہے وہ پورا ہو جائے۔" اس نے کمزور لہجے کو مضبوط کرنے کی ناکام جہد کی۔

"ہاں، میں اسی لیے کہہ رہی ہوں، مگر یہی سچ ہے۔ کیا نہیں ہے؟" اور لمحے بھر کی خاموشی کے بعد فون بند ہو گیا۔

سعدی کتنی دیر چپ چاپ اس سیڑھی پہ بیٹھا رہا۔ آنکھیں قدموں میں اگے گھاس پہ جمائے، وہ مسلسل لب کاٹ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا جواہرات اسے ڈسٹرب کرنا چاہتی تھی، مگر اس بات کا علم ہونا ڈسٹرب ہونے سے روک نہیں سکتا۔

میں دلائل پہ تکیہ کر بیٹھا

آہ ! وہ وقت التجا کا تھا

کافی دیر بعد جب وہ اٹھ کر اندر آیا تو ندرت اور بڑے ابا مسلسل اسی بات پہ غور و خوض کر رہے تھے۔ اس چہرے کے ساتھ نہیں آیا جس کے ساتھ گیا تھا۔ سو ان کو وہیں چھوڑے، راہداری میں آگے چلا گیا۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور ملازم لڑکا صداقت اسٹول بیٹھا، پیاز چھیلتے اسکرین پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر شرمندہ سا اٹھنے لگا مگر سعدی مزید آگے بڑھ گیا۔ زمر کے دروازے پہ دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ فائل پہ جھکا لیمپ جل رہا تھا، اور وہ گردن ترچھی کیے قلم سے کچھ لکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ چہرہ اٹھایا۔ اسے دیکھ کر بھوری آنکھوں میں نرمی آئی اور مسکرائی۔

"آؤ سعدی!" سامنے کاؤچ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ وہاں آبیٹھا۔

"اور کیا ہو رہا ہے؟" فائل بند کرتے ہوئے اس نے اسی نرمی سے پوچھا۔ سعدی نے بدقت مسکرانے کی سعی کی۔

"بس جاب چل رہی ہے۔ آپ۔" وہ رکا۔ سر ابھی تک جھکا تھا۔

"ابا نے بھیجا ہے مجھ سے بات کرنے کے لیے؟"

"جی، مگر... میں آپ سے وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔" وہ جو دلائل پہ تکیہ کیے مزید چند فقرے بولنے جا رہی تھی، اپنے اسی سپاٹ انداز میں بے تاثر سے فقرے، سعدی کی بات نے اسے روک دیا۔ وہ چونک کر نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تو پھر...؟"

"بڑے ابا نے کہا ہے کہ آپ اس شادی پہ راضی ہیں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں زمر! کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں، میں اس میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔" سر جھکائے، انگلیاں مروڑتے بجھا بجھا سا کہہ رہا تھا۔ "آپ بغیر کسی مجبوری یا دباؤ کے فیصلہ کریں، اپنی زندگی کا فیصلہ... میں آپ کو سپورٹ کروں گا۔"

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سب کے پیچھے کوئی وجہ ہو گی۔ آپ ان سے نفرت کرتی ہیں، اور پھر بھی آپ ان سے شادی کرنے جا رہی ہیں۔"

زمر کے بظاہر پرسکون چہرے پہ سایہ سا لہرایا، مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر جھکائے وہ کہے جا رہا تھا۔

"آپ کا دل بھی ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا، لیکن اس سب کے باوجود بھی آپ ان سے شادی کرنے جا رہی ہیں، تو میں آپ سے صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔" اس نے جھکی نظریں اٹھا کر زمر کو دیکھا جو دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

"کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتی ہیں کہ آپ فارس ماموں کو کبھی ہرٹ نہیں کریں گی؟"

زمر نے تھوک نگلا، یوں کہ اس کی آنکھیں گھنگریالے بالوں والے خوبصورت لڑکے پہ جمی تھیں، اور لب خاموش تھے۔

"کیا آپ مجھ سے وعدہ کریں گی کہ آپ کبھی بھی ان کو دانستہ طور پہ نقصان نہیں پہنچائیں گی؟" وہ برے اور بھیانک خوف کے زیر اثر کہہ رہا تھا۔ زمر نے خوامخواہ چہرہ پھیر کر میز کو دیکھا، پھر لیمپ کو، پھر فائلز کو، اور پھر دوبارہ سعدی کو۔ اتنا بڑا وعدہ جو انتقام کے ہر ارادے کو مار ڈالے؟

"میں... میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ آئی پرامس!" چند لمحے بعد وہ سعدی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی اور دوبارہ تھوک نگلا۔ سعدی نے گہری سانس لے کر بھنوؤں پہ ہاتھ رکھے، سر جھکا دیا۔ گویا تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔ زمر ہنوز پلک جھپکے بنا اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا۔ مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جو بھی چاہیں گی، میں وہی کروں گا اور کرواؤں گا۔" زمر پھیکا سا مسکرائی۔ (اور جب وعدہ ٹوٹے گا تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟)

"ابا چاہتے ہیں، میں اس سے شادی کر لوں، میں

کرلوں گی سعدی۔"

"میں نے کہا نا' میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ دروازے تک گیا' پھر رکا۔ مسکراہٹ مدھم ہو کر حزن میں بدلی۔ سر جھکائے' بنا مڑے' دھیرے سے بولا۔

"اور مجھے معاف کر دیجیے گا' میری ہر اس چیز کے لیے جس نے آپ کو نقصان پہنچایا آئی ایم سوری' زمر میں جان بوجھ کر نہیں کرتا' پھر بھی میری وجہ سے کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے!" اور پھر رکے بنا باہر نکل گیا۔

زمر نے کنپٹی کو انگلی سے مسلا۔ اسے لگا' انگلیوں میں لرزش ہے۔ کرسی گھما کر رخ دائیں طرف کیا تو سنگھار میز پہ لگا آئینہ سامنے آیا' اور اس کا عکس بھی۔ کرسی پہ بیٹھی' گھنگھریالے خوب صورت بالوں والی لڑکی جس کے ناک کی لونگ دمک رہی تھی۔ مگر آنکھیں پریشان تھیں۔

تب ہی اس کا فون بجا۔ وہ چونکی۔ غیر شناسا نمبر آرہا تھا۔ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے' اس نے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو۔"

"پراسیکیوٹر صاحبہ' مجھے تو پہچانتی ہوں گی آپ۔" اور وہ فارس کی آواز کیسے نہیں پہچان سکتی تھی؟ فکر مند تاثرات بدلے۔ آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ ہو گئیں۔

"جی فارس۔ کہیے۔"

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ وقت آپ بتائیں' جگہ میں بتاؤں گا۔"

اس نے آنکھیں بھینچ کر بہت سی کڑواہٹ اندر اتاری اور پھر ہموار لہجے میں بولی۔ "اوکے! کل شام چار بجے مل سکتی ہوں میں۔ مگر کدھر؟"

"اسی ریسٹورنٹ میں جہاں آپ کو بلا کر گولی ماری تھی میں نے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟"

زمر کی آنکھوں کی سرد مہری مزید بڑھی۔ "شیور۔" اور موبائل کا بٹن زور سے دبا کر کال کاٹی۔ اذیت سی اذیت تھی۔

عکس چننے میں عمر گزری ہے
ایسا ٹوٹا ہے آئینہ مجھ سے

چھوٹے باغیچے والے گھر کے لاؤنج میں ٹی وی کا شور جاری و ساری تھا' اور حنین نفی میں سر ہلاتی ادھر ادھر چکر لگاتی پھر رہی تھی۔ دفعتاً" وہ رکی' اور تندہی سے صوفے پہ بیٹھے سعدی کو گھورا۔

"وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"کیا تم چند لمحوں کے لیے زمر اور اپنے تمام اختلافات بھلا کر ان کے لیے غیر جانب داری سے نہیں سوچ سکتیں؟" وہ تھک سا گیا تھا۔ حنین نفی میں سر ہلاتی سامنے بیٹھی۔ ہاتھ سے ماتھے پہ کٹے بال ہٹائے جو پھر دوبارہ وہیں گر گئے۔

"وہ اصل بات چھپا رہی ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بغیر کسی منفی وجہ کے ماموں سے شادی پہ راضی ہو جائیں۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے وہ بڑے ابا کے کہنے پہ ایسا کر رہی ہیں' اور دل میں ابھی ابھی ماموں کے لیے تعفض ہو گا۔ شاید وہ سچ کی تلاش میں ہیں' ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے' نا کہ ان پہ شک کرنا چاہیے۔"

"اوہ خدا۔ آپ لوگوں کو کیوں نہیں نظر آرہا؟" وہ متعجب' حیران پریشان تھی۔ "وہ زمر یوسف ہیں' ان کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ فارس ماموں کو نقصان پہنچانا چاہتی ہیں' اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"انہوں نے مجھے زبان دی ہے کہ وہ فارس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔" وہ ایک ایک حرف بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ حنین چپ ہو گئی۔ سینے پہ بازو لپیٹ لیے اور الجھی الجھی سی انگلی کا ناخن دانت سے کترنے لگی۔

"مگر۔۔۔" چند ثانیے بعد انگلی دانتوں سے نکال کر وہ حتمی انداز میں بولی۔ "مگر میں ان پہ یقین نہیں کر سکتی۔"

"بس کر دو حنین۔" ندرت کچن سے اکتا کر نکلیں۔ ہاتھ میں کفگیر تھا' گویا حنین کو دے مارنے کا ارادہ ہو۔ ان دونوں کے سامنے کھڑے' کمر پہ ہاتھ رکھے' وہ جب

بولیں تو بے زار لگ رہی تھیں۔
"کوئی عقل ہے تم میں؟ وہ فارس کو برا بھلا کہتی تھی تب بھی ہم سب کو شکایت تھی' اب نہیں کہہ رہی' تب بھی تم اس کے پیچھے پڑی ہو۔ جب ایک دفعہ اس نے اپنے الزامات واپس لے لیے تو اسے معاف کرو اب۔"
"مگر وہ کیسے ہنسی خوشی ماموں سے شادی کر سکتی ہیں؟" حنین اب کے ذرا دھیمے لہجے میں بولی۔ لاشعوری طور پہ کشن پہ ہاتھ رکھ لیا۔ ادھر امی نے کفگیر گھمایا' ادھر اس نے کشن کو ڈھال بنایا۔
"کیونکہ اس میں تم سے زیادہ عقل ہے۔" وہ بھی گویا تھک گئی تھیں۔ "وہ بیمار ہے بیٹا' اس کے گردے خراب ہیں' اور بڑے ابا پہلے سے زیادہ بیمار رہنے لگ گئے ہیں۔ (حنہ نے آہستہ سے کشن چھوڑ دیا۔) اس کو فارس سے بہتر رشتہ نہیں ملے گا' وہ سمجھ چکی ہے۔ اس لیے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے گزشتہ رویے کا ازالہ کرنے جا رہی ہے۔ تو تم دونوں کیوں مین میخ نکال رہے ہو؟"
"نہیں' مجھے تو اب کوئی اعتراض نہیں۔" سعدی نے فوراً" ہاتھ اٹھا دیے اور احتیاط سے کفگیر کو دیکھا جو ہنوز امی کے کمر پہ رکھے ہاتھ میں تھا۔ حنہ چپ چاپ لب کاٹتی رہی۔ چہرے کی خفگی اب تاسف اور ندامت میں بدل گئی تھی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔" بس اتنا سا کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ندرت افسوس سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔
"اسے کیا ہو گیا ہے سعدی؟ یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔"
سعدی نے گہری سانس لیتے ریموٹ اٹھا لیا۔
"امی۔۔۔ ہم میں سے کوئی بھی پہلے ایسا نہیں تھا۔"
ندرت کچھ منہ میں بڑبڑاتی پلٹ گئیں۔ سعدی وہیں بیٹھا رہا۔ پھر ٹی وی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا۔ سیم اس کے لیپ ٹاپ پہ بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔
"آپ کو کمپیوٹر چاہیے بھائی؟" اسے آتے دیکھ کر تابعداری سے پوچھا۔
"اونہوں۔ تم بیٹھو۔" اس نے جھک کر اسٹڈی ٹیبل کے نچلے دراز سے ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ اور الماری تک آیا۔ پٹ کھول کر احتیاط سے باکس کا ڈھکن الماری کے اندر کر کے ہٹایا۔ (سیم دور تھا۔ اس طرف اس کا رخ نہیں تھا۔) باکس کے اندر ایک پلیٹینم اور ہیروں کا جھلملاتا نیکلس رکھا تھا۔ (جواہرات کا نیکلس جو اسے واپس کرنا تھا۔) اور ساتھ میں سفید رنگ کی فلیش ڈرائیو۔ اس نے ڈرائیو نکالی' ڈبہ الماری کے اندر چھپا کر رکھا اور باہر نکل آیا۔
حنین اپنے بیڈ پہ بیٹھی ایک رسالے کے ورق پلٹ رہی تھی جب سعدی چوکھٹ میں آیا۔
"یہ وہ فائلز ہیں جو مجھ سے نہیں کھلیں۔ کیا تم انہیں کھول دو گی؟"
وہ چونکی۔ سر گھما کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب در آیا۔
"میں۔۔۔ آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں' میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتی اب۔"
"کچھ دن اسے اپنے پاس رکھو۔ اگر موڈ بنے تو کر دینا۔ نہیں تو واپس دے دینا' مگر اسے رکھو' اور سوچو کہ تم میری مدد کرنا چاہتی ہو یا نہیں۔"
وہ فلیش اس کی سمت بڑھائے ہوئے تھا۔ حنین کی آنکھوں میں خفگی تھی' مگر اس نے چپ چاپ وہ پکڑ لی۔ سعدی چلا گیا تو وہ اٹھی' الماری تک آئی' اس کے نچلے جوتوں والے خانے کے برابر بیٹھی۔ ایک بڑا باکس نکالا۔ اس میں وہ لیپ ٹاپ' ٹیبلٹ اور دوسرے ایسے کئی gadgets رکھے تھے جو اورنگزیب کاردار نے اسے دیے تھے۔ علیشا کا لاکٹ بھی ادھر ہی تھا۔ حنہ نے وہ فلیش بھی ان ممنوعہ اشیاء کے ساتھ رکھ دی اور ڈبہ بند کر کے اندر دھکیل دیا۔
پھر گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوچنا کیا تھا؟ جو طے کر لیا تو بس کر لیا۔



اپنے قاتل کی ذہانت پہ حیران ہوں میں

ہر روز ایک نیا طرز قتل ایجاد کرے ہے۔

مئی کی چلچلاتی سہ پہر پورے شہر کو گویا جھلسا رہی تھی۔ ایسے میں اس پوش علاقے کا وہ ریسٹورنٹ خالی لگ رہا تھا۔ دور کوئی اکا دکا میز پر تھی ورنہ گرمی نے کاروبار ٹھنڈا کر رکھا تھا۔

گھنگھریالے بالوں کو ہاف کیچر میں باندھے کہنی پہ پرس اٹکائے سیاہ منی کوٹ اور سفید لباس میں ملبوس زمر متناسب چال چلتی اندر داخل ہوئی اور سیدھی دروازے کے قریب ایک میز تک چلی آئی۔ گئے برسوں میں ایک روز ادھر زر تاشہ بیٹھی دکھائی دی تھی اب وہ کرسی خالی تھی۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ بیٹھ گئی اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ چار بج چکے تھے۔

ریسٹورنٹ کافی بدل چکا تھا۔ رنگ فرنیچر۔ شاید مینیو بھی۔ مگر اسے تو ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ سو کوشش کی کہ بھوری آنکھوں کو میز پہ رکھے گلدان پہ جمائے اور ہلائے نہیں۔ ورنہ کچھ اندر تک ہل جاتا تھا۔

"لانگ ٹائم میڈم!" وہ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تو زمر نے آنکھیں اٹھائیں۔ آخری ملاقات کا منظر آنکھوں میں جھلملا گیا۔ جیل کا ملاقاتی کمرہ اور میز کے پار بیٹھا سفید کرتے شلوار اور کسی ہوئی پونی والا فارس۔ (میں... معافی... نہیں مانگوں گا!) پھر منظر بدلا اور چار برس پہلے کی زر تاشہ اسٹرا لبوں میں دبائے ادھر بیٹھی نظر آئی اور اب... اب وہ پوری آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس ہاتھ باہم ملا کر میز پہ رکھے چھوٹے کٹے بالوں کے ساتھ ہلکی سنہری آنکھوں کو سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان تینوں مناظر میں زر تاشہ جیل والا فارس اب کا فارس ان سب میں اگر کچھ مشترک تھا تو وہ زمر تھی۔ وہی بال وہی سیاہ کوٹ وہی سفید لباس۔ سب آگے بڑھ گئے یا پیچھے رہ گئے ایک اسی کی زندگی رکی ہوئی تھی۔

"لانگ ٹائم فارس!" ویٹر نے آکر مینیو کارڈ سامنے رکھے۔ زمر نے کافی منگوائی۔ فارس نے کچھ نہیں منگوایا۔

"تو کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ ٹھنڈا سا بولی۔

"آپ کے والد نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے شادی کرلوں۔" اس کے تاثرات دیکھنے وہ رکا۔ زمر نے ہلکے سے اثبات میں سر کو خم دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔ انہوں نے مسز کاردار کے کہنے پہ ایسا کیا اور مسز کاردار نے میرے کہنے پہ۔"

فارس نے تعجب سے چہرہ ذرا پیچھے کیا۔ پتلیاں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے زمر نے ابرو اٹھائی۔

"کیوں آپ کو کیا لگا تھا؟ میں جھوٹ بولوں گی اداکاری کروں گی یہ ظاہر کروں گی کہ آپ کو معاف کر دیا ہے یا بے گناہ سمجھتی ہوں اور دل سے اس شادی پہ راضی ہوں؟" ذرا سے استہزاء سے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ مجھے بالکل نہیں جانتے فارس!"

وہ پیچھے ہو کر بیٹھا کھوجتی مشتبہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے واقعی امید نہیں تھی کہ وہ خود ہی ہر بات کا اعتراف کرلے گی۔

"آپ نے مسز کاردار سے ایسا کرنے کے لیے کیوں کہا؟"

"کیونکہ مجھے چند دن پہلے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے میرا رشتہ مانگا تھا اور میری امی نے انکار کیا تھا۔ اس سے پہلے میں اتنے سال یہ سمجھتی رہی کہ آپ نے مجھے صرف استعمال کی شے سمجھ کر استعمال کیا کولیٹرل ڈیمیج۔ مگر اب مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ذاتی جنگ تھی۔ میں مظلوم نہیں تھی انتقام لیا تھا آپ نے مجھ سے۔" وہ خبریں پڑھنے کے انداز میں کہے گئی۔ کافی آگئی تو اس نے کپ اٹھالیا۔ جلتا ہوا مائع لبوں سے لگایا۔

"اچھا پھر؟" وہ چبھتی آنکھیں اس پہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔

"اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ابا تب سے اب تک میری آپ سے شادی کروانا چاہتے ہیں۔ سو میں نے

مسز کاردار سے کہا کہ وہ ایسا کروادیں۔ میں آپ سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ کافی اچھی ہے۔" سراہ کر اس نے کپ واپس دھرا۔

"ہوں اور کس لیے؟" جواب میں زمر نے ہلکے سے شانے اُچکائے۔

"یہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے میں آپ سے آپ کے جرائم کا اعتراف کرواسکتی ہوں اور مجھے یہی کروانا ہے۔"

"تو اگر آپ مجھ سے انتقاماً" شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کیوں بتارہی ہیں؟"

"کیونکہ آپ کے برعکس میں پیٹھ پہ وار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آپ کو پہلے سے وارن کررہی ہوں۔ میں یہ شادی آپ سے اعتراف جرم کے لیے کررہی ہوں۔ اس لیے آپ چاہیں تو یہ شادی نہ کریں' اور میرے ابا کو انکار کردیں۔ فیصلہ آپ پر ہے۔" کپ کے منہ پہ انگوٹھا پھیرتی وہ کہہ رہی تھی۔

فارس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔

"اس آپشن کا شکریہ 'کیا میں اس پوزیشن میں ہوں کہ جب وہ اپنے منہ سے کہہ چکے ہیں تو ان کو انکار کردوں؟"

زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "میں نے آپ کو مطلع کرنا تھا' کردیا۔ مجھ سے شادی کریں گے تو اعتراف جرم کرنا ہی پڑے گا ایک دن۔ آگے آپ کی مرضی۔" کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ پُرسکون' مطمئن آنکھیں فارس پہ جمی تھیں۔

فارس آگے ہوا' میز پہ ہاتھ رکھ کر اس کی سمت جھکا۔ "کیا آپ مجھے چیلنج کررہی ہیں؟"

"سچائی بتارہی ہوں!"

"اور یہ سچائی کتنے لوگوں کو مزید بتانے کا ارادہ ہے آپ کا؟"

"اگر آپ نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔" کپ پرے کرکے اس نے بیگ کی اسٹریپ کندھے پہ ڈالی۔ سرد سا مسکرائی "اور اگر آپ کو شادی پہ کوئی اعتراض نہ ہو تو اتنا خیال رکھیے گا کہ میرے بھتیجے' اور میرے ابا اس معاملے سے بے خبر رہیں' جو ہمارے درمیان ڈسکس ہوا ہے۔ اس سب میں ان کو دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"شیور!" اس نے تلخی سے گردن کو خم دیا۔

"کوئی اور سوال نہیں ہے تو میں جاؤں؟" اور پرس تھامے اٹھی' کرسی دھکیلی اور جانے کے لیے مڑی۔

"صرف ایک سوال میم!" وہ جیب سے والٹ نکالتے اٹھا۔ سر جھکائے چند نوٹ نکالے' میز پہ رکھے اور چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر میرے خلاف اس ساری ان تھک محنت کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں بے گناہ تھا' تو کیا کریں گی آپ؟"

زمر' جو اس کے مخاطب کرنے پہ رکی تھی' پرس پہ ہاتھ رکھے کھڑی' چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ بے گناہ نہیں ہیں!"

پھر مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا' یا اس نے جواب سوچا ہی نہیں تھا۔

فارس کان کی لو مسلتا' سوچتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔



ہو گلہ کسی سے کیوں اپنی مات کا ہی جب
شہہ جو دلا دیں وہ اپنے ہی تو مہرے ہیں

قصر کاردار میں اس رات ڈائننگ ہال میں کھانا چن دیا گیا تھا' اور ہاشم خالی سربراہی کرسی کے دائیں ہاتھ کی پہلی کرسی پہ بیٹھا' نیپکن پھیلا رہا تھا جب اس نے لاؤنج کی سمت سے جواہرات کو آتے دیکھا۔

"کس کا فون تھا؟" جواہرات پہلے سربراہی کرسی پہ بیٹھی' لٹ انگلی سے پیچھے کی' پھر کہنیاں میز پہ رکھے دونوں ہاتھوں کو اوپر تلے رکھ کر تھوڑی ان پہ جمائے'

مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ پینٹ کے ساتھ سفید شرٹ میں ملبوس سر جھکائے پلیٹ اپنی طرف کر رہا تھا۔

"فارس کا۔"

چاول پلیٹ میں نکالتے ہاشم نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"...برا منہ مت بناؤ۔ اس نے بتایا کہ وہ زمر سے شادی کے لیے راضی ہے اور یہ کہ میں زمر کے والد کو مطلع کر دوں۔"

"کیا اسے یہ اطلاع اپنی بہن کو نہیں دینی چاہیے تھی؟"

"ان کو بھی دے گا۔ مجھے تو بس یہ جتا رہا تھا کہ زمر نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے خود یہ بات شروع کرنے کے لیے مجھے کہا تھا۔"

کانٹے سے چاول لبوں تک لے جاتے ہاشم نے رک کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"زمر نے اسے کیوں بتایا؟"

"اسے مجھ پہ اعتبار نہیں ہے۔ اسے لگا ہوگا کہ میں اس راز کو اس کے خلاف استعمال کر سکتی ہوں اسی لیے بتا دیا۔ مجھے بھی اس کی امید نہیں تھی، مگر بہرحال، وہ ایک عقل مند عورت ہے۔" گہری سانس لے کر جواہرات نے سلاد کے پیالے سے چمچ بھر کر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔

"انتقام لینے کے ایک ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ اسے فارس سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بالکل بھی یہ سب پسند نہیں آ رہا۔" وہ ناپسندیدگی سے کہتا، پلیٹ پہ جھکے کھا رہا تھا۔

"تمہیں کیا برا لگ رہا ہے؟"

"وہ شادی کے بعد ادھر۔۔۔" ابرو سے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا جس کے پار دور سبزہ زار انیکسی کھڑی تھی۔ "ادھر آ کر رہنے لگ جائے گی۔ صبح شام مجھے اس کی شکل دیکھنی ہوگی۔ ناقابل برداشت۔" منہ میں چاول رکھے برہم آنکھوں کے ساتھ چباتا رہا۔

"یہ ہمارے لیے زیادہ اچھا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔" وہ مسکرا دی۔

"شیرو کہاں ہے؟ کل بھی ڈنر پہ نہیں تھا۔" تھوڑی خاموشی کے بعد ہاشم نے مقابل رکھی خالی کرسی کو دیکھ کر پوچھا۔

"دوستوں کے ساتھ باہر ہے۔ شاید۔"

"آپ نے پوچھا نہیں، یہ کون سے نئے دوست نکل آئے ہیں اس کے؟"

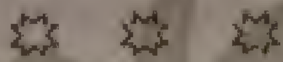
"خود ہی تو کہتے ہو، اس پہ دباؤ نہ ڈالا کروں۔ سو خاموش ہوں۔"

ہاشم نے نیپکن سے لب تھپتھپائے اور پھر اسے گویا میز پہ پرے پھینکا۔ جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ برہم نظر آ رہا تھا۔

"وہ ابھی تک شہری کی وجہ سے ایسا ہے؟"

"اس بات کو ڈیڑھ ہفتہ ہی تو ہوا ہے، اتنی جلدی کیسے سنبھلے گا۔ خیر، تم بات کر کے دیکھ لو۔ کیونکہ جب میں بات کروں گی تو پھر ایک ہی دفعہ کروں گی۔" مسکراتے مگر سرد لہجے میں کہہ کر وہ کھانے لگی۔

"پھر کبھی سہی۔" ہاشم میز سے سیل فون اٹھاتا، کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں ہنوز غصہ اور ناگواری موجود تھی۔



تو محبت سے کوئی چال تو چل!
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھ کو!

اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اس فلور پہ مدھم بتیاں جل رہی تھیں۔ سیڑھیاں ویران تھیں، البتہ لفٹ کی بیرونی اسکرین پہ نمبر بدلتا نظر آ رہا تھا۔

دفعتاً لفٹ ادھر ہی رکی۔ دروازے 'سس' کی آواز سے کھلے۔ اندر سے اسٹرپ والا بیگ کندھے پہ ڈالے جینز، ٹی شرٹ اور الٹی پی کیپ والا احمر نکلا۔ ماتھے پہ کٹے بال اب کیپ کے اندر تھے اور لاپروا چہرے پہ وہی تاثرات تھے جو ہمیشہ ہوتے تھے۔ لبوں کو گول کیے، وہ مدھم سی سیٹی بجاتا اپنے دروازے تک آیا۔ چابی لاک میں گھمائی۔ اسے کھول کر اندر قدم

رکھا۔

راہداری میں اسی طرح سیٹی بجاتا آگے آیا۔ لاؤنج کی میز پہ بیگ رکھا اور کیپ اتاری ہی تھی کہ ایک دم کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

کچن کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پہ فارس اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ کہنیاں کاؤنٹر پہ جمائے 'وہ سافٹ ڈرنک کے کین سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"او ایم جی!" احمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا' پھر پلٹ کر راہداری کو اور پھر ہاتھ میں پکڑی چابیوں کو۔ "کیا تم میرے گھر کا لاک توڑ کر اندر آئے ہو؟"

فارس نے گھونٹ بھرتے بھرتے رک کر چہرہ گھمایا۔ چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ "یہ گھر ہے؟"

"کم از کم جیل نہیں ہے۔" وہ جل کر کہتا کاؤنٹر تک آیا اور خفگی سے اسے دیکھا۔

فارس اسی گرے پوری آستین کی شرٹ میں ملبوس تھا جو سہ پہر زمر سے ملاقات میں پہن رکھی تھی۔

"میں نے پوچھا' تم میرے اپارٹمنٹ میں داخل کیسے ہوئے؟"

"اے... تمیز سے... کیا تم مجھے آپ نہیں کہا کرتے تھے؟" اسے گھور کر دیکھا اور کین اونچا کر کے آخری گھونٹ اندر انڈیلا۔

"تب ہم اتنے بے تکلف نہیں تھے۔" اس نے شانے اچکائے' اپنے سوال پہ لعنت بھیجتا' وہ فریج تک آیا' اور کھول کر اندر جھانکا۔ پھر دروازہ بند کر کے برا منہ بنا کر پلٹا۔

"آخری کین تمہیں ہی مبارک ہو' غازی! اب بتاؤ' مزید کتنا اسلحہ چاہیے؟"

دوسرا اسٹول کھینچ کر اس کے ہمراہ بیٹھا اور رخ بھی اس کی طرف پھیر لیا۔ جیل سے نکلتے ہی فارس نے اسے فون کر کے اسلحہ منگوایا تھا' جو اس نے ارینج کر کے دے بھی دیا تھا۔

"اسلحہ نہیں چاہیے۔"

"پھر؟"

"میں شادی کر رہا ہوں۔" خالی کین ہاتھ میں گھماتے اس نے گردن موڑ کر احمر کو دیکھا۔ احمر کا پہلے تو منہ کھل گیا۔ پھر اس نے بند کر لیا۔ پھر اثبات میں دو تین دفعہ سر ہلایا۔

"گڈ۔ مبارک ہو۔"

فارس نے ابرو اٹھا کر "بس یہی؟" والے انداز میں اسے دیکھا۔

"اور کیا پوچھوں؟" ناراضی سے سر جھٹکا۔ پھر چھت کو دیکھتے ذرا سا سوچا۔

"ویسے کون ہے یہ بے چاری جس سے تم شادی کرنے جا رہے ہو؟"

فارس چند لمحے سوچتا رہا' پھر گہری سانس لی۔

"چڑیل ہے۔"

"نہ کرو بھئی۔" احمر نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "اب اتنی کوئی بری شکل کی بھی نہیں ہوگی جو اسے چڑیل کہا جائے' پتا ہے یہ سب لڑکیاں۔" بولتے بولتے ایک دم اسے بریک لگا۔ اسٹول سے جھٹکے سے اٹھا۔ نہایت بے یقینی سے فارس کو دیکھا جو ہنوز بیٹھا کین کو ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔

"وہ... وہ چڑیل؟ نہ کرو یار... وہ پراسیکیوٹر زمر یوسف؟" اس کے کندھے کو جھنجھوڑتا وہ واپس اسٹول پہ بیٹھا۔ آنکھیں ابھی تک بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ "مگر کیوں؟ دماغ تو ٹھیک ہے؟" وہ حیران پریشان سا پوچھے جا رہا تھا' دفعتاً ڈور بیل بجی۔

"کھانا منگوایا تھا۔ لے آؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔" اس نے کین ڈسٹ بن کی جانب اچھالتے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو احمر کو چار و ناچار اٹھنا پڑا۔

پندرہ منٹ بعد وہ دونوں لاؤنج کے صوفوں پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پہ ٹیک اوے کے ڈبے کھلے پڑے تھے اور کھانا ختم ہوا چاہتا تھا۔

"میرا مشورہ مانو تو فوراً شادی سے انکار کر دو۔ ورنہ جو زمر صاحبہ تمہیں برا پھنسائیں گی نا' یاد رکھو گے۔"

فارس نے بے زاری سے ناک سے مکھی اڑائی۔

"نہیں کر سکتا انکار۔ اس کے باپ کے احسان ہیں مجھ پہ۔ وہ نہ ہوتے تو میں یہاں نہ ہوتا۔"

"اور ان کی بیٹی نہ ہوتی تو واقعی تم یہاں نہ ہوتے۔"

"بکواس۔" وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتا پیچھے ہو کر بیٹھا۔ بازو صوفے کی پشت پہ لمبا سا پھیلا لیا۔ اوپن کچن کی سمت دیکھتے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"ویسے ایک بات سوچنے کی ہے۔ اگر اس کو تم سے..."

فارس نے نگاہیں اس کی جانب پھیر کر گھورا۔ احمر رکا۔ "اگر ان کو تم سے..." (تصحیح کرتے بات جاری رکھی) اعتراف جرم کروانا ہے یا تمہیں مجرم ثابت کرنا ہے تو اس کے لیے شادی کرنے کی کیا ضرورت؟ مطلب' یہ کام تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے نا۔"

"مجھے معلوم ہے' وہ کیوں شادی کرنا چاہتی ہے' جب آخری دفعہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا' اچھا ہے جیل توڑو اور باہر جاؤ' دوبارہ شادی کرو اور اس بیوی کو بھی مار دو۔ تم وائف کلرز کی سائیکی... پتہ نہیں کچھ ایسا ہی بولا تھا اس نے۔" ہلکے سے سر جھٹکا تو احمر کا منہ کھل گیا۔

"تم... تم ان کے نزدیک وائف کلر ہو اور... اور بیوی کو قتل کرنے والے ہمیشہ یہی تو کرتے ہیں۔" احمر نے پرجوش انداز میں صوفے کے بازو پہ ہاتھ مارا۔ "وہ پہلے قتل کے الزام سے بچ جائیں تو دوبارہ شادی کرتے ہیں' اور دوبارہ قتل کرتے ہیں دوسری بیوی کو۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تم انہیں بھی مارنے کی کوشش کرو گے اور پکڑے جاؤ گے۔"

"نہیں۔ اسے اچھے سے پتا ہے کہ میں اسے نہیں ماروں گا۔ مگر باقی دنیا کو تو نہیں پتا۔"

"مطلب؟" احمر نے الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ دو انگلیوں سے ٹھوڑی کے بال نوچتے کہہ رہا تھا۔

"وہ مجھے زمر یوسف کے ارادۂ قتل کے جرم میں پھنسانا چاہے گی۔ وہ واقعات کو اپنی مرضی سے ترتیب دے گی۔ ایسے کہ دنیا مان لے' فارس غازی نے پھر سے زمر کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دفعہ لوگ اس کا یقین کریں گے۔"

احمر دم بخود بیٹھا سن رہا تھا۔ ذرا دیر کو خاموشی چھا گئی' پھر اس نے گویا جھرجھری لی۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اس سے شادی کر رہے ہو؟ ابھی بھی وقت ہے یار۔ اس کے باپ کو انکار کر دو' یا یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

مگر فارس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کے پاس میرا جرم ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میں اس کو نہیں گنواؤں گا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر لے' تب بھی مجھے نہیں پھنسا پائے گی۔ پچھلی دفعہ اگر وارث کے قاتل مجھے سیٹ اپ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو وہ میری غلطی تھی۔" وہ انگوٹھے کے ناخن سے ٹھوڑی مسلتا' میز پہ بکھرے ڈبوں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔ "میرا بھائی قتل ہوا تھا' تو مجھے زیادہ احتیاط کرنا چاہیے تھی' مگر مجھے لگا تھا..." اس نے تلخی سے مسکرا کر سر جھٹکا۔ "کہ مجھے کوئی پھنسا نہیں سکتا۔ تب تک میں لوگوں کو گرفتار کرتا آیا تھا' کوئی مجھے کیسے گرفتار کر سکتا تھا؟ مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو گا اسٹیپنی۔ اس دفعہ میں تیار ہوں۔"

حتمی سنگین لہجے میں کہہ کر اسے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ احمر ابھی تک فکرمندی سے اسے تک رہا تھا۔

"میڈم پراسیکیوٹر کا قصور نہیں ہے۔" فارس نے اب کے نرمی سے اسے گویا تسلی دی۔

"ہاں' وہ تمہیں پھانسی پہ لٹکا دے گی' تب بھی کہنا اس کا قصور نہیں ہے۔" وہ جی جان سے جل گیا تھا۔

"اونہوں۔ یہ میرا قصور ہے۔ میرے بھائی کے دشمن اور میرے دشمنوں نے میری وجہ سے' مجھے پھنسانے کے لیے ان کو زخمی کیا۔ اگر وہ مجھے مورد الزام ٹھہراتی ہیں تو وہ غلط نہیں ہیں۔" چابی اور فون اٹھا کر وہ راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

"مجھے پتا ہے' کیا لگتا ہے؟" عقب سے احمر کی آواز پہ اس کے قدم رکے۔

"مجھے لگتا ہے' یہ سب وہ بہانے ہیں جو تم نے

گھڑے ہیں۔ اس کے ابا کے احسان 'اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع 'اس کے دکھوں کی وجہ تمہاری ذات کا ہونا۔ اونہوں۔ سب بہانے ہیں غازی۔" وہ بکھرے ڈبے سمیٹتا سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ فارس نہیں مڑا' وہیں رکا کھڑا رہا۔ آنکھیں بیرونی دروازے پہ لگی تھیں اور گردن میں ڈوب کر ابھرتی گلٹی واضح دکھائی دی تھی۔ اسے پتا تھا اسٹیپنی کیا بکنے والا ہے۔

"تم اسے پسند کرتے ہو اور اسے کھونا نہیں چاہتے۔ یہ پہلی وجہ ہے۔ باقی وجوہات اس کے بعد آتی ہیں۔"

"بکومت!" وہ بنا پلٹے مدھم آواز میں بولا' تیز قدموں سے باہر نکلا اور دروازہ زوردار "ٹھاہ" سے بند کیا تو ڈبے اکٹھے کرتے احمر کے ہاتھ سے کچھ گرتے گرتے بچا۔

"آوچ!" اس نے خفگی سے راہداری کی سمت دیکھا۔ "سچ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا' اسٹیپنی۔ اونہوں' احمر۔" ناگواری سے تصحیح کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔



کتنی عجیب بات ہے جو نہ چاہتا تھا میں
قسمت سے اس طرح کا مقدر ملا مجھے

یوسف صاحب کا بنگلہ رات کے اس پہر خاموش اور اداس پڑا تھا۔ لاؤنج کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو سب تاریک تھا' سوائے یوسف صاحب کی وہیل چیئر کے جسے وہ خود چلاتے' راہداری کی سمت لے جارہے تھے۔ سناٹے میں پہیوں کی چیں چیں نے جیسے کوئی مدھم سا نوحہ بلند کیا۔ پھر اس میں زمر کے کمرے کے دروازے کی چرچراہٹ بھی شامل ہوئی جسے دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئے۔

وہ جائے نماز پہ بیٹھی دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹے' سلام پھیر چکی تھی اور اب دعا مانگنے کے بجائے مخملیں جائے نماز پہ انگلیاں پھیرتی کچھ سوچ رہی تھی۔ آہٹ پہ چونک کر گردن موڑی۔ انہیں دیکھ کر نرمی سے مسکرائی اور رخ ان کی سمت پھیرتے ہوئے اکڑوں بیٹھ کر گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔

"آپ سوئے نہیں ابھی تک؟" بوڑھے ابا نے نم آنکھوں سے اس کا چہرہ تکا۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں وہ گندمی چہرہ تھا۔ خوب صورت نہیں تھی وہ مگر اچھی شکل کی تھی۔ پرکشش اور کچھ اس کا ٹھنڈا' پرسکون انداز تھا جو اسے پرکشش بناتا تھا۔ وہ بھگو بھگو کر اور لپیٹ لپیٹ کر بھی اپنی ٹھنڈے انداز میں مارا کرتی تھی' اور اپنی نرمی' اور تلخی کے باوجود' وہ ان کو بہت پیاری تھی۔

"تم ناراض ہو گیا؟" انہوں نے اس کا سوال شاید سنا ہی نہیں۔ بس گیلی آنکھوں سے دیکھتے اپنی پوچھ گئے۔

"نہیں ابا۔ میں کیوں ناراض ہوں گی؟"

"تم نے سعدی سے کہا کہ تم شادی کرلوگی فارس سے۔ کیا یہ ناراضی میں کہا؟" زمر کی آنکھوں میں کرچیاں سی ابھریں مگر وہ ان کو چھپا کر مسکرادی۔

"زمر سے کوئی زبردستی کرواسکتا ہے کیا؟"

"پھر بیٹے! تم کیوں شادی کرلوگی اس سے؟ تم انکار کرنا چاہتی ہو تو کردو۔ میں ساری بات یہیں ختم کردوں گا۔ وہ بھی پتا نہیں کیسے میں مسز کاردار کی وجہ سے وہ سب فارس سے بول گیا۔" شکستگی سے نفی میں سر ہلاتے وہ سخت رنجیدہ خاطر لگ رہے تھے۔

"اس روز جس شادی پہ میں سعدی لوگوں کے ساتھ گئی تھی نا' ادھر میں نے حماد کو دیکھا۔ کرن بھی ساتھ تھی اور دو بچے بھی۔" وہ اداسی سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"تب میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے ورنہ میں صرف خود کو اور باقی سب کو نقصان دوں گی۔ اس لیے اب میں اس فیصلے پہ عمل درآمد کرنے جارہی ہوں' تاکہ ہم سب کی زندگی میں بہتری آئے' ہم سب اس ناسور سے جان چھڑالیں جو چار برس قبل ہماری زندگی میں آیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' مگر تم دل سے فارس سے شادی پہ

راضی ہو؟"

"میں اپنی زندگی سے یہ ناسور اکھاڑ پھینکنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوں ابا! فارس سے شادی تو چھوٹی بات ہے۔" وہ بہت ضبط سے مسکراتی اس کا نام لے کر کہہ رہی تھی۔

"اور... تم نے اس کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا کیا؟" ان کے چہرے پہ امید جاگی تھی پھر بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی زمر نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میرے خیالات اس کے بارے میں بالکل کلیئر ہیں' اگر کوئی ابہام تھا بھی تو وہ دور ہو چکا ہے۔ میں اس سے ملی تھی شام میں' ہم دونوں نے اس بارے میں بات کی' اپنی ترجیحات بتائیں' اور وہ میری طرف سے مطمئن تھا۔ جب ہی اس نے رضامندی ظاہر کردی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس کے متعلق میرے دل میں کوئی میل نہیں' کوئی بغض نہیں' مگر اتنا کہوں گی کہ اس شادی کے بعد کم از کم ہم سب سچائی سے واقف ہو جائیں گے۔" اس نے سچ سچ سب بتا دیا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور ابا کیا سمجھیں گے۔

"اچھا تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟" انہوں نے قدرے تسلی بخش انداز میں سر ہلاتے ہوئے صرف اپنی خواہش کا مطلب سمجھا۔

"جی' بالکل۔ اس نے تحمل سے میری فیلنگز سنیں اور پھر وہ رضامند ہو گیا۔ اور اگر وہ راضی ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس سے شادی کر کے' ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہوں گی ابا' اور یہی سفر ہم سب کو حقیقت پسند بنائے گا۔"

اور پھر وہ نرمی سے مسکرائی۔ بڑے ابا نے بازو بڑھا کر اس کا دوپٹے میں لپٹا سر تھپکا' اور ہلکی سی مسکراہٹ اور ڈھیروں سکون کے ساتھ واپس پلٹ گئے۔ جب ان کی وہیل چیئر باہر نکل گئی تو زمر کی آنکھوں کی نرمی عجیب سی تکلیف میں بدل گئی۔ وہ ست روی سے اٹھی اور دروازہ بند کیا۔ پھر دروازے سے کمر لگا کر چند لمحے کھڑی رہی۔

"قاتلوں کو ہم اس لیے سزا دیتے ہیں ابا! تاکہ وہ مزید معصوم لوگوں کی زندگیوں سے نہ کھیلیں۔ اس شخص نے ہمیشہ ان ہی کو نقصان دیا ہے' جو اس کے لیے اپنائیت رکھتے تھے اور اب آپ سب اس کے لیے اپنائیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف میرے لیے نہیں ابا! یہ ہم سب کے لیے ہے۔ ہمیں فارس غازی نامی ناسور کو اپنی زندگیوں سے اسی طرح نکالنا ہو گا۔" اداسی سے سوچتی وہ دوپٹے کی تہیں چہرے کے گرد سے کھولنے لگی۔



اتنا بھی صبر و شکر کا قائل نہیں یہ دل
کہ ہر کیفیت میں آپ کے گن گائے جائے گا

اگلی صبح شہر پہ پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ چھوٹا باغیچہ دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ گھاس دہک رہی تھی۔ پھول جل رہے تھے۔ ایسے میں گھر کے اندر کولر کی ٹھنڈی' نم ہوا نے گرمی کو کم کر رکھا تھا اور وقفے وقفے سے اس کولر سے اڑتے پانی کے چھینٹے کبھی سامنے بیٹھے فارس کو جا چھوتے تو کبھی حنین کو آ لگتے۔

ندرت لینڈ لائن کا ریسیور کان سے لگائے بات کر رہی تھیں اور ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا فارس' جس کا ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا تھا' انہیں دیکھ رہا تھا۔ مقابل صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی حنین گھٹنوں پہ آم کی پلیٹ رکھے' بیزار سی قاشیں کاٹ رہی تھی۔

"جی۔ یہ فارس نے ہی مجھ سے کہا ہے بڑے ابا۔" ندرت نے کہنے کے ساتھ فارس کو دیکھا۔

"جی وہ اسی اتوار کی بات کر رہا ہے۔ جی ابا! میں نے بھی اس سے کہا تھا کہ اتوار میں صرف تین ہی دن ہیں' مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ دیر نہیں کرنا چاہتا۔ آپ زمر سے پوچھ کر بتا دیں' اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے تو..." وہ رک کر بات سننے لگیں۔ چہرے پہ سکون اور خوشی تھی۔

"جی ابا۔ ٹھیک ہے۔ میں فارس کو بتا دیتی ہوں۔

شکریہ ابا۔ ممنون رکھ کر وہ اس کی جانب مڑیں۔
"وہ کہہ رہے ہیں' نکاح کے لیے اتوار کا دن ٹھیک ہے۔ مان گئے ہیں۔"
فارس نے تعجب سے ابرو اکٹھے کیے۔ "اپنی بیٹی سے بات کیے بغیر؟"
"ان کا کہنا ہے کہ جب دوسری طرف سے تاریخ مانگی جائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے دو دفعہ بھی تو یہی ہوا تھا نا۔ اب وہ ڈر گئے ہیں۔ مگر تم مجھے بتاؤ' اتنی جلدی مچانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"زیادہ دیر کی تو شاید میں اپنا ذہن بدل لوں۔" ہلکے سے شانے اچکا کر وہ کورکی سمت دیکھنے لگا۔
"دو دن میں کیا تیاری ہو گی؟ مانا کہ صرف گھر کے لوگ ہوں گے مگر کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔"
"امی! میرے کپڑے بھی لینے ہیں۔" حنین نے قاش کھاتے لقمہ دیا۔
"میرے کپڑے بھی۔" اندر سے سیم نے گلا پھاڑ کر پکارا۔
"ہاں' بس زمر کا ڈریس لوں یا نہیں' تم لوگوں کی چیزیں پوری ہونا چاہئیں۔ اٹھو' نماز پڑھو۔" جل کر کہتی گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور کمرے کی طرف چل دیں۔
"ابھی بھی وقت ہے' انکار کر دیں' ماموں۔" حنہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔
"میں سن رہی ہوں حنین۔ فضول بکواس مت کیا کرو۔ اٹھو نماز پڑھو۔" اندر سے امی کی غصیلی آواز یہاں تک آئی مگر وہ سکون سے آم کی قاش کو ہاتھوں سے منہ کے اندر لے جاتی رہی۔
"میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے مجھ پہ احسان ہیں۔" اس نے آواز دھیمی کر لی۔
حنین پیلے رس والے ہاتھوں سے چھلکوں کی پلیٹ اٹھائے کھڑی ہوئی اور کچن میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو ہاتھ منہ دھلا ہوا تھا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتی وہ اس کے قریب صوفے پہ بیٹھی۔

"امی سے کہہ دیں' وہ انکار کر دیں گی۔" نیا آئیڈیا پیش کیا۔
"تم کیوں چاہتی ہو میں انکار کروں؟"
"کیونکہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ غلطی کرنے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کو پسند نہیں کرتیں' پھر کیسے رہیں گے ان کے ساتھ؟"
"تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں جو انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا؟"
حنین نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا نہیں بھولے؟"

"چار سال!" فارس نے انگوٹھا اندر کر کے چار انگلیاں اسے دکھائیں۔ "چار سال اس عورت نے جو میرے ساتھ کیا' مجھے جس طرح ذلیل کیے رکھا' پوری دنیا کے سامنے مجھے قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی' میرا ساتھ نہیں دیا' وہ سب بھولا نہیں ہوں میں۔" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سختی در آئی تھی۔
حنین بالکل ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگی' پھر سر نفی میں ہلاتی پیچھے ہٹی۔
"تو آپ یہ شادی مجبوری میں' زبردستی نہیں کر رہے؟ آپ ان سے انتقام لینا چاہتے ہیں؟" اس کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلی تھی۔
"نہیں' صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔"
مگر حنہ نے "اونہوں" نفی میں گردن ہلائی۔ "یو نو واٹ ماموں' آپ یہ شادی کر لیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو ڈیزرو کرتے ہیں۔"
جل کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس ہلکا پھلکا سا مسکرایا۔ اسے حنہ کی بات نے لطف دیا تھا۔ گردن اٹھا کر اسے دیکھا جو پہلے کی طرح اب عینک نہیں لگاتی تھی۔
"عینک والی حنہ کہاں گئی؟" اس کے چہرے پہ کچھ کھوجتے وہ جیسے سوچنے لگا۔
"آپریٹ کروالی تھیں آنکھیں۔ اب تو عینک بھول بھال گئی۔" اس نے نظریں چرالیں۔ اودھر ادھر دیکھنے

لگی' پھر دوبارہ اسے دیکھا تو وہ ہنوز پُرسوچ نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔
"تم میں کچھ بدل گیا ہے۔" چند دن لگے تھے مگر اس نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اور حنین نے بے اختیار سوچا کہ پچھلا ڈیڑھ برس زیادہ اچھا تھا جس میں اتنے رشتے داروں سے میل ملاپ نہیں ہوا اور کسی نے اس سے یہ بات نہیں کہی جو ان ڈھائی ہفتوں میں کئی لوگ کہہ چکے تھے۔
"ویسی ہی ہوں۔ اتنا ہی کھاتی ہوں۔ اتنا ہی بولتی ہوں۔ آپ بات کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔" خفگی سے کہتے اس نے ریموورٹ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے امی کی چنگھاڑ سنائی دی۔
"سیم! حنین' میں جوتا اتاروں گی تو تم لوگ اٹھو گے نماز کے لیے؟"
حنین نے پیر پٹخ کر ریموورٹ رکھا اور غصے سے بڑبڑائی۔ "پتا نہیں ان زبردستی کی نمازوں کا کیا فائدہ۔" اور سر جھٹک کر کمرے کی طرف چلی گئی۔
فارس ٹی وی کی اسکرین کو دیکھتا کچھ سوچتا رہا۔



ایک شکست کے بدلے مجھ کو سب کے سب الزام نہ دے
کچھ کچھ تیری بات ہے سچی لیکن پوری ٹھیک نہیں!
اگلی صبح قصر کاردار پہ سنہرے پر پھیلائے یوں روشن ہوئی کہ برآمدے کے اونچے سفید ستون سونے کی مانند چمکنے لگے۔ ایسے ہی ایک ستون کے ساتھ ہاشم موبائل پہ بٹن دباتا چلا آرہا تھا۔ گرے پن اسٹرائپ سوٹ میں ملبوس' بال جیل سے پیچھے کیے' وہ آفس کے لیے تیار تھا۔ ساتھ چلتی جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا' وہ کوئی میسج ٹائپ کرتے' اوپری زینے پہ رکا تھا۔ نیچے سبزہ زار پہ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ایک ملازم نے بریف کیس اندر رکھ دیا تھا' دوسرا دروازہ کھولنے کھڑا تھا۔
پیغام بھیج کر اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ "آپ آرام سے آئیں گی آفس؟"
"ہوں۔ دس بجے تک۔"
"شیرو کو لے کر آیئے گا' میں۔" فون کی بجتی گھنٹی پہ وہ رکا' ایک منٹ کا اشارہ کیا اور فون کان سے لگایا۔
"ہاں بولو۔ اچھا۔ ہاں ٹھیک ہے' تم میری انجیو کو دے دو کام' وہ سنبھال لے گی۔"
فون بند کرکے جواہرات کا گال چومنے آگے بڑھا کہ وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ ہاشم پہلے حیران ہوا' پھر جواہرات کی بے یقینی سے پھیلی آنکھوں کو دیکھا تو گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔
"مجھے اس سعدی والے معاملے نے مصروف کردیا' ورنہ میں آپ کو بتانے والا تھا۔"
"کیا تم نے کہا' میری انجیو؟" وہ ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔
"اب تک آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔"
"کیا تم نے کہا میری انجیو؟" وہ مضطرب مگر بلند آواز میں بولی۔
"میں نے اسے ڈی پورٹ نہیں کروایا' اس کی ایجنسی سے بھی بات نہیں کی۔ آپ سے کہا تھا کروں گا' مگر نہیں کیا۔ مجھے فیکٹری میں کچھ لوگوں کی نگرانی کروانی تھی' میری سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کرسکتا' سو میں نے اسے روک لیا۔"
"تم یہ کیسے کرسکتے ہو ہاشم؟" جواہرات کا اضطراب غصے میں ڈھلنے لگا۔ "کیا تم بھول گئے' اس نے میرا نیکلس چرایا تھا۔"
"وہی نیکلس جو ڈیڑھ ہفتے سے سعدی کے پاس ہے؟"
"بات چوری کی ہے' اس نے اعتراف جرم بھی کرلیا تھا۔"
"یہی بات اس کو زیادہ قابل اعتبار بناتی ہے ممی! اس نے چوری کی' مگر پھر جھوٹ نہیں بولا۔ وہ کتنے سال ہمارے خاندان کے ساتھ وفادار رہی ہے' اس کا بچہ بیمار تھا' اس لیے اس نے یہ کردیا۔"
"تم کیسے اس کو دوبارہ کام پہ رکھ سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ اب تک بے یقین تھی۔
"ریلیکس ممی۔ صرف ایک مہینے کی بات ہے' میرا

کام ہو جائے میں اسے واپس بھجوا دوں گا۔"

"وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرے گی ہاشم! تمہیں اس پہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیوں فکر کرتی ہیں؟ ہاشم سب سنبھال لے گا۔ صرف ایک مہینہ ہی تو ہے، ممی۔" اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر گویا تسلی دی اور مسکرا کر الوداعی کلمات کہتا برآمدے کے زینے اترنے لگا۔ جواہرات سفید پریشان چہرہ لیے کھڑی، اضطرابی انداز میں لاکٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

(ڈیڑھ سال لگا اسے ہاشم کی وفادار ملازمہ کا بھروسا توڑنے میں، اتنی مشکل سے ایسے اس سے جرم کروایا کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کا اصل جرم کیا تھا۔ اور اس سب کے باوجود بھی وہ اسی شہر میں تھی۔ مگر وہ کھلم کھلا اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاشم کو شک ہو گیا تو... نہیں۔) وہ نفی میں سر ہلاتی اندر کی طرف مڑ گئی۔

ہاشم کی گاڑی جب مرکزی گیٹ تک آئی تو ایک دوسری گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈرائیونگ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھی شہرین کا چہرہ دیکھ کر ہاشم کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ ایک اشارہ ڈرائیور کو کیا، دوسرا مقابل کار میں موجود شہرین کو۔ ڈرائیور نے کار سائیڈ پہ لگا دی اور باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد، پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر شہرین ساتھ بیٹھی۔ وہ صبح کی مناسبت سے سفید بنا آستین کی اونچی قیص اور بیج ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ سنہرے باب کٹ بال چونچ کی صورت چہرے کے اطراف میں آتے، سائیڈ کی مانگ اور سنہرے چہرے پہ شدید فکر مندی سی کیفیت۔

"میں تمہیں تین دن سے کال کر رہی ہوں، تم اٹینڈ نہیں کر رہے۔" اس کی طرف چہرہ کر کے بیٹھی مضطرب سی کہنے لگی۔ "ہاشم! میں سونیا کی ماں ہوں، میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اس کے بغیر کیسے رہوں گی؟"

وہ سر جھکائے موبائل پہ بٹن دبا رہا تھا، آخری بات پہ ہاتھ رکا۔ سخت نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں یہاں اس لیے بٹھایا ہے تاکہ ملازموں کے سامنے تماشا نہ بنے۔" (شہرین نے بے اختیار چہرہ موڑ کر دیکھا۔ دور کھڑا ڈرائیور۔ داخلی گیٹ پہ مامور سیکیورٹی اہلکار۔) "تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں جن میں سے دو تم ضائع کر چکی ہو۔ جو کہنا ہے کہو اور چھٹے منٹ سے پہلے تمہیں میری گاڑی سے باہر ہونا چاہیے۔"

"میں نے فلائٹ آگے کروالی ہے۔ سوموار اور منگل کی درمیانی رات کو جانا ہے۔ صرف ایک مہینے کے لیے۔ پلیز سونی کو میرے ساتھ جانے دو۔"

"سونی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ بات ختم۔" تنے ابرو اور خشک لہجے کے ساتھ اس نے کہا تو شہرین کے چہرے کی پریشانی بڑھ گئی۔

"ہاشم! ایک ہفتے سے میں نے سونی کو دیکھا تک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے گھر ہے، میں۔۔۔"

"وہ اپنے باپ کے گھر ہے اور اب یہیں رہے گی۔"

"میں اس کی ماں ہوں۔"

"یہ بات تمہیں میرے خلاف اس لڑکے کی مدد کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔" تلخی سے کہتے ہاشم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے ہاشم اور اپنے درمیان سیٹ کا فیبرک بے بسی سے بھینچا۔

"وہ میرا دوست ہے، وہ میرے کئی کام کر چکا ہے۔ میں صرف اس کا فیور لوٹا رہی تھی۔ وہ تمہارا دوست ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے خلاف کچھ کر رہا ہو گا، میں تو اسے کوئی ایڈونچر سمجھی تھی۔"

"ہر چیز ایڈونچر نہیں ہوتی شہری۔" درشتی سے کہتے اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

"اسے کہو، جو اس نے میرا چرایا ہے، وہ واپس کر دے تو میں سونی کو تمہارے ساتھ جانے دوں گا، ورنہ نہیں۔"

"وہ تو مجھ سے بات بھی کرنے کا روادار نہیں۔ وہ..."

"تمہارے پانچ منٹ تمام ہوئے۔ اب جاؤ۔" اور

موبائل اٹھا کر بٹن دبانے لگا۔ شہرین بے بسی سے اسے دیکھتی رہی' پھر دروازے کی طرف مڑی' اسے کھولا اور ہیل والا پیر زمین پہ رکھا ہی تھا کہ سر جھکائے موبائل پہ بٹن دباتا ہاشم دھیمے سے بولا۔

"اور وہ میرا دوست نہیں ہے۔ ہاشم کے دل سے جو اتر گیا' سو اتر گیا۔"

شہرین ایک پاؤں روش پہ رکھے' دروازہ پکڑے چند لمحے کو بالکل بُت سی رہ گئی۔ گلے میں آنسوؤں کا گولا سا پھنسا' مگر پھر آنکھوں کی نمی اندر جذب کر کے وہ گردن اکڑا کر باہر نکلی اور دروازہ دے مارنے والے انداز میں بند کیا۔ کار زن سے آگے بڑھ گئی تو وہ مڑی۔ پتھریلی سڑک اوپر جاتی تھی۔ اور اٹھان پہ قصر کاردار تھا' پُرعزم آنکھوں سے اس نے اس اونچے محل کو دیکھا اور قدم قدم اوپر چڑھنے لگی۔ اس گھر میں ابھی ایک اور شخص تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔



نہ گنواؤ ناوک نیم کش' دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' تن داغ داغ لٹا دیا

یوسف صاحب کے بنگلے میں وہ صبح پہلے سے زیادہ مصروف طلوع ہوئی تھی۔ لاؤنج میں بڑے ابا وہیل چیئر پہ بیٹھے' بار بار فکرمند نگاہ اٹھا کر زمر کے کمرے کی سمت دیکھتے تھے جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ فجر کے ساتھ ہی یہ ہلچل شروع ہو چکی تھی اور اب تک جاری تھی۔

"صداقت' یہ باکس پکڑاؤ۔" "صداقت' یہ کتابیں اس کارٹن میں ڈالو۔" "صداقت' یہ گیرج میں رکھ آؤ۔" ساتھ میں زمر کی ہدایات بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بڑے ابا خاموشی مگر بے چینی سے راہداری پہ نگاہیں مرکوز کیے بیٹھے اس دوسرے جوتے کا انتظار کر رہے تھے جو زمر نہیں پھینک رہی تھی۔

دفعتاً وہ آتی دکھائی دی۔ رف کپڑوں میں ملبوس' بالوں کا جوڑا بنائے' دونوں ہاتھوں میں خاکی کارٹن پکڑے اس نے لاؤنج کے فرش پہ کارٹن دھرا اور صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"صداقت۔" کارٹن کا چار ٹکڑوں والا ڈھکن بند کرتے اس نے آواز دی۔ وہ بھاگا آیا۔ ساتھ ہی ڈکٹ ٹیپ اور قینچی اسے تھمائی۔

"اس میں میرے اہم ڈاکومنٹس ہیں' جب فارس صاحب کے گھر جاؤ تو ان کو میرے دوسرے سامان کے اوپر رکھنا' کسی چیز کے نیچے نہ دے دینا۔" ٹیپ سے ڈھکن کو سیل کرتے وہ سادگی سے ہدایات دے رہی تھی۔

"جی باجی۔" وہ تابع داری سے سر ہلا رہا تھا۔ جب کارٹن بند ہو گیا تو اسے اٹھا کر گیرج میں رکھنے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں واپس جانے لگی کہ ابھی اور بہت کام رہتا تھا۔

"تم یہ کن کاموں میں لگی ہو؟" وہ اکتا چکے تھے۔

زمر گہری سانس لے کر ان کی طرف مڑی۔ "آپ نے خود ہی کہا کہ سنڈے کو میری شادی ہے' تو اپنا سامان پیک کر رہی ہوں۔"

"کیا تمہیں برا لگا ہے؟ اگر کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ میں....."

"ابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پریشان مت ہوں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے جلد شادی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے بس آپ کی فکر ہے۔"

"میں سعدی کے گھر چلا جاؤں گا' یہ گھر مہینے کے آخر تک خالی کر دوں گا۔"

"اور سب کچھ سمیٹنا تو مجھے ہی ہے نا۔" نرمی سے مسکرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم نے اپنے کپڑے نہیں لیے۔" ان کی پریشانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"بھابھی نے کہا تھا' وہ شام کو آئیں گی اور ہم اکٹھے جا کر لے لیں گے۔" وہ نرم آنکھوں سے مسکراتی رسان سے بتا رہی تھی۔ بڑے ابا نے متفکر نظروں سے اس کا چہرہ کھوجا۔

"مگر تم اس جلد شادی سے خوش تو ہو نا؟"

"ابا! جو بعد میں ہونا ہی ہے' تو اسے ابھی کر لینا

چاہیے۔ مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ اچھا میں اب اپنے کپڑے پیک کرلوں۔" ان کی تسلی کرکے وہ آستین فولڈ کرتی راہداری میں آگے چلتی گئی۔ ابا نے بس سرہلا دیا۔

وہ کمرے میں آئی اور کھلے سوٹ کیس کو دیکھا جس کے ساتھ ہینگرز میں ٹنگے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے ان کو ہینگرز سے اتار کر تہہ کرنا شروع کیا۔ تبھی راہداری میں قدموں کی آواز آئی۔

"صداقت! یہ جو شاپرز ہیں' ان کو۔۔۔" مصروف انداز میں کہتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو یکدم منجمد ہو گئی۔

چوکھٹ میں صداقت کھڑا تھا۔ سر جھکا تھا۔ ذرا شرماتا' ذرا ہچکچاتا۔ دونوں ہاتھوں میں خاکی لفافے میں لپٹا ہوا کچھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔

"باجی۔۔۔! وہ جو میری چاچی آئی تھی نا اس دن گاؤں سے؟ کل وہ پھر آئی تھی۔ اس کو بتایا تھا کہ باجی کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ وہ گاؤں سے لائی تھی آپ کے لیے۔" وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور خاکی لفافے میں لپٹی شے بڑھائی۔

"یہ۔۔۔" زمر نے اسے تھاما اور لفافہ ہٹا کر دیکھا۔ اندر شیشوں اور کڑھائی والی شال تھی۔

"ہمارے ہاں جی بیٹیوں کو شادی پہ یہ ضرور دی جاتی ہے۔ تو میں نے چاچی سے کہا کہ ایک باجی کے لیے بھی لے آئے۔" انگلیاں موڑ کر' سر جھکائے شرما شرما کر صداقت کہہ رہا تھا اور زمر بس ہاتھ میں پکڑی شال کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ بہت خوب صورت ہے صداقت۔" وہ بمشکل پھیکا سا مسکرائی۔ "چاچی کو شکریہ کہنا' مگر۔۔۔ تم نے خوامخواہ اتنا خرچا کیا۔ میری شادی۔" حلق میں کوئی پھندا سا لگا۔ "کوئی عام شادیوں کی طرح تھوڑی ہے؟"

"پر باجی! شادی تو ایک ہی دفعہ ہوتی ہے' جیسے بھی ہو۔" اس نے کوئی فلسفہ گھڑنا چاہا مگر نہیں گھڑ پایا۔ سو جلدی سے شاپرز اٹھانے لگا۔

"ان کو باہر رکھ آتا ہوں جی۔" وہ چلا گیا اور زمر کھڑی اس شال کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چبھ رہی تھیں۔ تکلیف سی تکلیف تھی۔

پھر شال ہاتھوں میں پکڑے' وہ ایک دم باہر نکلی۔ راہداری میں وہ ٹھہری۔ ابا وہیل چیئر پہ بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"ابا! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ یہ اصلی شادی نہیں ہے۔ میں صرف اس کو برباد کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اتنا ہلکا بڑبڑائی کہ خود کو بھی سنائی نہ دیا' ابا تو کافی دور تھے۔ پھر یکایک انہوں نے گردن موڑی تو دیکھا' وہ راہداری میں کھڑی' پیکٹ ہاتھوں میں پکڑے' انہیں دیکھے جا رہی ہے۔

"کوئی بات ہے زمر؟"

وہ "جی" میں سر ہلاتی قریب آئی۔ ان کے بالکل مقابل آ کھڑی ہوئی۔ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے' پھر بند کر لیے۔

"ابھی فارس کا فون آیا تھا۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر خود ہی بتانے لگے۔ "اس نے کہا کہ کاردار خاندان میں سے کسی کو شادی پہ نہ بلایا جائے۔ گو کہ میں مسز کاردار کو مدعو کرنا چاہتا تھا' مگر میں نے پھر بھی فارس کی بات مان لی۔ وہ سمجھ دار ہے۔ کچھ سوچ کر کہہ رہا ہو گا۔"

"آپ نے وجہ نہیں پوچھی؟" زمر کے چہرے کی فکرمندی اور بے چینی اب قدرے ٹھنڈے تاثرات میں ڈھلنے لگی تھی۔

"کوئی بھی وجہ ہو' مجھے فارس پہ بھروسا ہے۔ وہ غلط فیصلہ کرکے مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ تم کچھ کہہ رہی تھیں؟" انہیں دوبارہ خیال آیا کہ وہ ادھر کیوں آ کھڑی ہوئی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

"جی۔ میں یہ دکھانے آئی تھی۔ دیکھیں صداقت کیا لایا ہے میرے لیے۔" ٹھنڈے' نرم انداز میں کہتی وہ پیکٹ کھول کر ان کو دکھانے لگی۔

صداقت اندر آیا تو وہ دونوں شال کھول کر دیکھتے اس پہ تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ شرما کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲

کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

شہرین چیونگم چباتی' آنکھوں پہ ڈارک گلاسز لگائے' گردن اکڑا کر چلتی قصر کاردار میں داخل ہوئی تو سامنے لاؤنج کی اونچی کرسی پہ جواہرات کو بیٹھے دیکھا جو ملکہ کی شان سے براجمان گھٹنوں پہ رکھا اخبار کھولے دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شہرین کھڑی تھی۔

"گڈ مارننگ مسز کاردار۔ سونی کہاں ہے؟" سن گلاسز اونچے کر کے بالوں پہ چڑھاتے اس نے ادھر ادھر دیکھتے پوچھا۔ یہ سعدی کو لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ دینے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی' اور اسی لیے جواہرات سے نگاہیں ملانے سے احتراز کر رہی تھی۔

"اپنے کمرے میں اور یقیناً" تم اس بات سے واقف ہو گی کہ سونی کو یہاں سے لے کر نہیں جا سکتیں۔" وہ پھر سے اخبار پڑھنے لگ گئی۔

شہرین نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھتے جیسے بہت ضبط کیا۔

"بالکل۔" ہلکے سے کندھے اچکائے اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہیل کی ٹک ٹک ہر زینے کے ساتھ اوپر چلتی گئی۔ جواہرات مسکراتے ہوئے اخبار پڑھتی رہی۔

اوپر ریلنگ کے ساتھ کھڑی شہرین نے نیچے دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی اور بھرپور اعتماد کے ساتھ نوشیرواں کے کمرے کے بند دروازے پہ مٹھی سے دستک دی۔ نگاہیں نیچے بیٹھی جواہرات پہ مرکوز تھیں جس نے یقیناً" دستک کے محل وقوع کا اندازہ کر لیا تھا مگر کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔

"شیرو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" تیسری دستک کے بعد اس نے پکارا۔ تب ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے نوشیرواں کھڑا تھا۔ ٹراؤزر اور شرٹ میں' بال اڑے اڑے سے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نیند سے جاگا تھا اور شہری کو دیکھ کر پورا جاگ گیا تھا۔

وہ کچھ کہے بنا اندر چلی آئی' گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر آرام سے ایک کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' پیر جھلاتے ہوئے شیرو کو دیکھا۔

"فریش ہو کر آجاؤ۔ ہمیں بات کرنی ہے۔" انداز نرم مگر تحکم سے بھرپور تھا۔ وہ جز بز سا اسے دیکھتا باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

"سونیا والے معاملے میں' میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ کو مجھ سے امید نہیں رکھنی چاہیے۔" چند منٹ بعد' اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا' دھلے دھلائے چہرے والا شیرو تنے ابرو کے ساتھ قدرے خشکی سے کہہ رہا تھا' البتہ لہجے کی خشکی زبردستی تھی۔ بار بار وہ نرمی میں ڈھلنے لگتی' اور وہ اسے پھر سے غصے اور ناگواری میں لپیٹتا۔ گاہے بگاہے نگاہیں اٹھا کر شہرین کے خوب صورت سنہرے چہرے کو بھی دیکھ لیتا۔ وہ اسی اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"ناراض تو مجھے تم سے ہونا چاہیے' مگر تم مجھ سے کیوں خفا ہو؟"

"جو آپ نے سعدی کے ساتھ مل کر کیا' اسے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔" اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہتے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"تم اس قسم کے انسان تو نہیں تھے شیرو! کہ شہری کی کوئی بات ہی نہ سنو۔ میں ہاشم کو اصل وجہ نہ بتاؤں' مگر تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے پوچھنے پہ میں ضرور بتاتی۔"

"اصل وجہ؟" شیرو نے چونک کر اسے دیکھا۔ شہرین کی آنکھوں میں افسوس اترا۔

"تو کیا تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری طرح میں بھی استعمال کی جا سکتی ہوں؟ میں بھی یہ کرنے پہ مجبور ہو سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری خود غرضی پہ افسوس ہو رہا ہے۔" اور پھر ایک دم وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جب تم نے میری مجبوری سمجھی ہی نہیں تو میرے بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے تو مجھے سخت مایوس کیا ہے شیرو۔" اور وہ تاسف سے کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔

نوشیرواں بڑبڑا کر اٹھا۔ "نہیں، پلیز۔ آپ جائیں مت۔ مجھے بتائیں تو سہی کہ اصل بات کیا ہے؟" ساری اکڑ، ناراضی، غصہ اڑنچھو ہو گیا۔ اور وہ ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف گھومی۔ سخت نظروں سے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"میں کیوں بتاؤں تمہیں؟ تم کون سا میرا یقین کرو گے؟ تم بھی سعدی کی طرح مجھے ذلیل ہی کرو گے۔" خفگی سے کہتی وہ خود ہی بیٹھ گئی۔ اب کے نوشیرواں اس کے سامنے بیٹھا تو ذرا متفکر ہو کر بیٹھا تھا۔

"سعدی نے آپ کو...؟" الجھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"میں نے اس دن سعدی کو اپنا دوست کہا، جب تم اور ہاشم سونی کو ڈراپ کرنے آئے تھے۔ غلط کہا تھا میں نے۔ اس لیے تاکہ اسے اصل بات نہ بتانی پڑے۔" کہتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی ٹھوڑی تک آتے بالوں کی چونچ نما لٹ انگلی سے پیچھے ہٹائی۔ وہ اچنبھے مگر توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سعدی میرا دوست نہیں ہے۔ تم مجھے جانتے ہو، میں اور تم ایسے لڑکے کو کیسے اپنا دوست بنا سکتے ہیں؟" اس نے کہتے ناگواری سے ناک سے مکھی اڑائی۔

"اس کے پاس میری ایک ویڈیو تھی۔ ایک پارٹی کی ویڈیو، اب تفصیل مت پوچھنا، بس وہ ویڈیو مجھے اسکینڈلائز کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ویڈیو اس کلب کے سسٹم سے مٹا دو، مگر وہ اتنی آسانی سے مٹانے والا نہیں تھا۔ مجھ سے پانچ لاکھ لیے اس کام کے اور اس کے بدلے میں ایک فیور مانگوں گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بدلے میں مجھے تمہیں استعمال کرنے کو کہے گا۔ اونہوں۔" نفی میں سر ہلاتے اس نے آنکھیں بند کر کے ماتھے پہ انگلیاں رکھیں۔

نوشیرواں بالکل سانس روک کے سن رہا تھا۔ دم بخود۔

"میں تو اس سے ملتی بھی نہیں تھی مجھے مال میں جا لیا اس نے۔ سونی کی پارٹی کی صبح اور بولا کہ یہ کام کروں میں نے انکار کیا تو اس نے کہا کیا میں نے بھی ایسے ہی انکار کیا تھا آپ کو کام کرتے وقت؟ یہ ایک دھمکی تھی اگر میں انکار کروں گی تو میری ویڈیو لیک کر کے میرا اسکینڈل بنوائے گا۔ اس کے بعد سونی کو ہاشم میرے سائے سے بھی دور کر دے گا۔ میں تم لوگوں سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔" شیرو کے چہرے کو دیکھتی وہ دل گرفتی سے کہہ رہی تھی۔ لفظ "تم لوگوں" پہ نوشیرواں کی آنکھوں کی حیرت، برہمی میں بدلنے لگی۔ اس برہمی میں سعدی کے لیے نفرت اور شیری کے لیے ہمدردی تھی۔

"وہ آپ کو بلیک میل کر رہا تھا؟ تو مجھے یا ہاشم بھائی کو کیوں نہیں بتایا؟" حسب عادت وہ بھڑک کر آگے ہوا، گویا اٹھنے کو تیار ہو۔ شہرین نے گڑبڑا کر دروازے کو دیکھا جس کے پار، نیچے جواہرات اخبار پڑھ رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کو ڈر لگا کہ یہ گھامڑ اگر دندناتا ہوا باہر نکل گیا تو ساری کہانی گئی فلاپ۔

"ہاشم میرا کچھ نہیں لگتا، شیرو۔" اس نے بظاہر بہت ضبط سے کہا مگر بڑی بڑی سبز لینز لگی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "ہاشم میرا شوہر نہیں ہے۔ ایسے لڑکوں سے صرف آپ کے شوہر پروٹیکٹ کرتے ہیں آپ کو، اور میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ میں..." سینے پہ انگلی رکھ کر بھرائی آواز میں بولی۔ "میں اکیلی ہوں، بالکل اکیلی۔" سانس ناک کے ذریعے اندر کھینچا، انگلی سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔ "مجھے ٹشو لا دو۔ میں پتا نہیں کیوں ایموشنل ہو رہی ہوں۔" گیلی آواز سے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے اس نے چہرہ پرے پھیر لیا گویا آنسو چھپانا چاہ رہی ہو۔

نوشیرواں فوراً اٹھا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ٹشو کا باکس اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔

"آپ..." اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"تھینک یو۔" اس نے آنکھیں تھپتھپا کر صاف کیں اور چہرہ اس کی طرف پھیر کر مسکرائی۔ "میں تم

سے ہمدردی لینے نہیں آئی تھی' نہ اس لیے آئی ہوں کہ تم ہاشم سے سونیا کے لیے بات کرو۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تم اس سے کوئی بات نہ کرو۔ میں تمہیں مزید تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بس تم میری طرف سے دل صاف کرلو۔"

وہ اٹھ گئی' پرس کی لمبی زنجیر کندھے پہ ڈالی' ہلکا سا نوشیرواں کے کندھے کو تھپتھپایا اور باہر نکل گئی۔ وہ بالکل گم صم سا بیٹھا رہ گیا۔

سونی کے کمرے کی طرف جاتے وہ ریلنگ پہ رکی' چہرہ جھکا کر نیچے جھانکا۔ جواہرات اب ادھر نہیں تھی۔ وہ مسکرائی اور پورے کروفر اور اٹھی گردن کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔



قاتل سے عشق بھی' مقتول سے ہمدردی بھی
تو بھلا کس سے محبت کی جزا مانگے گا

ہاشم کاردار کے آفس میں اے سی کی خنکی اور ٹھنڈ پھیلی تھی اور وہ کوٹ میں ملبوس' پاور سیٹ پہ براجمان' موبائل کان سے لگائے' سامنے رکھی فائل کے صفحے پلٹتے کہہ رہا تھا۔

"بڑے ہو جاؤ شیرو۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے' بکواس کر رہی ہے۔" اکتا کر اس نے شیرو کی کہانی درمیان سے کاٹی۔ "وہ اس کی ٹانگ جتنا لڑکا اسے بلیک میل کرے گا؟ پانچ سال گزارے ہیں میں نے اس عورت کے ساتھ' بیچ گئی ہوگی اپنے مسئلے اس کے پاس لے کر۔"

"مگر بھائی! وہ سعدی ہے ہی۔۔۔" نوشیرواں جس کی شہرین کے لیے نرم آواز سعدی کے نام پہ برہمی سے کانپنے لگتی نے' مزید کچھ کہنا چاہا مگر ہاشم مصروف تھا' اور بے زار بھی۔

"سعدی کو میں سنبھال لوں گا تم بس شہری سے دور رہو۔"

"مگر آپ سونیا کو۔۔۔"

"وہ تمہیں دوسری دفعہ بے وقوف بنا رہی ہے شیرو! پہلی دفعہ اس پہ لعنت' دوسری دفعہ تم پہ۔" لہجے میں بے زاری اور غصہ در آنے لگا۔ "اور اب تم اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے آفس میں نظر آؤ۔" موبائل بند کر کے میز پہ ڈالا' اور خفگی سے منہ میں کچھ بڑبڑاتے قلم دان سے قلم نکال کر کاغذات پہ دستخط کرنے لگا۔ کام ختم کر کے فائل بند کی اور انٹر کام اٹھایا۔

"حلیمہ' خاور آفس میں ہے؟"

"جی' وہ شاید نچلے فلور پہ ہیں۔"

"اسے میرے پاس بھیجو۔۔۔" ریسیور رکھتے رکھتے وہ رکا۔ "وہ اس لڑکے' سعدی یوسف کا کوئی فون آیا؟"

"سر! میں نے دو دن پہلے دوبارہ ان کو کال کی تھی' انہوں نے کہا کہ اگلے ہفتے آئیں گے وہ۔ دن نہیں بتایا۔ میں ان کو کال کروں؟"

"اونہوں۔ وہ خود کرے گا۔ بہرحال' جب کہے' وقت اور دن مت دیکھنا' اسے آنے کا کہہ دینا۔" ریسیور رکھ کر اس نے ٹیک لگالی اور کچھ سوچتے ہوئے اوپر چھت کو دیکھنے لگا۔

خاور اندر داخل ہوا تو وہ سیدھا ہوا۔ سنجیدہ' ٹھنڈے تاثرات سے اسے دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ اور پینٹ میں ملبوس اونچا لمبا سا تھا۔ ٹائی نہیں باندھتا تھا۔ بال اور مونچھیں دونوں سیاہ تھیں۔ رنگت سانولی اور نقش متناسب تھے۔ ہاتھ باندھے' سنجیدگی سے چلتا وہ سامنے آیا۔

"وہ ملا جو میں نے تلاش کرنے کے لیے کہا تھا؟"

خاور کی آنکھوں میں مایوسی در آئی' نفی میں گردن ہلائی۔

"نو سر! ابھی تک تو اس لڑکے کے بارے میں کوئی dirt نہیں ملا۔"

ہاشم قدرے برہمی سے آگے کو ہوا۔ "تو تم اتنے دنوں سے کیا کر رہے ہو؟ وہ کچھ دن بعد میرے سامنے ادھر کھڑا ہوگا' اور اگر میرے پاس کوئی لیوریج ہی نہیں ہوگا اس کے خلاف تو میں اسے کیسے سنبھالوں گا؟"

"سر! میں نے پوری کوشش کی' مگر وہ ہر طرح سے صاف ہے۔ اپنے خاندان کا وہ فیورٹ ہے تو دوستوں کا

آئیڈیل - کسی کو کوئی کام ہو تو سعدی ہے نا۔" وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ "محلے کا چوکیدار رکھنا ہو یا گلی میں اسپیڈ بریکر بنوانا ہو، ہمسایوں کے لڑکے فوراً" اسی کے پاس جاتے ہیں، بہترین اسٹوڈنٹ اور جاب پہ ایک ایمان دار اور محنتی ایمپلائی۔ اس کا کوئی ڈرٹی سیکرٹ نہیں ملا مجھے۔ وہ لڑکا گویا فرشتہ ہے۔"

ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ سرد تلخ سی مسکراہٹ۔ نفی میں سر ہلایا اور میز پہ رکھا پین انگلیوں میں گھماتے بولا۔ "میں تمہیں بتاؤں خاور! کوئی بھی فرشتہ نہیں ہوتا۔ سب کے راز ہوتے ہیں۔ تم نے درست جگہ نہیں دیکھا ہوگا۔"

خاور ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں سکیڑے کچھ سوچا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک جگہ میں نے واقعی نہیں دیکھا۔" پھر سوچتے سوچتے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل، وہ فرشتہ نہیں ہے۔ مجھے ایک دن دیں، اس کی انسانیت دکھاتا ہوں آپ کو۔" ہاشم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، اور خاور عجلت میں باہر نکل گیا۔

ہاشم نے گہری سانس لے کر خود کو بہتر محسوس کیا، پھر موبائل اٹھایا اور زمر کا نمبر ملا کر کان سے لگایا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے، وہ اب لبوں میں کوئی دھن گنگناتے چھت کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔



میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

مال میں دوپہر کی نسبت رش تھا۔ مطمئن، خوش باش، مصروف لوگ اوپر نیچے، آگے پیچھے آ جا رہے تھے۔ ایسے میں دکانوں کی قطار کے سامنے راہداری میں حنین اور سیم بھی چل رہے تھے۔ ایک دکان کے سامنے وہ رکے، حنہ سیم کی جانب گھومی، شرارتی چمک دار آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"اے موٹے آلو! ونڈو شاپنگ کے دو اصول یاد ہیں؟"

گھنگھریالے بالوں والے دبلے پتلے اور لمبے لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل، تم ہر چیز مجھے دکھا دکھا کر کہو گی، سیم یہ لے لو اور میں بگڑے بچوں کی طرح، نہیں نہیں، کرتا آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"گڈ!" وہ مسکرائی، پھر اس کی کہنی میں بازو ڈالے شاپ میں داخل ہوئی۔ قدم بہ قدم دونوں ریکس کی جانب آئے۔ حنین نے مختلف کیپس وسیم کو دکھانی شروع کیں۔ "وسیم، بچے، دیکھو، یہ آپ پہ کتنی پیاری لگے گی۔"

وہ بگڑے انداز میں نفی میں سر ہلاتے بولا۔ "نہیں ماما! مجھے یہ نہیں چاہیے۔"

"ماما؟" اس نے تلملا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب سیلز مین انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

"سیم جان!" وہ جبراً" مسکرا کر پیار سے بولی۔ "بی ہیو یور سیلف، ورنہ ابھی آپ کے پاپا کو شکایت لگاتی ہوں۔"

"مگر ماما! پاپا تو کئی سال سے اوپر ہیں، اکاؤنٹنگ میں۔ (حساب کتاب میں)"

وہ معصومیت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر بولا اور اس سے پہلے کہ وہ سارے تخیل پہ لعنت بھیج کر اس کا کان مروڑتی، ہینڈ بیگ میں رکھا موبائل بج اٹھا۔

وہ جلدی سے موبائل نکالتی شاپ سے باہر آئی۔ سیم بھی پیچھے لپکا۔

"کیا امی اور پھپھو نے شاپنگ کر لی؟ کیا وہ بلا رہی ہیں؟" حنہ موبائل نکال کر دیکھ رہی تھی اور سیم سوال کر رہا تھا۔ یہ زمر کا موبائل تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے حنہ کو اس لیے دیا تھا کیونکہ وہ اور ندرت بالائی فلور پہ نکاح کا جوڑا خرید رہی تھیں اور سیم اور حنین ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے، ایسے میں ان کو "آزاد" کرنے سے قبل زمر نے اپنا فون حنہ کو دے دیا کہ جب فارغ ہو تو ندرت کے فون پہ بتا دے۔ اب بھی سیم یہی پوچھ رہا تھا مگر حنین بالکل چپ سی ہو کر بجتے فون کی اسکرین دیکھ رہی تھی۔

"ہاشم کاردار کالنگ۔" فون پکڑے ہاتھوں پہ پسینہ

آنے لگا' دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اٹھانا مت' حنہ! پھپھو کا فون ہے۔" سیم نے تنبیہہ کی' مگر جسے دنیا کا بدترین مرض لاحق ہو جائے' وہ اور کیا کرے ؟ اس نے انگوٹھے سے سبز دائرے کو سلائیڈ کر کے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو۔۔۔ زمر؟" وہ ذرا اٹھ کا تھا۔

"نہیں میں حنین۔" دھڑکتے دل اور بے قابو ہوتی خوشی سے وہ جلدی جلدی بتانے لگی۔ "اصل میں ہم مال میں ہیں' پھپھو اور امی دور ہیں' سو ان کا فون میرے پاس ہے۔"

"او کے۔ کیسی ہو تم حنین ؟" وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔

"میں بالکل ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں ؟" وہ بھی اعتماد سے مسکرا کر بولی۔ ایسے میں وہ سیم کی طرف متوجہ نہیں تھی جو خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہوں۔" اس کے انداز پہ وہ ہلکا سا ہنس دی۔

"تمہارا رزلٹ کب ہے ؟" اگلے سوال پہ حنہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑی' فوراً" سیم کو دیکھا جو بےزار سا کھڑا تھا۔

"اگست میں۔ اور۔۔۔" وہ رک گئی' تھوک نگلا۔ سارے لمحات پھر سے آنکھوں میں تازہ ہوئے۔ امتحانی مرکز میں ہاشم کو بلانا' پھر وہ سیاہ اور سنہری پارٹی۔

"ڈونٹ وری' تمہارا رزلٹ بہت اچھا آئے گا' اتنا کچا کام تو نہیں کیا ہو گا نا ہاشم نے۔" اس کے نرم تسلی دینے والے انداز پہ وہ پھیکا سا مسکرائی' مگر پُرجوش اعصاب اب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور ایفل ٹاور کی روشنیاں بھی ماند پڑنے لگیں۔

"میں پھپھو کو جا کر بتاتی ہوں' وہ آپ کو کال بیک کریں گی۔"

"وہ کال بیک نہیں کریں گی۔ میں دس منٹ میں دوبارہ کال کرتا ہوں۔" اور فون بند ہو گیا۔

"کیا کہہ رہے تھے ؟"

"مجھے خود نہیں پتا کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہے تھے۔" خود سے الجھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

جب وہ اس آؤٹ لٹ پہ آئے جہاں زمر اور امی تھیں تو دس منٹ بیت چکے تھے۔ وہ دونوں کاؤنٹر پہ کھڑی تھیں۔ ندرت سادگی سے سر پہ دوپٹہ لیے کھڑی' شاپنگ بیگ میں موجود جوڑے کو چیک کر رہی تھیں۔ کامدار جوڑے کا رنگ آف وائٹ تھا' ذرا سی جھلک سے حنین کو اندازہ ہوا۔ پھر وہ زمر کی طرف آئی' جو بال آدھے کیچر میں باندھے' سر جھکائے' سوٹ کی رسید پرس میں رکھ رہی تھی۔ اس کے "پھپھو" کہنے پہ سر اٹھایا۔ وہ حنین سے دراز قد تھی' دو انچ دراز۔ اور زیادہ جاذب نظر بھی۔ بھوری آنکھوں سے حنہ کو دیکھا اور نرمی سے مسکرائی۔

وہ جب ایسے مسکراتی تھی تو حنین گزرے برسوں کی ساری تلخی اور ناراضی بھولنے لگتی۔

"ہاشم بھائی کا فون آرہا ہے۔" دوبارہ بجتے سیل کو اس کی طرف بڑھایا۔ زمر نے موبائل سامنے کر کے دیکھا' پھر گہری سانس لے کر کان سے لگایا۔

"جی ہاشم' کہیے۔" مصروف سے انداز میں وہ پرس بند کرتی کویا ہوئی۔

"حنین بتا رہی تھی' آپ شاپنگ کر رہی ہیں۔ مجھے گیس کرنے دیں' کیا یہ آپ کی شادی کی شاپنگ ہے ؟" وہ گویا مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ زمر نے فوراً" حنین کو دیکھا' وہ ہاشم کی بات نہیں سن سکتی تھی' مگر جلدی سے بولی۔

"میں نے کال اٹینڈ کر کے بتایا تھا کہ ہم مال میں ہیں۔" ایک دم اپنا آپ مجرم لگنے لگا۔ نظریں فوراً" جھکا دیں۔

"ہاشم! آپ نے کیسے فون کیا ؟" بے تاثر' ٹھنڈے انداز میں پوچھتی وہ حنین کے ہمراہ چلتی باہر نکلی۔ ندرت اور سیم اگلی شاپ میں سیم کے کپڑوں کے لیے چلے گئے تھے۔ ندرت نے حنہ کو بھی آواز دی مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔

"آپ کو شادی کی مبارک باد دینے۔"

''ایک منٹ!'' اس نے فون کان سے ہٹائے بغیر بلند آواز میں حنین کو پکارا۔ ''حنہ! اگر یہ صاحب اگلے پانچ منٹ تک فون بند نہ کریں تو تم اونچی آواز میں مجھے پکار کر کہنا کہ بھابھی مجھے بلا رہی ہیں' اوکے؟ جی ہاشم! آپ کیا کہہ رہے تھے؟''

رسان سے کہتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ (حنہ کا تو منہ ہی کھل گیا۔)

وہ جواب میں زور سے ہنسا تھا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ کو اس روز وہ گولیاں میں نے ماری ہوتیں تو کیا آپ مجھ سے بھی شادی کر لیتیں؟'' وہ محظوظ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔ میں آپ کو قتل کرنا پسند کرتی' مگر ہزار حصوں میں۔''

''پھر فارس کو ہزار حصوں میں کیوں نہیں مارا؟'' وہ مزہ لیتے ہوئے مخاطب تھا۔ ''چار سال چپ کیوں رہیں؟''

''اچھا انسان برا کرے تو خاموشی بہتر ہے' لیکن آپ جیسا' برا انسان اگر برا کرے تو خاموش نہیں رہنا چاہیے مجھے۔''

وہ جواب میں پھر سے ہنس دیا۔ زمر اور حنین ہنوز ساتھ ساتھ گیلری میں چل رہی تھیں۔ حنہ کے کان ادھر ہی لگے تھے۔

''اور اس برے انسان کو شادی پہ نہیں بلایا آپ نے؟''

''یہ سوال آپ اپنے کزن سے کریں۔ یہ فیصلے ان کے ہیں۔''

''زمر...'' اب کے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ غلطی کر رہی ہیں۔ اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے آپ کو۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ہاشم!''

''آپ نے اس کو ذاتی نہیں رہنے دیا جب اسے میری ممی سے ڈسکس کیا۔''

زمر نے تکان سے گہری سانس بھری۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ فارس آپ کے قابل نہیں ہے۔ اس کا جرم بھول بھی جائیں تو اس کی اکھڑ طبیعت' غصہ' لاپروائی' وہ آپ کی ٹائپ کا آدمی نہیں ہے۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے گویا زمر کو پکارا۔ ''کیا سوچ رہی ہیں؟''

''اوہ! آپ بالکل بھی نہیں جاننا چاہیں گے جو میں سوچ رہی ہوں۔''

اس کے انداز پہ حنہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ایک شاپ کے باہر کھڑی ہو گئی تھیں' اور زمر ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ پکڑے' دوسرے سے موبائل کو کان سے لگائے بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

''مثلاً'' ''کیا؟''

''میں یہ سوچ رہی ہوں ہاشم! کہ مسئلہ میں نہیں ہوں' مسئلہ فارس ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کو فارس کی ہر بوی چبھتی ہے۔ وہ جب بھی شادی کرے گا' آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ بطور ایک فرسٹ کزن' آپ کا اس سے ان کہا' لاشعوری سا مقابلہ ہے۔ موازنہ ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ زرتاشہ کی شادی کے روز بھی جب آپ اسٹیج پہ آئے تھے اور میں وہاں تھی اور فارس وہاں نہیں تھا' تب آپ نے زرتاشہ سے بھی اس کے غصے اور اکھڑپن کا تذکرہ کیا تھا جس کی وجہ سے دلہن کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی ہوں ہاشم! کہ آپ یہ جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ لاشعوری طور پہ تب کرتے ہیں جب آپ کو اپنی شادی کی ناکامی یاد آتی ہے۔''

اور دوسری جانب ہاشم خاموش ہو گیا تھا۔

''ویل... آپ نے کافی سخت باتیں کہہ دیں۔'' جب وہ بولا تو آواز مدھم مگر بجھی ہوئی تھی۔

''میں معذرت نہیں کروں گی' اگر آپ میری ذاتیات میں دخل دیں گے تو پھر اپنی ذاتیات کے بارے میں بھی آپ کو سننا پڑے گا۔'' نرمی سے کہہ کر اس نے ابرو اٹھا کر حنین کو دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر اونچا سا بولی۔

''پھپھو! امی بلا رہی ہیں۔'' کہہ کر خوب شرمندہ

ہوئی۔

"آپ نے سن لیا؟ مجھے جانا ہے۔" اور موبائل بند کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"بھابھی کدھر رہ گئیں؟" عام سا انداز جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

حنین بالکل چپ رہ گئی۔ اور وہ تب تک نہیں بولی جب تک وہ چاروں شاپنگ سمیت اور فوڈ کورٹ میں ایک ٹیبل پہ بیٹھ نہیں گئے۔ زمر ندرت سے ان کے ریسٹورنٹ کے حوالے سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ریسٹورنٹ ان دنوں بنا تھا جب زمران سے قطع تعلق کیے ہوئے تھی' مگر خون کے رشتے "صلح" کے بعد پرانی باتوں کا ذکر نہیں چھیڑا کرتے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہی چیز خون کو پانی سے گاڑھا بناتی ہے۔

ندرت اور سیم اٹھ گئے تاکہ سیم کے جوتے لے لیں تو حنین جوس میں اسٹرا گھماتی' نگاہیں جھکائے سرسری سا بولی۔ "ہاشم بھائی نے برا تو مانا ہو گا اتنی سخت باتوں کا۔"

"ہاشم کے برا ماننے سے کسے فرق پڑتا ہے؟" زمر نے مسکرا کر شانے اچکائے۔ پھر گردن ترچھی کر کے اسے غور سے دیکھا۔ "کسی بات پہ پریشان ہو حنہ؟"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "نہیں... مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔" چہرہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ڈیڑھ سال قبل کی چیٹنگ سے اب کی چیٹنگ تک' زمر کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

"آر یو شیور؟ اگر کوئی مسئلہ ہو تو ضرور شیئر کرنا۔" اس نے نرمی سے حنہ کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

"آپ کو ایسا کیوں لگا؟"

"کیونکہ اب تم بہت خاموش رہتی ہو۔ پہلے تم بہت بولا کرتی تھیں۔"

حنین کے ابرو بھنچ گئے۔ ایک سخت نظر اپنے ہاتھ پہ دھرے زمر کے ہاتھ پہ ڈالی اور دوسری زمر کی آنکھوں پہ۔

"میں اور آپ پھپھو! کبھی بھی ایک دوسرے سے بہت نہیں بولا کرتے تھے۔"

اپنا ہاتھ نکالا اور کرسی دھکیلتی اٹھ کر باہر کی طرف چلی گئی۔ زمر گہری سانس لے کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اور خون کی سب سے بڑی خوبی اور خامی یہی ہے کہ اگر اسے باہر کی ہوا لگ جائے تو وہ جم جاتا ہے۔ عرب کے اہل زبان اس جمنے کو عقد کہتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ جمے خون کو کوئی پگھلائے کیسے؟"



دنیا کی وسعتوں میں اسے ڈھونڈتا رہا
لیکن خدا میری ذات کے اندر ملا مجھے!

چھوٹے باغیچے والے گھر کے باہر ابھی رات کا تیسرا پہر تھا۔ گہرے جامنی آسمان پہ ستارے چمک رہے تھے۔ راہداری کے پہلے دروازے سے اندر جھانکو تو بستر پہ چادر تانے سعدی سو رہا تھا۔ پھر نہ کوئی آہٹ ہوئی' نہ آواز آئی' اور وہ آہستہ سے بازو ہٹا کر اٹھا۔ نیند سے بھری آنکھوں کو مٹھی سے مسلا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر روشن کیا۔ فجر میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔

وہ لبوں میں کوئی دعا پڑھتا بستر سے اترا اور باتھ روم کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جب باہر نکلا تو کرتے شلوار میں ملبوس تھا' ہاتھ منہ اور پیر گیلے تھے' جب وہ راہداری میں دبے قدموں چلتا بیرونی دروازے تک آیا تو ندرت نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ خوابیدہ آنکھیں حیرت سے سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"سعدی؟ ابھی تو اذان بھی نہیں ہوئی۔ تم جلدی کیوں اٹھ گئے؟ کیا الارم جلدی بج گیا؟"

"میں تو الارم نہیں لگاتا امی! آپ کو نہیں پتا؟" اسے جیسے معصوم سا تعجب ہوا۔

"تو پھر کیسے اٹھے ہو؟"

"میں بس اللہ تعالیٰ سے رات میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے صبح اس وقت جگا دیجیے گا' تو اللہ مجھے جگا دیتے ہیں۔" اور سادگی سے مسکرایا۔ "امام صاحب کی

طبیعت رات پھر خراب تھی' میں نے کہا کہ صبح میں امامت کراؤں۔ اس لیے جلدی جا رہا ہوں۔"

"اچھا خیر سے جاؤ۔" انہوں نے شاید کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر حنین اور سیم کے کمرے تک گئیں۔ بلند آواز میں ڈانٹنا شروع کیا۔ "کوئی شرم حیا ہے تم دونوں میں؟ اٹھو' قرآن پڑھو' نماز پڑھو۔" سعدی باہر نکل آیا تو آوازیں دم توڑ گئیں۔

کالونی کی سڑک ویران' اندھیری پڑی تھی۔ سعدی نے تازہ ہوا کو محسوس کرتے سر اٹھا کر دیکھا۔ زمین والوں کو آسمان پہ تارے جگمگاتے دکھائی دے رہے تھے' اور آسمان والوں کو زمین پہ قرآن پڑھنے والوں کے گھر چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اندھیرے کی وہ گھڑی تھی' جس میں سب سے زیادہ نور پھیلا تھا۔

اس نے ہینڈز فری کانوں میں لگایا' قرآن پین نکالا (ایک سفید پین کی صورت کا آلہ' جس کی نوک قرآن کے جس حرف پہ رکھو' وہیں سے تلاوت کی ریکارڈنگ چلنے لگتی ہے) اور سورتوں کا کارڈ نکال کر تمام سورتوں کے ناموں پہ سوچتی نظر ڈالی۔ اپنے روز کے فجر کے قرآن میں سورۃ غافر پہ تھا۔ اب اصولاً" اس سے اگلی سورۃ پڑھنی تھی' مگر وہ سوچتا رہا۔ پھر عادتاً" اپنی پسندیدہ سورۃ نمل پہ قلم کی نوک رکھ دی۔

سر اٹھا کر' ابرو اکٹھے کیے' بے بسی سے آسمان کو دیکھا۔

"او کے اللہ تعالیٰ' آئی ایم سوری' مجھے قرآن ترتیب سے پڑھنا چاہیے' مگر میں کیا کروں' مجھے یہ سورۃ بہت پسند ہے۔" پھر مسکرا کر کانوں میں ہینڈز فری پکا کرتے قدم قدم سڑک کنارے چلنے لگا۔

"اللہ تعالیٰ مجھے آج بھی یاد ہے' جب میں ابو کے ساتھ مسجد آتا تھا تو وہ مجھے چیونٹیوں کی قطار دکھایا کرتے تھے۔ تب میں سوچتا تھا' انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے کیوں ملایا جائے؟ مگر بہت سالوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ نمل کیڑوں مکوڑوں کی سورۃ نہیں ہے یہ "فیملی" ہے۔ خاندان کو کیسے جوڑ کر رکھنا ہے' مجھے آپ نے یہ اس سورۃ سے سکھایا ہے۔"

جائے اندھیرے میں وہ سر جھکائے' مسکرا کر سرگوشی میں بولتا جا رہا تھا۔

اوپر کالونی میں کسی گھر کی چھت پہ کوئی نو عمر لڑکی فون کان سے لگائے' آنسو بار بار پونچھتی' کسی نائٹ پیکیج کے طفیل اپنے بوائے فرینڈ سے سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔ سامنے والے ایک اور گھر میں ایک لڑکا بستر میں لیٹا' موبائل دونوں ہاتھوں میں پکڑے' ٹک ٹک میسج کر رہا تھا اور چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو مرض عشق میں مبتلا لوگوں کے چہروں پہ اس وقت ہوا کرتی ہے۔ یہ رات کا وہ پہر تھا جب صرف محبوب کے لیے جاگا جاتا ہے۔

"اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان' بار بار رحم کرنے والا ہے۔"

سڑک کنارے چلتے گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کے کانوں میں لگے ہینڈز فری میں آواز گونجنے لگی۔

"طس۔ یہ آیات ہیں قرآن کی اور اس کتاب کی جو روشن ہے۔"

ہاتھ میں پکڑے پین پہ اس نے وقفہ کا بٹن دبایا۔

"اوہ اللہ۔" بے بسی بھری مسکراہٹ سے آسمان کو دیکھا' اور پھر نفی میں سر ہلاتے گردن جھکائے چلتا گیا۔ "مطلب کہ میں کبھی کبھی حیران ہو جاتا ہوں' یہ "کتاب مبین" والی بات آپ نے کتنی دفعہ بتا دی قرآن میں' پھر ہر چند سورتوں کے بعد یہی آیت کیوں لے آتے ہیں آپ اللہ؟ مجھے سوچنے دیں۔"

لب کاٹتے آنکھیں ذرا میچ کر وہ واقعی سوچنے لگا۔

"ہوں۔" چند لمحے اور سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔ "ہر دفعہ اس آیت کا مجھے نیا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ دیکھیں اللہ' اتنا مجھے پتا ہے کہ اگر ان الفاظ کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا تو یہ قرآن میں بار بار نہ دہرائے جاتے۔ کتاب مبین۔ کتاب روشن یعنی۔" وہ سڑک کنارے قدم اٹھاتا' سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

"یعنی آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں کہ آگے جو آیات آپ مجھے دیں گے' وہ اس کتاب کی ہیں' جس کے علاوہ مجھے دنیا میں کسی چیز سے کوئی روشنی نہیں

ملے گی۔ کہیں سکون نہیں ملے گا۔ کہیں خوشی نہیں ملے گی۔ مجھے اس کتاب کے علاوہ کوئی نہیں بتائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کوئی نہیں جو انگلی پکڑ کر صحیح فیصلے کرنا سکھائے۔ میرے دل کی بات سمجھ کر اللہ کی بات اور کوئی نہیں سمجھائے گا۔"

مسکرا کر' خوش دلی سے بولتے اس کے تاثرات بدلتے گئے۔ آنکھوں میں اداسی در آئی۔ دل بھر سا آیا۔ اپنی زندگی کی پیچیدگیاں' دکھ' خطرات' سب یاد آنے لگے۔ کیا کھویا اور کیا پایا۔ جامنی صبح میں اداسیاں گھلتی گئیں۔

"یہ ہدایت ہے اور خوشخبری ہے' ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔"

کانوں میں گھلتی وہ مدھر آواز کہہ رہی تھی۔ وہ سامنے ویران' اندھیر سڑک کو اداسی سے دیکھے گیا۔

"اللہ! آپ کو کیسے علم ہوتا ہے کہ اس آیات کے بعد میں افسردہ ہو جاؤں گا؟ کیسے آپ فوراً" اگلی آیت میں مرہم لے آتے ہیں؟ کیا آپ کو ہر انسان کا اتنا خیال ہوتا ہے یا میں اسپیشل ہوں؟"

افسردگی کو زبردستی دباتے وہ شرارت سے خود ہی ہنس دیا۔

"خوش خبری۔" اور گہری سانس لی۔ "تو یہ کتاب پڑھنا اس لیے ضروری ہے' کیونکہ یہ ہمیں فیصلہ کرنا سکھاتی ہے' ایسا ہی ہے نا اللہ؟ آپ نے ان آیات کے ذریعے مجھے سکھایا کہ برے دنوں میں انسان کیسے وہ "آنکھ" رکھے جو اسے وہ دکھائے جو ابھی پاس نہیں ہے' مگر کبھی تو ملے گا۔ کبھی تو ہم بھی وہ دن دیکھیں گے نا اللہ جس کا وعدہ ہے۔ مگر اللہ۔ کیا یہ خوش خبری میرے لیے بھی ہے؟ آپ نے کہا' یہ ایمان والوں کے لیے ہے۔ مگر۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں مومن ہوں یا نہیں؟ اگر خود کو مومن سمجھوں تو خود پسندی ہے "عجب" ہے خود کو منافق سمجھوں تو یہ مایوسی ہے۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میں مومن ہوں؟"

اداسی بڑھنے لگی۔ اردگرد بھیگتی جامنی رات میں تنہائی بھرا ملال سا چھا رہا تھا۔ دل کی ساری ویرانیاں اس اندھیرے میں رچ بسنے لگیں۔

"ہدایت اور خوش خبری ہے مومنوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔" وہ ایک دم بالکل رک کر سننے لگا۔ "جو اپنی نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔"

اور دل پر سے کوئی سل سی ہٹنے لگی۔

"او اللہ۔ یعنی کہ اگر مجھے قرآن کی خوش خبریوں کی امید رکھنی ہے تو میں کبھی نماز نہیں چھوڑ سکتا۔ جس وقت کی چھوڑوں گا' اس وقت آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔ آپ چاہتے ہیں ہم سب نماز پڑھیں' مگر نہیں' نماز صرف "پڑھنے" سے افاقہ نہیں ہوتا۔ نماز قائم رکھنا اصل چیز ہے۔ ہر نماز اپنے وقت پر اور تمام ارکان کے ساتھ پڑھنا۔ میں نماز نہیں چھوڑتا' مگر جس دن یہ سوچوں کہ نہیں چھوڑتا' اس دن ہی کوئی نہ کوئی قضا ہو جاتی ہے۔ میرے بہن بھائی نماز نہیں پڑھتے۔ مجھے صرف یہی بات تکلیف دیتی ہے کہ اگر قیامت کے دن آپ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم اکیلے مسجد کیوں آتے ہو؟ تمہارے بہن بھائی کیوں نہیں؟ وہ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں' تو میں کیا جواب دوں گا؟"

وزن بڑھتا جا رہا تھا۔ دکھ' بے بسی' فکر مندی نے اس دم توڑتی رات کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

کانوں میں تلاوت وہیں سے جاری تھی۔

"اور وہ جو اپنی زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو آخرت پہ یقین رکھتے ہیں۔"

"تھینک یو اللہ!" اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور خود سے بولا۔ "میں یہ تینوں کام کرتا ہوں' مگر مجھے پھر بھی اپنے اچھے ہونے کا کوئی یقین نہیں۔ شاید یہی بہتر ہوتا ہے' جب تک ہمارے گناہوں کا گلٹ ہمارے ساتھ ہے' ہم کم از کم توبہ تو کرتے رہتے ہیں' اپنی عبادتوں پہ غرور تو نہیں آتا۔ پھر بھی' مجھ سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ آس پاس کے لوگ میری نمازیں دیکھ کر' میرے منہ سے قرآن کی باتیں سن کر مجھے اتنا نیک کیوں سمجھتے ہیں؟" وہ اداسی سے بتا رہا تھا۔

"اللہ جب لوگ مجھے نیک کہتے ہیں تو مجھے بہت گلٹ ہوتا ہے۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ہر نیک

سے نیک آدمی بھی دن میں دس ہزار دفعہ خود کو گناہ کرنے سے روکتا ہے' اور کئی دفعہ نہیں بھی روک پاتا۔ کتنا مزا آتا' ایمان ایک ہی دفعہ خرید لو' اور پھر ساری عمر کی گارنٹی۔ یہ روز روز اپنے آپ سے جنگ' گلٹ' توبہ کا سائیکل تو نہ ہوتا۔ آپ نے زندگی اتنی پیچیدہ کیوں بنائی؟"

نگاہیں اٹھا کر شکوہ کیا۔ دور صبح کی چڑیاں بولنے لگیں۔ ان کی اپنی تسبیح تھی۔ ہر ایک کی تسبیح مختلف ہوتی ہے۔

"ہاں مگر اللہ مجھے اتنا یقین ہے کہ ایک دن زندگی اپنی ساری ناتمام خواہشات اور تکالیف کے ساتھ ختم ہوجائے گی' سب دکھ مرجائیں گے اور وہ بڑا دن آئے گا۔ جب ہم اور آپ مقابل کھڑے ہوں گے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ نماز کے بغیر' اور اپنا مال اور ٹیلنٹ لوگوں پہ خرچ کیے بغیر میں یہ کہوں کہ مجھے آخرت پہ یقین ہے تو جھوٹ ہوگا۔ علم الیقین تو سب کو ہوتا ہے۔ مگر مجھے یہ کام کرتے رہنا ہوں گے۔ آپ کو یقین دلانے کے لیے۔ خود کو یقین دلانے کے لیے۔"

وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا بولتا چلا جارہا تھا۔ کوئی ساتھ سے گزرتے اسے دیکھتا تو سمجھتا وہ ہینڈز فری لگائے' فون پہ بات کررہا ہے۔ مگر ہر بات لوگوں کے سمجھنے کی ہوتی بھی نہیں ہے۔

تلاوت کی بارعب' مگر خوب صورت آواز سماعتوں میں ہنوز بکھر رہی تھی۔

"البتہ وہ لوگ جو آخرت پہ ایمان نہیں لاتے' ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے خوب صورت بنا کر پیش کردیے ہیں اور وہ ان ہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بے شک ان کے لیے برا عذاب ہے' اور وہ آخرت میں شدید نقصان میں رہیں گے۔"

دم توڑتی رات کا وقت تھا' ماحول کی ہیبت تھی' یا تلاوت کی آواز کا سحر' اسے لگا اس کی جلد کے رونگٹے کھڑے ہورہے ہیں۔ کوئی عجیب سا رعب تھا جو ہر جگہ چھانے لگا۔ یہ وہ لمحے تھے جب وہ سب کچھ بھول گیا۔ زمر' فارس' ہاشم۔ اپنی زندگی کی پیچیدگیاں۔ کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ صرف اپنا اعمال نامہ نظر آتا تھا۔

"تو اللہ۔ ایسے آپ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتے ہیں؟"

بٹن سے پین آف کرتے ہوئے وہ گویا جھرجھری لے کر کہہ رہا تھا۔

"جب میں نماز نہ پڑھوں' یا قرآن نہ پڑھوں' یا لوگوں پہ اپنے حصے سے خرچ نہ کروں' تو میرا آخرت پہ ایمان کمزور ہوجائے گا؟ اور۔ اور میں ان لوگوں میں شامل ہوجاؤں گا جو بہت عمل کرنے والے ہوں گے مگر صرف تھکنے والے ہوں گے؟"

تعجب سے اس نے پوچھا جواب اسے خود بھی معلوم تھا۔

"جو چیز مجھے نماز اور قرآن سے دور کرے گی' اللہ کے راستے کے علاوہ جس بے مقصد چیز میں اپنا مال یا اپنا ٹیلنٹ لگاؤں گا' آپ مجھے وہ بے مقصد چیزیں دلچسپ اور خوب صورت بنا کر دکھاتے جائیں گے اور پھر میں ان ہی میں بھٹکتا رہوں گا؟ کیا صرف ایک نماز کا چھوڑ دینا اتنا مہنگا پڑے گا؟ نماز جاتی جائے گی' بے مقصد چیزیں آتی جائیں گی؟ ایسے چلا جاتا ہے ایمان؟ صرف ایک نماز کے جانے سے؟ ایک جھوٹ بولنے سے؟ ایک دل دکھانے سے؟" ایک کنارے پہ وہ ٹھہر گیا۔ تعجب سا تعجب تھا۔ حیرت سی حیرت تھی۔ سر اٹھا کر اس نے گہرے' پراسرار آسمان کو دیکھا۔ دل بھر سا آیا۔ ہینڈز فری اتار دیے۔

"اللہ تعالیٰ آئی ایم سوری' ہر اس چیز کے لیے جسے میں نے نماز سے اوپر رکھا۔ میں بار بار معافی مانگوں گا۔ آپ بس معاف کرنا مت چھوڑ دیجیے گا۔"

اسی طرح خود سے بڑبڑاتا وہ قدم بڑھاتا رہا' یہاں تک کہ مسجد کے دروازے تک آن پہنچا۔ گل خان خلاف معمول دروازے پہ ہی مل گیا۔ سعدی اپنے فجر کے قرآن میں الجھا تھا' اسے نہیں دیکھا۔ لبوں میں مدھم سا ابھی تک کچھ بول رہا تھا۔ جوتے اتارے تو ساتھ کھڑے گل خان نے حیرت سے اس کا بازو ہلایا۔

"کس سے بول رہے ہو سعدی بھائی؟"

وہ جو اپنی "دعا" ختم کر کے درود پڑھ رہا تھا، جھک کر جوتے اتارے، پھر اس چھوٹے پٹھان لڑکے کی جانب متوجہ ہوا۔

"میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہا تھا۔" اور ننگے پاؤں اندر صحن میں قدم رکھا۔ دم توڑتی رات کی اس گھڑی صحن کی اینٹیں ٹھنڈی تھیں۔

"توبہ۔ توبہ۔" گل خان دو انگلیوں سے باری باری دونوں کان چھوتا پیچھے آیا۔

"اللہ سے ایسے بات نہیں کیا جاتا۔ ادر (ادھر) مصلے پہ بیٹھ کر ادب سے بات کرتا ہے۔"

"میں ادب سے ہی بات کرتا ہوں جیسے اپنے بڑوں سے کرتا ہوں۔" وہ نرمی سے کہتا اندر چلا آیا۔ گل خان کو خوب غصہ آیا۔

"سادی بھائی۔ ابھی مولوی صاحب دیکھ لیتا تم کو ایسے بات کرتے تو تمہارے پہ فتویٰ لگ جاتا۔"

"اچھا تم بتاؤ مجھے کہ دعا کیسے مانگتے ہیں؟" وہ پُرسکون سا مسکراتا ہوا جماعت والے مرکزی کمرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔

"ادب سے، تمیز سے، اور ادر مصلے پہ بیٹھ کر دعا مانگا جاتا ہے۔ سر جھکا کر، رو رو کر۔ ہاں!" ہاتھ ہلا ہلا کر خفگی سے اشارہ کر رہا تھا۔ سعدی نے مسکرا کر اس چھوٹے پٹھان لڑکے کو دیکھا جو سفید پشاوری ٹوپی پہنے، پائینچے اوپر چڑھائے کھڑا تھا۔

"اللہ ہماری وہی دعا قبول کرتے ہیں گل خان! جو ہم نے دل سے مانگی ہوتی ہو، اور دل سے نکلی باتیں نیچرل ہونی چاہئیں۔ مصنوعی لفاظی، اور ٹی وی پہ بیٹھے علماء والی مشکل گاڑھی اردو۔ نہیں یار۔" اس نے بے چارگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "میں عام زندگی میں جو سادہ زبان بولتا ہوں، مجھے اسی نیچرل انداز میں اللہ سے بات کرنی چاہیے۔"

"توبہ۔ تم چلتے پھرتے کون سا بات کر رہا تھا؟" اس کے اندر کے مفتی کو ہضم نہیں ہوا، گھور کر مشکوک انداز میں پوچھا۔

"میں فجر کا قرآن سن رہا تھا، ہر آیت کے بارے میں اپنے خیالات اللہ کو بتا رہا تھا اور اس کے بعد میں ان کو وہ بتا رہا تھا جو میں نے کل کیا اور جو آج کروں گا۔" جالی دار ٹوپی سر پہ لیے اس نے رسان سے جواب دیا۔

برآمدے میں لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ کوئی اسے سلام کرنے رکا تو وہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ فارغ ہو کر واپس گھوما تو گل خان سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے بھائی! تم ایسے خود سے بول رہا ہوتا ہے۔ تم کو ایسے اللہ تعالیٰ سے بات کرنا کس نے سکھایا؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا، مگر وہ اداس مسکراہٹ تھی۔

"میری پھپھو نے۔ وہ بھی ایک زمانے میں ایسے ہی دعا مانگی کرتی تھیں۔" مسکراہٹ آہستہ آہستہ لبوں سے غائب ہوئی۔ "اب نہیں مانگتیں۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ دل سخت ہو جاتے ہیں۔" پھر سر جھٹکا۔ بہت سے خیال بھی جھٹکے۔

"تم بتاؤ، آج تمہارے تایا نے کس جگہ تھپڑ مار کر تمہیں نماز کے لیے اٹھایا ہے؟" اب کے اس نے آنکھیں سکیڑ کر گل خان کے چہرے کو ادھر ادھر سے جانچا۔

"ہا!" گل خان نے غصے سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہم ایسا کوئی نشئی ہے جو خود نہیں اٹھ سکتا، ہاں؟" کمر پہ ہاتھ رکھے، ناراضی سے اسے گھورا۔

سعدی نے "اچھا" والے انداز میں ابرو اٹھایا۔ گل خان اسی طرح گھورتا رہا، پھر قدرے جز بز سا گدی پہ ہاتھ رکھ کر قریب کھسکا۔

"کیا گردن ابھی تک سرخ ہے؟" رازداری سے پوچھا۔ سعدی بے اختیار ہنس دیا، اس کے سر پہ چپت رسید کی اور امامت کی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ گنتی کے لوگوں کی صفیں ترتیب دی جا رہی تھیں۔ نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

بس گنتی کے لوگ! السابقون السابقون!



موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو

پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

اور پھر فجر کی وہ گھڑیاں انسان کو کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لیے کھو چکی تھیں۔ روز فجر طلوع ہوگی مگر اس دن کی پھر نہیں آئے گی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا' جب وہ سارہ کے گھر کا گیٹ عبور کرتے اندر آیا۔ آفس کے لباس میں تیار' سیاہ سنہری کی چین انگلیوں میں گھماتے اس نے داخلی دروازہ بجایا تو فوراً" کھل گیا۔ سامنے نور اسکول یونیفارم میں تیار کھڑی تھی۔ وہ اس کو پیار کرتا' اندر آیا تو لاؤنج میں ذکیہ بیگم امل کے بال بنا رہی تھیں۔ ایک آنکھ اس کے بالوں پہ اور دوسری ٹی وی پہ شور کرتی کسی عورت پہ تھی۔ اس کے سلام کرنے پہ چونکیں' پھر مسکرا کر خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی ملازمہ کو آواز دی کہ ناشتہ لائے۔

"تھینک یو نانی اماں! میں ناشتا کر کے آرہا ہوں۔" اپنی امی کی خالہ سے شائستگی سے معذرت کرتے وہ صوفے پہ بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھی' اور ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔

"ارے سعدی۔ تم؟" سارہ اندر سے پرس اور بیگ اٹھائے عجلت میں چلی آرہی تھی' اسے دیکھ کر رکی' حیرت سے سوال کیا' ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں پکڑے کاغذ بیگ میں رکھے۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"آفس کے راستے میں سوچا' آپ سے ادھر مل لوں۔ پھر وہاں تو وقت ہی نہیں ملتا' یاں!"

"کیا ہوا؟ خیریت؟" وہ سامنے آئی۔ بالوں کا فرنچ جوڑا بنائے' لمبی قمیص دوپٹے اور کانوں میں ٹاپس پہنے' سعدی کی پراجیکٹ ڈائریکٹر آفس کے لیے تیار لگ رہی تھی۔

"کل کے پروگرام کا پوچھنا تھا۔ آپ آئیں گی نا؟ زمر اور فارس کا نکاح ہے کل۔"

بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اس نے احتیاط سے لفظ چنے۔ سارہ کے بیگ میں کاغذ گھسیڑتے ہاتھ ذرا کی ذرا ڈھیلے پڑے' گردن موڑی۔ ادھر ادھر بھاگتی بچیوں کو دیکھا۔

"اپنے بیگز لو' اور گاڑی میں بیٹھو فٹافٹ۔ میں آرہی ہوں۔" پھر چہرہ اس کی طرف پھیرا' ذرا پھیکا سا مسکرائی۔

"ہاں' ندرت آپا نے فون کیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی سن کر۔ ہاں تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ فارس کو رہا ہوئے ابھی تین ہفتے تو ہوئے ہیں۔ مگر۔ ضرور یہی اچھا ہو گا۔" سرہلا کر کہتے اس نے موبائل بیگ کے زپ والے خانے میں رکھا۔

"آپ۔ آئیں گی نا؟"

"اصل میں میری پلاننگ کمیشن کے کچھ عہدیداروں کے ساتھ کل میٹنگ ہے۔"

"کل اتوار ہے خالہ!"

"تو لنچ پہ ہے نا میٹنگ۔" (ذکیہ بیگم نے نفی میں تکان سے سر جھٹکا)

"آپ کو پتا ہے میں پندرہ منٹ میں پلاننگ کمیشن والوں سے لنچ کی تاریخ اور وقت معلوم کرلوں گا۔"

"اوکے سعدی!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "میں نہیں آسکوں گی۔"

"ہم لوگ آپ کی فیملی ہیں' آپ کو آنا چاہیے۔ میں جتنا سب کو جوڑ کر رکھنا چاہتا ہوں' اتنے ہی سب ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔" اس نے شاکی نظروں سے سارہ کو دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے میں گیدرنگز میں نہیں جاتی۔"

"مجھے یہ پتا ہے کہ آپ فارس ماموں سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو دور رکھنے کی کوشش کررہی ہیں۔" حیرت بھرے دکھ سے وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ قاتل نہیں ہیں' یو نو ویٹ!" (آپ جانتی ہیں یہ)

"مگر فارس وجہ ہے اس سب کی!" وہ قدرے بلند آواز سے بولی۔ آنکھوں میں درد' بے بسی' نمی' سب ایک ساتھ ابھرا۔ "اس کو پھنسانے کے لیے اس کے بھائی اور بیوی کو مارا گیا۔ فارس کا مطلب ہے 'مصیبت' اور میں اپنے بچوں کو ہر قسم کی مصیبت سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جب ایک دفعہ کوئی مرجاتا ہے تو واپس نہیں آتا' بھلے تم اس کے لیے کتنے

انتقام لیتے پھرو۔"

سعدی چند لمحے کے لیے خاموش رہ گیا' مگر پھر مضبوطی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"یو نو واٹ' سب سے زیادہ مصیبت میں کون لوگ پڑتے ہیں؟ جو سب سے زیادہ مصیبتوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سی یو ان آفس۔"

اور اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہ ذکیہ بیگم کو سلام کرتا باہر نکل گیا۔

سارہ نے افسوس سے سر جھٹکا' پھر مڑی تو ذکیہ بیگم خفگی سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"امی! میں کسی لیکچر کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے کہا' ہم نہیں جائیں گے تو نہیں جائیں گے۔" ان سے نگاہ ملائے بغیر وہ بیگ اٹھائے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو سعدی کی کار دور جا رہی تھی۔



قیس تھا لاجواب لیلیٰ بھی
جب سوال ایک کی بقا کا تھا

اتوار کی شام یوسف صاحب کے گھر پہ کوئی ایسی دھن فضاؤں نے بکھیر رکھی تھی جس میں نہ آواز تھی' نہ موسیقی' صرف کیفیت تھی۔ خوشی کی کیفیت۔ لاؤنج میں رونق سی لگی تھی گو کہ مہمان کوئی نہیں تھا' سب اپنے ہی لوگ تھے۔ ادھر سامنے صوفے پہ ندرت اور فارس کے کزن' جمال بھائی تھے۔ ان کی بیگم تھیں۔ سارہ کی والدہ ذکیہ خالہ تھیں۔ ان کے ہمراہ شفون کا جوڑا پہنے' عرصے بعد تیار سی ہوئی ندرت بیٹھی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے محو گفتگو تھیں۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر مقابل صوفوں کی سمت بھی دیکھ لیتیں' جہاں فارس بیٹھا تھا۔ اس نے آف وائٹ کرتا پہن رکھا تھا' تین ہفتے قبل جیل سے رہا ہوتے وقت کے بے حد چھوٹے بال' اب قدرے بڑھ کر اچھے لگ رہے تھے۔ البتہ خاموش تھا' سنجیدہ اور خاموش۔ بس گردن بڑے ابا کی طرف موڑے دھیان سے ان کی کوئی بات سن رہا تھا۔

بڑے ابا خوش تھے' دھیما مسکرا بھی رہے تھے۔ انہوں نے بھی آف وائٹ نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ تازہ دم اور صحت مند دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی فارس سے کوئی بات کہتے تو کبھی قریب بیٹھے نکاح خواں قاری صاحب سے۔ ایسے میں سیم ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے سب سے زیادہ اداس بیٹھا تھا۔ اگر ندرت اس کو غلطی سے دیکھ لیتیں تو بنا آواز کے ہونٹ ہلا کر پوچھنے لگ جاتا۔

"کھانا کب لگے گا؟" اور دو تین دفعہ تو ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

راہداری سے آگے بڑھتے جاؤ تو زمر کے کمرے کا دروازہ آجاتا۔ وہ بند تھا۔ اس کے پار اندر بھی گویا مصروف سا انداز لگتا تھا۔ حنین اپنے گلابی لمبے گاؤن میں ملبوس' کھلے بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے' سر جھکائے' ڈریسنگ ٹیبل پہ کھلا میک اپ کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ ساتھ ہی امی کی کزن فرزانہ کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔ فرزانہ کے شوہر امجد بھائی جو زمر کے بھی کزن ہوتے تھے' سعدی کے ہمراہ سامنے کاؤچ پہ بیٹھے تھے۔

سعدی جو بھورے کرتے میں ملبوس تھا' قلم کھولتے ہوئے نکاح کے کاغذات لیے کاؤچ سے اٹھا اور جھک کر انہیں زمر کے گھٹنوں پہ رکھا' جو ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پہ بیٹھی' ان کی طرف رخ کیے ہوئے تھی۔ اس نے ہلکے کام کی سفید لمبی میکسی پہن رکھی تھی۔ نیچے سلک کا پاجامہ ٹخنوں کو ڈھکے نظر آتا تھا۔ کامدار دوپٹے کے کناروں کی سبز پائپنگ اور کہیں کہیں سبز اسٹونز کے سوا' پورا لباس سفید تھا۔ بال سیدھے کر کے اونچا جوڑا بنا تھا' جس پہ دوپٹہ ٹکا تھا' میک اپ ہلکا تھا' کانوں میں اور گردن میں ننھے ہیرے تھے۔ وہ خوب صورت لگ رہی تھی اور پرسکون بھی۔ سکون سے چہرہ جھکائے نکاح کے کاغذات کے صفحے پلٹے' پھر کاجل سے گہری کی ہوئی بھوری آنکھیں اٹھا کر سعدی کو دیکھا اور سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"یہ کیا ہے؟" امجد بھائی کی موجودگی کے باعث

مسکرا کر پوچھا۔ وہ بھی شرارت سے مسکراہٹ دبائے اتنی ہی معصومیت سے بولا۔

"اسے نکاح نامہ کہتے ہیں۔"

"جی مگر سعدی ... یہ ٹیکشن کاٹنے سے میں نے غالباً" منع کیا تھا۔" مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اشارہ حق طلاق کی جانب تھا۔

"یہ آپ کے والد کی خواہش تھی' جو مجھ جیسے تابع دار پوتے نے پوری کی۔ آپ کو کوئی اعتراض ؟؟"

زمر نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ "میرے والد سے کہیے' جس طرح میں نے کہا تھا' ویسا ہی نکاح نامہ تیار کر کے مجھے بھجوائیں' میں دستخط کروں گی۔" کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔

سعدی نے مسکرا کر کاغذ کے بجائے اس کا ہاتھ تھاما' اسے آہستہ سے اسٹول سے اٹھایا' اور دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھولا اور سامنے لاؤنج کا منظر دکھایا۔ یہاں سے بڑے ابا اور فارس نظر آرہے تھے' کیونکہ وہ مرکزی جگہ پہ بیٹھے تھے۔

"آپ یہ بات اپنے والد سے خود جا کر کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کتنے خوش ہوں گے وہ سن کر' ہے نا؟؟"

اسی معصومیت سے سعدی نے زمر کو دیکھا۔ زمر نے اس طرف چہرہ کیا۔ ابا مسکراتے ہوئے فارس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ خوش' پُرامید' پہلے سے جوان۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تماشا نہیں کر سکتی تھی۔ زمر نے گھور کر سعدی کو دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے' کسی کی مرضی کے خلاف ڈاکومنٹ پہ دستخط کروانا کتنا بڑا جرم ہے؟؟"

"جی۔ تو آپ مجھے اس جرم میں گرفتار کیوں نہیں کروا دیتیں؟" وہ پھر سے مسکرایا۔ زمر لب بھینچے وہیں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ تب ہی بڑے ابا کی بات سنتے فارس نے انہیں دیکھنے کے لیے سر اٹھایا' تو... نگاہ پھسلی۔ راہداری کے سرے کمرے کے کھلے دروازے پہ وہ سعدی کے ساتھ کھڑی تھی۔ نیم رخ نظر آتا تھا۔ دوپٹہ سر پہ ٹکا تھا اور نیچے پاؤں تک گرتا

میکسی کا فلیئر۔ وہ سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ فارس نے ایک نظر ادھر دیکھا' پھر فوراً" چہرہ موڑ کر ابا کو دیکھنے لگا۔

"میں ابا سے حساب بعد میں لے لوں گی۔ اور یہ مت سمجھنا کہ ایک ٹیکشن کاٹنے یا نہ کاٹنے سے میرے حقوق پہ کوئی فرق پڑے گا۔"

دروازے میں کھڑے انگلی اٹھا کر دبی آواز میں اسے تنبیہہ کی۔ "وکیلوں کو ایک ہزار ایک طریقے آتے ہیں' اپنی مرضی کے مطابق قانون کو ڈھالنے کے لیے۔"

خفگی سے اسے دیکھ کر مڑی اور رسمی مسکراہٹ کے ساتھ واپس اسٹول پہ آکر بیٹھ گئی۔ کمرے کے باقی لوگ اپنی آوازوں کے باعث ان کی گفتگو سے یکسر انجان رہے۔ وہ بیٹھی تو سعدی نے نکاح نامہ اس کی گھٹنوں پہ رکھا' اس کے قریب جھک کر اس نے دعائیہ کلمات پڑھے۔ قلم اس کے ہاتھ میں دیا۔

"کیا آپ زمر یوسف ولد یوسف خان' فارس غازی ولد ظہیر غازی کو دس لاکھ روپے حق مہر سکہ رائج الوقت اپنے نکاح میں ...." وہ لڑکا سنجیدگی سے عقد نکاح کی سطور پڑھ رہا تھا۔ زمر کا سر جھکا تھا اور قلم انگلیوں کے درمیان تھا۔

"میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا۔ صرف ایک گولی۔ آئی ایم سوری زمر۔"

"قبول ہے۔" اس نے سرہلا کر ہلکے سے کہا۔

"میں بے گناہ تھا میڈم زمر! میں بے گناہ تھا۔"

"قبول ہے۔"

"میں... معافی نہیں مانگوں گا۔"

"قبول ہے۔" آخری دفعہ کہتے اس کی جھکی آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھری۔ مگر اس نے وہ سب اندر اتارلی۔

دھڑا دھڑ مطلوبہ جگہوں پہ دستخط کیے۔ قلم اور کاغذات سعدی کی طرف بڑھائے۔ وہ کوئی دعا پڑھتے اٹھا' زمر کے سر پہ ہاتھ رکھا' جھک کر اس کے بال چومے اور کاغذات لیے' امجد بھائی کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ زمر نے سر اٹھا کر دیکھا تو حنین اسی طرح کھڑی

تھی اور فرزانہ باجی اپنی بیٹی کے ہمراہ اسی طرح بولے جا رہی تھیں مگر وہ جانتی تھی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہے گا۔

"مبارک ہو پھپھو۔" حنہ نے آہستگی سے نگاہ ملائے بغیر کہا تو زمر نے مسکرا کر سر کو خم کیا۔ رخ واپس ڈریسنگ کے آئینے کی جانب موڑا۔ اپنا عکس دیکھا۔ کام دار لباس میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ادھر کھلے دروازے سے باہر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایجاب و قبول کے الفاظ۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے جبرا" مسکراتے وہ آوازیں سنیں۔ فرزانہ باجی اور ان کی بیٹی باہر نکل گئیں۔

حنین وہیں کھڑی رہ گئی۔ باہر دعا ہو رہی تھی۔

زمر نے جھک کر ڈریسر کی دوسری دراز کھولی۔ دو ڈبیاں نکالیں۔ ایک سیاہ مخملیں ڈبی اور دوسری سرخ۔ پہلی ڈبی کھولی تو وہ اندر سے خالی تھی۔ سوائے ننھے سے کارڈ کے 'جس پہ فارس کے لکھے الفاظ کی سیاہی ابھی تک ویسی ہی تھی۔ حنہ نے ذرا چونک کر اسے دیکھا جو ساتھ ہی دوسری نئی ڈبی بھی کھول رہی تھی۔ اس کے اندر وائٹ گولڈ کی ننھی سی نتھ رکھی تھی۔

"دیکھو حنہ! ابا نے مجھے شادی کا کیا تحفہ دیا۔" زمر دو انگلیوں سے ناک کی لونگ اتارتے ہوئے بولی۔ یہ واپس رکھنی تھی اور نئی پہننی تھی۔ حنین ایک دم بے چینی سے سیدھی ہوئی۔

"آپ...... یہ مت اتاریں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔

لونگ کھولتے اس کے ہاتھ رکے۔ سوالیہ نگاہوں سے حنہ کا چہرہ دیکھا۔ "کیوں؟"

"یہ۔ یہ اچھی لگ رہی ہے۔ بس آپ یہ نتھ مت پہنیں۔"

"کیوں نہ پہنے؟" آواز پہ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ندرت بڑے ابا کی وہیل چیئر لا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے زمر کے قریب آئے 'اس کے سر پہ ہاتھ رکھا' مدھم آواز میں کوئی دعا دی۔ حنین اس دوران بے چینی سے انگلیاں موڑتی رہی۔

"ہاں تو کیوں نہ پہنے میری بیٹی میرا تحفہ؟" انہوں نے مصنوعی خفگی سے حنہ کو دیکھا۔

"کیونکہ۔ یہ نتھ مجھے پسند آگئی ہے۔ پھپھو کے پاس تو اس سے زیادہ قیمتی والی پہلے ہی ہے۔ یہ میں رکھ لوں ابا؟"

لپک کر نتھ کی ڈبی اٹھائی اور معصومیت سے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ بڑے ابا مسکرا دیے۔

"میں نے اپنی بیٹی کے لیے خریدی تھی۔ اب کون سی بیٹی اسے رکھے 'یہ تم دونوں خود طے کر لو۔"

کہتے ساتھ انہوں نے زمر کے چہرے کو بھی دیکھا۔ وہ بھی نرمی سے مسکرا دی۔

"شیور حنہ! یہ تمہاری ہوئی۔" وہ ڈھیلی کردہ لونگ دوبارہ کسنے لگی۔ اور ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

"تمیز ہے تم میں؟ ابا نے زمر کو شادی کا گفٹ دیا ہے' کسی کا گفٹ لینا کہاں سے سیکھا ہے تم نے؟" غصے سے لال پیلی ہوتی ندرت کا بس نہیں چل رہا تھا' دو تھپڑ لگا دیں اسے۔

"تو باقی سب بھی تو ابا نے دیا ہے پھپھو کو۔ اب مجھے اچھی لگ گئی تو کیا کروں؟" وہ نروٹھے پن سے کہتی ڈبی مٹھی میں جکڑے کھڑی رہی۔

"تم گھر تو پہنچو' تمہیں سیدھا کرتی ہوں میں۔" ندرت نے اشارۃ" مدعا سمجھا دیا۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح دوسری جانب دیکھنے لگی۔ زمر بڑے ابا سے بات کر رہی تھی۔ پھر وہ مسکرا کر دوبارہ اسے کوئی دعا دیتے' ندرت کے ہمراہ باہر کی طرف ہو لیے تو زمر اس کی طرف گھومی۔

"تو تم ناک چھدوا رہی ہو؟ اچھی لگے گی تم پہ۔" مسکرا کر کہتے وہ کھڑی ہوئی۔ ابھی بس چند منٹ میں اسے باہر جا کر مہمانوں کے سامنے بیٹھنا تھا۔ فارس کے ساتھ بیٹھنا تھا' وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی' کندھے سے دوپٹے کی پن درست کرنے لگی۔

حنین ڈبی کھول کر نتھ کو یونہی چھیڑنے لگی۔

اور یہ تب ہی تھا جب ان دونوں نے وہ آواز سنی۔

کھلی کھڑکی کے باہر گھر کی چار دیواری تھی' اور درمیان کی چار فٹ کی گلی میں سعدی موبائل پہ عجلت میں بات کرتا چلا آرہا تھا۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"مس حلیمہ! میں سوموار کو' یعنی کہ کل' صبح دس بجے آنا چاہتا ہوں۔ آجاؤں؟" وہ موبائل کان سے لگائے چہرہ جھکائے کہہ رہا تھا۔ حنین اور زمر بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ نکاح کے فوراً "بعد" اتنے مصروف وقت میں بھی وہ کسی کو یوں باہر نکل کر کال کر رہا تھا۔ زمر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتی کھڑکی کے قریب آئی۔

"او کے۔ پھر میں دس بجے پہنچ جاؤں گا۔ آپ...."

کہتے کہتے نگاہ اٹھائی تو کھڑکی کی جالی کے پیچھے دلہن بنی زمر کھڑی تھی۔ وہ "آپ ہاشم کو...." کے بجائے "آپ اور بتا دیجیے گا" کہہ کر جلدی سے کال بند کر کے زمر کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ہوں۔ تو یہ حلیمہ کون ہے؟" اس نے شرارتی مسکراہٹ دبائے پوچھا۔ سعدی نے "اف" کے انداز میں بھنویں بھینچ کر اسے دیکھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک میٹنگ کا ٹائم لے رہا تھا۔"

"اور کس سے میٹنگ؟ حلیمہ کے والدین سے؟"

"اللہ' زمر۔ آپ بھی نا۔" اس نے شرمندہ سا ہوتے ہوئے سر جھٹکایا۔ "مجھے واقعی اس کے باس سے ملنا ہے۔"

"اچھا تو کون ہے حلیمہ کا باس؟" وہ اسی طرح مطمئن پُرسکون سی پوچھ رہی تھی۔ سعدی نے سوچتے ہوئے ٹھوڑی کھجائی۔ کیا جواب دے؟ سات سالوں کی ساری یادیں امڈ کر آنکھوں کے سامنے آئیں اور پھر۔

"وہ.... نیسکام کا ایک سائنس دان ہے' کام کے سلسلے میں ملنا تھا اس سے۔ آپ بھی نا۔"

اور بہت خفگی سے سعدی ذوالفقار یوسف خان نے جھوٹ بول دیا' پھر واپس مڑ گیا' یہ جانے بغیر کہ آج اس نے اپنی زندگی کی دوسری بڑی غلطی کر دی ہے۔ پہلی اسے کل عین اسی وقت کرنا تھی۔

زمر مسکراہٹ دبائے اسے جاتے دیکھتی رہی اور حنین نے گہری سانس لے کر کندھے اچکا دیے۔

وہ دونوں' اور لاؤنج میں بیٹھے مسکراتے بڑے ابا' اور سنجیدہ سا بیٹھا فارس' اور کھانا کھلنے کا انتظار کرتا سیم' اور خوشی سے بار بار نم ہوتی آنکھوں کو پونچھتیں ندرت' اور کچن میں بھاگ بھاگ کر کام کرتا صداقت' وہ سب اس بات سے ناواقف رہے کہ ٹھیک تیس گھنٹے اور بارہ منٹ بعد' وہ سعدی یوسف کو کھو دیں گے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

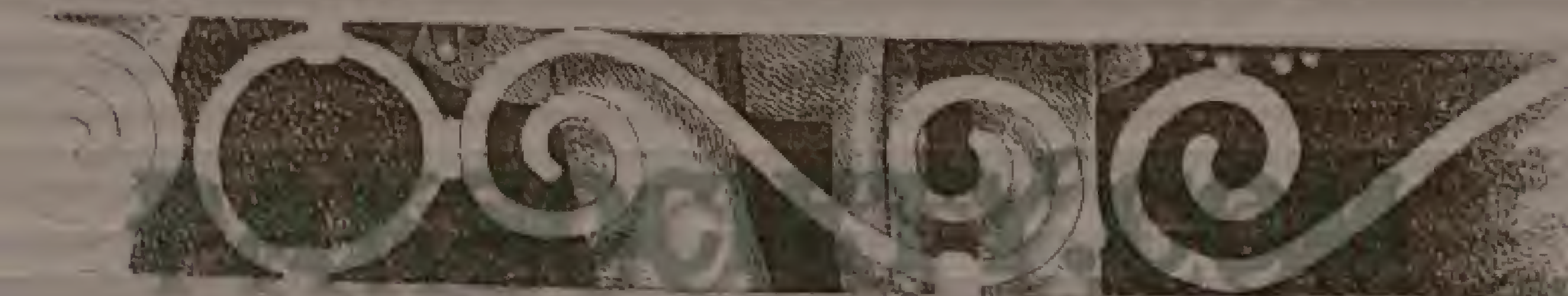
عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الہڑ سی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں' مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے 'مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد 'ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں 'مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب 'ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے 'ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب 'معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے 'مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گرجاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہوکر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے 'مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں 'زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سرپٹختی ہے 'مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے 'مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز 'ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے 'مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے 'مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون 'معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی 'ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے 'مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم 'ابیہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے 'جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں 'مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ ماردیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہوکر اس سے رابطہ کرتی ہے 'مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد 'ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے 'مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے 'مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا 'ثانیہ کو فون کردیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے 'مگر ثانیہ 'ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں، مگر معیز سمیت زارا اور ایرز انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورونوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے، مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن سلیم ایک اچھی لڑکی ہے، وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی، اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آ کر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آ کر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

۱۹
انیسویں قسط

جس طرح ثانیہ کو گھسیٹ اور کھینچ کر گاڑی میں ڈالا گیا تھا، اس کا سر بری طرح گاڑی کے دروازے سے ٹکرایا۔ مگر اس وقت اسے اس تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ "میں اغوا ہو گئی ہوں۔" پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ شخص آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ثانیہ نے اس پر بلی کی طرح غرا کر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

مگر عون پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ پہلا اطمینان تو یہ ہوا کہ اغوا سے بچ گئی، عون نے گاڑی چلا دی تو ثانیہ کا غصہ بھی عود کر آیا۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی، بلکہ بدتہذیبی۔" سر کی چوٹ جیسے ابھی ابھی لگی ہو۔ ایسی ٹیس اٹھی تھی دماغ میں۔ پیشانی کا درد الگ۔

"تم جیسوں کے ساتھ جو بھی کیا جائے وہ کم ہے۔" عون کا لہجہ۔ اف۔ پتھر برساتا۔ ثانیہ بلبلا اٹھی۔ روح تک چوٹ گئی تھی۔ زبان سے برسنے والے پتھر روح کو ہی زخمی کیا کرتے ہیں ناں۔

"مجھ جیسوں سے کیا مراد ہے تمہاری۔ اور یہ گاڑی۔ روکو۔ روکو اسے۔"

تلملا کر بے حد غصے سے کہتے ہوئے ثانیہ نے اسٹیئرنگ تھامے عون کے ہاتھوں پہ ہاتھ مارے تو گاڑی سڑک پر لہرا سی گئی۔ وہ ابھی مین روڈ پہ داخل ہوئے تھے۔

"پاگل ہو گئی ہو۔ ایکسیڈنٹ کرواؤ گی؟" عون نے بائیں ہاتھ سے اسے پیچھے دھکیلا۔

"ہاں۔ ایک ہی بار کا مرنا قبول ہے مجھے۔" ثانیہ نے چلا کر کہا تو عون نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ وہ ویسی ہی دکھائی دی۔ ہٹ دھرم اور ضدی۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ڈیٹ پہ نہیں لے جا رہا ہوں۔ کچھ باتیں واضح کرنی ہیں تم پر اور کچھ حقیقت۔" کٹیلے انداز میں کہا۔

بھالا سیدھا ثانیہ کے دل میں کھبا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ "مخالف" کی خاموشی کا مطلب "سب ٹھیک" ہے تو وہ سوچ غلط نکلی۔ اور انا پرست تو وہ بھی بہت سخت تھی۔ اخروٹ کا سا خول فوراً ہی خود پر چڑھا لیا۔

لو بھلا۔ لڑکیاں موم کی گڑیاں تھوڑی ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر گرم ہو کر پگھلا ڈالا انہیں۔

"خوش فہمی میں تو تم گھرے ہو عون عباس۔ میرا رویہ تو اول روز سے ہی یہی ہے۔ گھٹنے تو تم نے ٹیکے تھے۔ میں نے نہیں۔"

کیا برف تھی لہجے میں۔ عون تو تڑپ ہی اٹھا گویا۔ کتنے آرام سے وہ باور کرا گئی تھی کہ وہ نہ کل عون عباس کو کچھ سمجھتی تھی اور نہ آج سمجھتی ہے۔ زہر آلود تیر۔

"شٹ اپ۔ میں اگر تم سے نرمی سے پیش آتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھٹنے ٹیک چکا ہوں تمہارے آگے، صرف تمہارے لڑکی ہونے کا احساس ہے مجھے۔"

عون کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ وہیل پر سخت تھی دانت کچکچا کر بولا۔

ثانیہ نے اپنا مضروب سر ہاتھ سے سہلایا۔

"ویری گڈ۔ واپسی پہ مجھے ماموں جان سے ضرور ملوانا۔ یہ سر کی چوٹ تو میں ضرور ہی دکھاؤں گی۔ جو تم نے اغوا کرنے کے دوران لگائی ہے مجھے۔"

"ہنہ۔ اغوا کرنے کے لیے تم ہی رہ گئی ہو نا اس دنیا میں۔" عون نے تنفر سے ہنکارا بھرا۔

"تمہارا عمل تمہارے لفظوں سے میل نہیں کھا رہا مسٹر عون۔" تلخی ثانیہ کے لہجے میں بھی برابر کی تھی۔

"کب سے پیچھا کر رہے ہو میرا۔ یونہی تو دلہن بن کے نہیں ٹپک پڑے ایمہا کے گھر کے باہر۔"

اس قدر تمسخر۔ اف۔ اف۔ عون کا دل چاہا سامنے درخت میں گاڑی دے مارے۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے شادی کے نام پر؟" اچھی طرح دانتوں کو پیس اور کچکچا لینے کے بعد عون نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میرے خیال میں آخری فون کال پہ ہم یہ بات ڈسکس کر چکے ہیں۔" ثانیہ نے برجستہ جتایا۔

"ثانیہ یہ مذاق نہیں زندگی ہے۔" عون سنجیدہ تھا۔

"اس زندگی کو مذاق تم بنا رہے ہو میں نہیں۔" وہ سامنے اندھیرے میں گھورتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"ہم ایک اچھا فیصلہ کر کے اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے تھے۔"

عون نے جتنی آسانی سے کہہ دیا' ان لفظوں کو سننا' ثانیہ کے لیے اتنا آسان ثابت نہ ہوا۔ دل جیسے کسی نے چیر سا دیا ہو۔

"میری زندگی کی فکر تم میرے لیے چھوڑ دو۔ اور اپنی زندگی کا جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو وہ کرلو۔"

بڑے حوصلے سے ثانیہ نے اپنے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے عون کا حصہ الگ کرنا شروع کیا تھا۔ آنسو تھے کہ اُمڈے پڑتے تھے مگر وہ اپنی زندگی کی تمام تر برداشت آزمانے پر مجبور تھی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں حلق دکھنے لگا۔

"یہی تو کر نہیں سکتا۔" عون نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسٹیئرنگ پہ مارے۔ اور سلگتے ہوئے بولا۔

"یہ ہم دونوں کی مرضی سے ہونے والا فیصلہ ہے۔ تم اپنی بات پر اڑ جاؤ اور باقی کا دردِ سر میرے لیے چھوڑ دو۔"

عون نے بات ختم کرتے ہوئے گاڑی روک دی۔ پھپھو کا گھر آگیا تھا۔

عون نے اس کی طرف دیکھ کر چبھتے لہجے میں کہا۔

"ویسا ہی انکار۔ جیسے تم نے پہلے کیا تھا۔" ثانیہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی۔

عون نے نیچے اتر کر پچھلی نشست پہ بکھرے ثانیہ کے شاپنگ بیگز نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

ثانیہ نے بیگز تھامتے ہوئے عون کی طرف دیکھا۔

"میں نے جو فیصلہ کرنا تھا وہ کر چکی عون۔ اب تمہاری باری ہے۔"

ثانیہ نے حوصلے سے اسے "آزاد" کیا تھا۔ مگر عون کی توجہ اس کے الفاظ پہ نہیں' اس کی پیشانی پہ تھی۔ جہاں شاید گاڑی کی رگڑ سے ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ عون کا دل کٹنے لگا۔

اس نے بے اختیار اور بلا ارادہ ہی ثانیہ کا ہاتھ تھاما تو وہ جو گیٹ کی طرف مڑ رہی تھی' کرنٹ کھا کر پلٹی۔ "ایک سیکنڈ ٹھہو۔"

وہ اپنے والٹ میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ ثانیہ بڑے ضبط سے کھڑی رہی۔ عون نے سنی پلاسٹ نکال کر اس کی پیشانی کے زخم پہ لگایا تو وہ ساکت سی رہ گئی۔

عون کو درحقیقت یہ چوٹ اپنے دل پہ لگتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ ثانیہ کو ایک کانٹا چبھنے جتنی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر جب ثانیہ کو غصے سے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا تو اس وقت شاید وہ انسان نہیں رہا تھا۔

"آئم سوری۔" نرم اور بہت ہارا ہوا سا لہجہ۔

ثانیہ کا دل پگھل کر موم ہوا اور آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔ اس کے بالکل نزدیک کھڑا یہ شخص اب اس کے لیے کیا تھا وہ اگر ابھی جان جاتا تو اپنے ہونے پر فخر کرتا۔ "اور جو چوٹ دل پہ لگا رہے ہو اس کا کیا۔؟" رندھے ہوئے لہجے میں کہتی وہ یک لخت پلٹی اور ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔ فوراً" ہی اسے احساس ہو گیا کہ عورت کے لیے اپنی شکست کا اظہار کرنا کس قدر مشکل کام تھا۔

آپس میں محبت اور مان ہو تو عورت کے لیے شکست کا اظہار "رومینس" کہلاتا ہے' لیکن اگر یہی کام وہاں کرنا پڑے جہاں معاملہ یکطرفہ ہو تو عورت کو ایسا اظہار "ذلت" کے مترادف لگتا ہے۔

ثانیہ بھی اسی مقام پر کھڑی تھی' جہاں آج یہ اظہار ذلت لگ رہا تھا۔ وہ دروازہ کھلنے پہ مڑ کے دیکھے بنا اندر چلی گئی۔ اور عون عباس اس کے پہیلی نما لفظوں کے دریا میں چک پھیریاں کھا رہا تھا۔

یہ عورت بھی کیسی پہیلی ہے۔ جس کا جواب مرد کے پاس تو ہر گز نہیں ہے۔

عون کو بھی رندھے ہوئے اس لب و لہجے کا جواب نہیں مل سکا تھا۔

جیتی ہوئی عورت کا اتنا ہارا ہوا انداز؟ ماؤف ذہن لیے وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔



اندر آتے ہی اس نے لاؤنج میں صوفے پر شاپنگ بیگز پھینکے اور خود بھی وہیں گر کے ہاتھوں میں منہ چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

خالہ جان جو اس کے انتظار میں وہیں میگزین لے کے بیٹھ گئی تھیں عینک کے اوپر سے جھانکتی حیران و پریشان ہو گئیں۔

"ہائیں۔ تمہیں کیا ہو گیا آتے ہی۔؟" وہ میگزین سائیڈ پہ رکھتی اٹھ کے اس کے پاس آ بیٹھیں۔ تو ثانیہ کے آنسو تو کیا سانس بھی تھم سی گئی۔ شدید جذباتیت میں اس نے خالہ کی موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

پسیجتا چہرہ، سرخ ہوتی آنکھیں اور سوں سوں کرتی ناک، خالہ کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔

انہوں نے بے اختیار اسے تھام کے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ثانیہ! میری بچی۔ کیا ہوا ہے؟"

ان کے ذہن میں کئی وہم چھکا چھک ریل گاڑی کی طرح گزرے تھے۔

وہ یونہی خاموش ان کے ساتھ لگی ان کی محبت اور شفقت کو محسوس کرتی خود کو سنبھالتی رہی۔ اور خالہ بے چاری ہولتی رہیں۔

"تم تو اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھیں نا۔" وہ آہستہ سے ان سے الگ ہو کر دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کھنکھاری اور پھر صاف مگر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"جی۔ کر لی شاپنگ۔"

"تو پھر روئیں کیوں؟" انہیں اچنبھا ہوا۔ وہ اٹھتے ہوئے اپنے شاپنگ بیگز ان کے سامنے الٹ کر بات برائے بات بولی۔

"ایسے ہی دکان دار اتنی مہنگی مہنگی چیزیں بتا رہے تھے، ایمہا کے ساتھ میں نے اپنی بھی کچھ چیزیں لے لیں۔"

"تو تم اس وجہ سے روئیں کہ دکان دار نے چیزیں مہنگی بتائیں؟" خالہ کی آواز مارے حیرت کے کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی۔ ثانیہ سٹپٹائی۔

"نہیں۔ روئی تو ایسے ہی تھی بس۔"

"ثانی۔!" خالہ نے تادیبی انداز میں اسے پکارا۔ اور اس پکار کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھی اور لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"ایسے ہی خیال آیا کہ کل آپ کو چھوڑ کے چلی جاؤں گی واپس۔"

"بے وقوف۔ شادی پہ میں بھی انوائیٹڈ ہوں۔" خالہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

ثانیہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اب تو بہانہ بنانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔



"کب مل رہی ہو سویٹ ہارٹ؟" سیفی بے قرار تھا۔ رباب نے کوفت سے بھنویں اچکائیں۔ شکر ہے کہ ویڈیو کال نہیں تھی۔ ورنہ سیفی کو اپنی "اوقات" ضرور پتا چل جاتی۔

"تم کب آئے۔ تمہارا تو ڈیڑھ ہفتے کا (قیام) Stay تھا ابوظہبی کا۔"
"بس۔" وہ آہ بھر کے بولا۔
"تمہاری یاد اب کہیں ہفتہ بھر سے زیادہ نکلنے ہی کہاں دیتی ہے ہنی۔ تمہارے لیے شاپنگ کی ہے۔ بہت اعلا۔" رباب کے ہونٹوں پہ خوب صورت سی مسکراہٹ کھل گئی۔
"نہ کیا کرو سیفی۔! کیوں روپیہ ضائع کرتے ہو میرے پاس چیزوں کی کمی ہے کیا۔" وہ بن کر بولی۔
"ضائع۔؟" سیفی گویا برا مان گیا۔
"حسن کا صدقہ نکالتا ہوں میں تو۔ محبت ہے یہ میری۔"
"اوفوہ۔ ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتے ہو۔ او کے آئی ول ایکسیپٹ۔ (میں قبول کرلوں گی) لیکن آئندہ کے لیے احتیاط کرنا۔"
رباب نے گویا اس پر احسان دھرا۔ دوسری جانب سیفی زیر لب اسے بے آواز گالی دے کر رہ گیا۔
"تم نے وعدہ کیا تھا میرا فلیٹ دیکھنے آؤ گی؟" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔ رباب بڑے ناز سے ہنسی۔
"کون سا میرا ہے، جو میں اسے دیکھنے جاؤں۔"
"خزانہ بھرا پڑا ہے سوئس بینک میں اپنا جانم۔ منہ دکھائی میں بلینک چیک دوں گا تمہیں۔ اور روپیہ تو اتنا ہے اپنے پاس کہ ہنی مون پہ تمہیں واقعی چاند پہ لے جا سکتا ہوں میں۔" ادھر اگر خواہشات کی ماری۔ نفس کی غلام تھی تو دوسری طرف سیفی بھی شیطان کا آلہ کار تھا۔
وہ لڑکیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔
اپنے "بزنس" کے دوران اس کا ہر طرح کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ کچھ ایہما مراد جیسی تھیں جو ان کی قید میں رہ کر بھی عزت کا سودا نہ کرتی تھیں اور کچھ رباب احسن جیسی جو دولت کی چکا چوند سے متاثر ہو کر گھٹنے ٹیک دیتی تھیں۔
اور بہت سی "حنا" جیسی تھیں۔ حالات اور غربت کی ماری۔ جن کے لیے عزت سب کچھ ہوتی ہے مگر ایک بار عزت جانے کے بعد وہ احتجاج کرنا چھوڑ کر اس دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہیں۔ شاید قدرت سے بدلہ لینے کے لیے؟ یونہی تو ان کو خسارے میں نہیں کہا گیا نا۔
اس کی لاف زنی۔ کوئی عقل مند لڑکی ہوتی تو پھونک پھونک کے قدم رکھتی۔ مگر رباب کی عقل تو سونے کا پانی چڑھے زیورات اور مہنگے گفٹس نے سلب کر رکھی تھی۔
اس کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔ چہرہ تمتما اٹھا۔
"اوہ سیفی۔ یو آر ڈارلنگ۔"
وہ ستارے توڑ لانے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ چاند پہ لے جانے کا کہہ رہا تھا اور رباب کو یقین تھا کہ وہ واقعی اسے لے جا سکتا ہے۔ معیز کے نارواں رویے کا دکھ ہلکا پڑنے لگا۔

"تو پھر ڈن کر دیا ر۔ کب آ رہی ہو فلیٹ دیکھنے؟" سیفی بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔ رباب کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ کھل گئی۔ وہ سیفی جیسے "چیک" کو "کیش" کرنے کا طریقہ جانتی تھی۔



ثانیہ نے بذات خود فون کر کے معیز سے ہزار ہا وعدے لیے تھے ایہما کو شادی میں ساتھ لانے کے۔ اور معیز

کی کیا مجال ثانی جیسی "زبردست" خاتون کے ساتھ آنا کانی کر سکتا۔ مگر شاید اتنے عرصے میں تبدیلی آ ہی گئی تھی۔ معیز کو ایبہا کے لیے اب نفرت نہیں محض کوفت کا احساس ہوتا تھا۔ جو کہ ابھی بھی ہوا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ثانیہ نے ایبہا کے ساتھ اچھا خاصا بہناپا گانٹھ رکھا ہے۔

عون سے شکایت کی تو اس کا جلا کٹا انداز۔

"تمہیں تو بس زبردستی ایبہا کو ساتھ لانے کو کہہ رہی ہے 'میرے ساتھ تو زبردستی شادی کر رہی ہے وہ۔ اور میں بے چارہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

معیز ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا کہ دنیا میں بڑے بڑے دکھی بھرے پڑے ہیں۔

کھانے کے بعد سفینہ سونے کے لیے چلی گئیں۔ زارا اور ایراز بچوں کی طرح ٹی وی کے ریموٹ کے لیے لاؤنج میں جھگڑ رہے تھے۔ عمر اور معیز لان میں ٹہلنے نکل آئے۔ کچھ عمر کی طبیعت صاف کرنے کا بھی ارادہ تھا' ورنہ معیز نے پچھلی دوستی کو تو اس بار ذرا بھی ملحوظ خاطر نہ رکھا تھا۔

"موسم کافی گرم ہو گیا ہے اب تو۔" عمر بولا۔

"خیر۔ شامیں ٹھنڈی ہیں ابھی۔" معیز نے اختلاف کیا۔ جواباً" وہ ایک لمبی سی "ہوں" کر کے چپ ہو گیا۔

"تم ایبہا سے کیا بکواس کرتے رہے ہو۔ غریب بہن اور شادی کے مسائل وغیرہ۔"

معیز نے حساب صاف کر لینا مناسب سمجھا۔

"وہ۔" عمر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"وہ تو بس ایک جوک تھا۔ مگر یار۔ اٹس ویری اسٹرینج (یہ بہت حیرت انگیز ہے) آج کل کے دور میں اتنی سیدھی سادی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ تمہاری محترمہ اپنی طرز کا آخری پیس رہ گئی ہیں بس۔"

وہ متاثر ہونے والے انداز میں بولا تو معیز نے بے رخی سے اسے جھڑک دیا۔

"اب اپنی فضول حرکتوں کی پٹاری بند ہی رکھنا۔ وہ دوسری لڑکیوں جیسی نہیں ہے۔"

"نیکی کی پری ہے وہ۔ ایک منٹ نہیں لگا اسے پانچ ہزار نکال کے مجھے تھمانے میں۔"

عمر مسکرایا۔ معیز نے چاند کی روشنی میں اس کی مسکراہٹ کو کھوج کر جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی خفیف سے شانے اچکا کر بولا۔

"میں ہمیشہ اپنا نیکسٹ موبائل پہلے والے سے بہتر لیتا ہوں۔ ہم میں سے ہر کوئی ایسے ہی کرتا ہے۔ ہمارا اگلا قدم پہلے سے مضبوط ہوتا ہے۔"

وہ عجیب سی باتیں کر رہا تھا' معیز نے نہ سمجھنے والے انداز میں عمر کو دیکھا۔

وہ سنجیدہ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ جسے تم ایبہا پر فوقیت دے رہے ہو' وہ ایبہا سے بڑھ کے خوبیوں سے مالا مال ہو گی۔ اتنی ہی انوسینٹ (معصوم) اور باکردار۔" معیز کا ذہن سنسنا اٹھا۔

وہ کس پس منظر میں یہ باتیں اسے سنا رہا تھا؟ یقیناً سفینہ بیگم اسے رباب میں معیز کی دلچسپی کے متعلق بتا چکی ہوں گی۔

"میں اپنی زندگی کی ترجیحات اچھی طرح جانتا ہوں اور اس کے لیے مجھے کسی سے ڈکٹیشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔" معیز کا لہجہ سرد تھا۔

"تم عون کی شادی میں شریک ہونے جا رہے ہو؟" لمحہ بھر اسے دیکھتے رہنے کے بعد یک ہی ہلکا سا مسکرا کر عمر

نے ٹاپک ہی تبدیل کر دیا۔
وہ ایسا ہی تھا ہمیشہ سے لہجوں کی زبان سمجھنے والا۔ کوئی بات دل پہ لیتا ہی نہیں تھا۔ معیز نے بھی گہری سانس بھر کے خود کو قدرے معتدل کیا۔ اور اثبات میں سر ہلایا۔
"ہوں۔"
پھر کچھ سوچ کر معیز نے اسے گھور کے دیکھا۔
"ایک بات تو بتاؤ۔ ساما نے تمہیں یہ رشتہ ختم کرنے کے لیے بلوایا ہے یا پکا کروانے کے لیے؟"
"مجھے وہ لڑکی بہت مظلوم لگی ہے معیز! زمانے اور حالات کی ستائی ہوئی۔"
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمر سنجیدگی سے بولا۔
اس کا قطعاً" ارادہ نہیں تھا معیز کو یہ بتانے کا کہ وہ ایبہا کے حالات زندگی کی اصل رپورٹ عون عباس سے حاصل کر چکا ہے۔
معیز اسے یونہی تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ تو عمر صفائی پیش کرنے والے انداز میں دوبارہ بولا۔
"جب پھپو نے مجھے بتایا کہ اس طرح تم کسی لڑکی کے چنگل میں پھنس گئے، مجھے لگا شاید کوئی غلط قسم کی لڑکی ہوگی۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک خاندانی لڑکی ہے۔ انکل کا اس سے ہٹ کے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ تب ہی انہوں نے اپنا سب سے عزیز بیٹا اس کے حوالے کر دیا۔"
معیز کو یاد آیا۔ امتیاز احمد کو معیز کے ساتھ ایبہا کے نکاح والے فیصلے پر بہت اطمینان تھا۔
"کبھی اس سے ملو گے تو میرے فیصلے کو بہترین پاؤ گے۔" وہ کہا کرتے تھے۔
"وہ ایک پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ہے۔ کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں جس کی بنا پر تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو؟" عمر محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔
معیز نے خالی الذہن کیفیت میں اسے دیکھا۔
وہ خوب صورت نہیں۔؟ بہت خوبصورت تھی۔ معیز نے پل بھر کو سوچنا چاہا۔
واقعی۔ سفینہ بیگم کے دباؤ کے علاوہ اور کیا وجہ تھی ایبہا سے جان چھڑانے کی؟ اس نے دل کو ٹٹولا۔
کیا میں اس سے اس لیے نفرت کرتا ہوں کہ وہ صالحہ کی بیٹی ہے؟ وہ صالحہ جو میری ماں کی زندگی کی خوشیوں کی قاتل ہے؟ وہ دنگ رہ گیا۔
اس نے اپنے دل کو ایبہا کی نفرت سے خالی پایا تھا' اسے خود سے الجھتا چھوڑ کر عمر خاموشی سے اندر چلا گیا۔



"سفیر کی واپسی کی خوش خبری سنی ہے میں نے۔" ناشتے کی میز پر سفینہ نے گویا دھماکا ہی کر دیا۔ بہت سرخوشی کا سا عالم تھا ان کے لہجے میں۔
معیز کو بھی خوشی ہوئی' جبکہ عمر اور ایراز نے خوامخواہ کھانس کے زارا کو نروس کر دیا۔
"یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔" معیز مسکرایا۔
"وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔" سفینہ مسکرائیں۔
"ہاہ۔" عمر نے حسرت سے آہ بھری۔ زارا کو مارے شرم کے وہاں سے بھاگنا ہی پڑا
"ناشتا کر لو۔ ہم اس کے کمرے میں بھی جائیں گے تنگ کرنے۔" عمر نے ایراز کو جیسے تسلی دی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ماما۔ آپ سوچ لیں کیا ڈیٹ دینی ہے۔" معیز نے انہیں فری ہینڈ دیا۔
"ہوں۔" سفینہ بیگم کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔
"بہت عرصے بعد گھر میں خوشی کا موقع آرہا ہے۔"
"تو لگے ہاتھوں کچھ اور خوشیاں بھی منا ڈالیں۔" ایراز نے دبے لفظوں اپنی طرف اشارہ کیا۔ سفینہ بیگم اس کی بات اچھے سے سمجھیں مگر اطمینان سے بولیں۔
"ہاں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ زارا کے ساتھ معیز کو بھی نمٹا دوں۔ سفیر کو اچھا لگے گا اگر ہم رباب کے لیے پروپوزل دیں گے۔"
ایراز نے بے اختیار معیز کا چہرہ دیکھا جہاں تاثرات فوراً" تبدیل ہوئے تھے۔
(اف۔ دو کشتیوں کا سوار)۔
ایراز دل ہی دل میں کڑھا۔
"فی الحال تو آپ زارا کو دیکھیں ماما۔ اتنے اہم موقع پر میں کسی بھی قسم کا کوئی ایشو نہیں چاہتا۔"
معیز نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے چائے کا خالی کپ ساسر میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"کوئی ایشو نہیں ہوگا معیز۔ ایشو تو تب بنے گا جب سفیر کو پتا چلے گا کہ اس لڑکی کا تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے۔" سفینہ بیگم کا لب و لہجہ بہت ٹھنڈا تھا مگر معیز کا تو تن بدن ہی سلگ گیا۔
"میرے خیال میں آپ فی الحال زارا کی شادی پر ہی فوکس رکھیں۔ میں جب فارغ ہوں گا تو آپ کو بتا دوں گا۔ تب آپ اپنے دل کے سارے ارمان نکال لیجیے گا۔"
وہ اللہ حافظ کہتا آفس کے لیے نکل گیا۔ اور پیچھے تڑپتے ترستے دو حسرت زدہ دل رہ گئے۔
ایراز احمد اور عمر۔
"اف۔ کیا ادا ہے بھائی کی۔ اور جو پہلے سے فارغ بیٹھے ہیں انہیں کوئی پوچھ نہیں رہا۔"
ایراز نے ماں کا موڈ بدلنے کی خاطر منہ بسور کر کہا۔
"فارغ۔ بلکہ ویلے نکمے۔"
یہ لقمہ عمر کا تھا۔ پھر ساتھ ہی تڑکے کے طور پر اضافہ بھی کیا گیا۔
"تنی ترسا ترسا کے اگر میری شادی کی گئی تو میں اکٹھی دو ہی کروں گا۔" یہ عمر کا مصمم ارادہ تھا۔ سفینہ کو ہنسی آگئی۔
"بدتمیز۔ بتاتی ہوں میں بھائی صاحب کو۔" انہوں نے دھمکایا۔
"بھائی صاحب کیوں بھابھی صاحبہ کو ڈائریکٹ کال ملائیں، جو میرے سوبر اور سیریس ہونے تک میری شادی کو ٹال چکی ہیں۔"
عمر نے تڑپ کر کہا۔ ایراز نے مسکراہٹ دبائی اور بظاہر بڑی ہمدردی سے بولا۔
"اف۔ یعنی پھر تو کبھی آپ کی شادی نہیں ہو سکتی۔ چچ چچ۔"
عمر نے خالی گلاس اٹھا کر اسے دھمکایا تو ایراز اور سفینہ بیگم ہنسنے لگے۔



وہ آفس کے لیے نکلا تو الجھن کا شکار تھا۔ ان دنوں کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی دل پہ۔
وہ رباب کے لیے سنجیدہ تھا۔ مگر اس کے رنگ ڈھنگ دیکھتا تو وہ بیوی والے سانچے میں پوری نہ آتی تھی۔

گزشتہ لڑائی کے بعد تو دونوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک صلح کا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔
وہ گاڑی باہر نکال رہا تھا جب اس نے ایہا کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھامے دوسرے سے اپنا پرس چیک کرتی۔ مصروف سا انداز۔
معیز نے گاڑی اس کے قریب لا کر زور سے ہارن بجایا تو وہ بدک کر ایک طرف ہوئی۔ پھر معیز کو دیکھا تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔
"تم کہاں جا رہی ہو۔ وہ بھی اکیلی؟" ایہا ہچکچا کر کھڑکی کے پاس آئی۔
"مجھے اپنا جوتا تبدیل کرانا تھا۔ ثانیہ تو واپس جا چکی ہیں اس لیے اکیلے ہی جانا پڑا۔"
اس نے تفصیل بتائی تو معیز نے اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جھک کر فرنٹ ڈوران لاک کرنے لگا۔
وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی۔
"کہاں سے لیا تھا جوتا؟"
معیز نے پوچھا تو ایہا نے مشہور برانڈ کا نام بتایا اور ساتھ ہی شاپنگ بیگ بھی دکھایا جس پہ اس برانڈ کا نام جگمگا رہا تھا۔
"تو چیک کر کے لیتیں۔ زہر لگتا ہے مجھے لڑکیوں کا یوں اکیلے بازاروں میں گھومنا۔" وہ ناگواری سے بولا۔
"میں گھومنے نہیں جا رہی تھی۔" وہ بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی۔ معیز نے اس کی طرف دیکھا تو وہ حواس باختہ سی ہوئی۔
"میرا مطلب ہے کہ میں تو ضروری کام سے جا رہی تھی۔"
"اکیلی۔" معیز نے پھر جتانے والے انداز میں کہا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔ "جو اکیلا ہو وہ اکیلے ہی جاتا ہے۔"
"اف۔" معیز سلگا۔ "ڈیم اٹ۔ یہاں تو سب ہی پہیلیاں بجھوانے والے۔ طنز کے تیر چلانے والے ہیں۔"
"دنیا میں رہنے کے لیے دنیا میں رہنے کے آداب بھی آنے چاہئیں انسان کو۔"
وہ پتا نہیں کیوں غصے میں تھا۔ ایہا نے ذرا سا چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ بے حد الجھا ہوا۔ اور دوسرے کو الجھا دینے والے موڈ میں تھا وہ۔
"اسی لیے تو اکیلی جا رہی تھی۔"
بات گو ذرا سی تھی مگر معیز کو ٹھنڈا کر گئی۔
وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ شاپ پہ جا کے ایہا نے جوتے کا نمبر تبدیل کرایا۔
بڑے سے شاپنگ مال میں ساری دکانیں ہی برانڈڈ اشیا کی تھیں۔
"سنو....." وہ باہر کی جانب چل رہی تھی۔ جب معیز نے اسے آواز دی مگر شاید وہ اپنے دھیان میں تھی۔
چونکی تو تب جب اس کا ہاتھ ایک ملائم سی گرفت میں آگیا۔ اس نے کرنٹ کھا کر دیکھا۔ وہ قدرے جھنجلایا ہوا تھا۔
"آواز دے رہا ہوں تمہیں اور تم منہ اٹھائے چلی جا رہی ہو۔" ایہا نے غیر محسوس کن انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر خوامخواہ ہی ماتھے پہ دوپٹا ٹھیک کیا۔
"جی۔"
"ثانیہ کی شادی ہے۔ شاپنگ کر لو۔ تمہیں ساتھ نہ لے کے گیا تو شاید میرے لیے بھی نو اینٹری کا بورڈ لگ جائے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ثانیہ کے حوالے پر ایہا کا دل اسی مان سے بھرا جیسے لڑکیوں کا اپنے میکے کے کسی رشتے کے مان سے بھرتا ہے۔

ثانیہ اسے معیز پر ترجیح دیتی تھی۔ یہ سوچ ہی اس کا خون بڑھا گئی۔
معیز نے اس کے چہرے پر پھیلتی دلفریب سی تمتماہٹ دیکھی۔
"شاپنگ تو مجھے ساری کروادی تھی ثانیہ نے۔" معیز کو اپنے کندھوں سے کوئی بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔
"ڈیش گڈ۔۔۔" وہ ریلیکس سا اسے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اگلی شاپ سے نکلتے ہوئے کوئی معیز سے ٹکرایا۔
"اوہ۔۔۔ سوری۔" وہ گڑبڑایا۔ پھر خوش گوار سی حیرت کا شکار ہوا۔
"رباب۔۔۔" مگر رباب کی تیکھی اور تلخ نگاہ ابیہا پر گڑی تھی۔ جو کچھ خائف سی ہونے لگی تھی۔
"شاپنگ کرنے آئی ہو۔۔۔؟"
معیز نے قصداً" اس کے حلیے کو نظر انداز کیا۔ بنا دوپٹے کے بغیر آستین کی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس وہ دعوت نظارہ دیتی محسوس ہو رہی تھی۔
"سوری۔ پھر بات ہوگی۔ میں اس وقت کسی کے ساتھ شاپنگ میں بزی ہوں۔"
وہ بڑی نخوت سے کہتی ٹک ٹک کرتی اگلی شاپ میں گھس گئی۔ معیز کئی لمحوں تک یونہی کھڑا رہ گیا اور ابیہا کا دل تو اونچی نیچی لہروں میں گویا ہچکولے کھا رہا تھا۔
وہ جانتی تھی رباب اور معیز کے تعلق کو۔۔۔ اسے محسوس ہو گیا تھا۔
"چلو۔" اس نے بت بنی کھڑی ابیہا کو اشارہ کیا تو وہ ہڑبڑا کر بے دار ہوئی۔ بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے معیز نے سرسری سی نگاہ ابیہا پر ڈالی۔
پوری آستینوں اور نفیس سا دوپٹا بہت سلیقے سے اوڑھے وہ اپنی زینت کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ ایک مکمل عورت' اس کے ذہن میں عمر کے کل رات کے کہے جملے چکرانے لگے۔ کھلے عام رباب کے اس حلیے نے معیز کا دل پھر سے مکدر کیا تھا اور وہ اس معاملے پر رباب سے بحث کرنے کا پورا ارادہ رکھتا تھا۔
ابیہا کو گھر کے سامنے اتارا۔
"بہت شکریہ۔" وہ متشکرانہ کہہ کر گاڑی سے اتری اور آگے بڑھ کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ معیز نے سائیڈ مرر میں دیکھا۔ اس کا خود کو سمیٹ کر چلنے کا انداز اور دوپٹے سے ڈھکا وجود' وہ خود سمجھ نہیں پایا کہ ذہن میں کیا چل رہا ہے۔

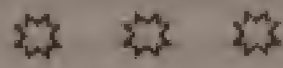


"آرہی ہو نا پھر مجھے ایرپورٹ پہ ریسیو کرنے۔" سفیر کی زندگی سے بھرپور آواز گونجی تو کان سے موبائل لگائے زارا بے اختیار ہنس دی۔
"بہت اچھا لگے گا نا دلہن خود دولہا کو ریسیو کرنے آئی ہے۔" سفیر کو بہت اچھا لگا۔
"آہا۔ میری دلہن۔!" اس نے گویا مہر ثبت کرنا چاہی۔ زارا ایک لخت ہی جھینپ سی گئی۔ سفیر کو اس کی پرحجاب سی خاموشی نے مزا دیا۔
"بلکہ میں تو چاہتا ہوں مجھے ریسیو کرنے فقط تم ہی آؤ۔ کیوں کہ گھر میں سب کے سامنے تو تم ملوگی نہیں۔" اسے چھیڑا۔
"تو پبلک میں کیا ہم ڈوئٹ (دوگانا) گا کر ملیں گے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مسلسل ٹیلیفونک رابطے کی وجہ سے دونوں کی کیمسٹری خوب ملنے لگی تھی۔ سفیر میں اچھے شوہروں والی تمام خوبیاں موجود تھیں جن میں سب سے پہلی خوبی ان کا آپس میں دوستی کا رشتہ تھا۔

"تم سامنے آؤ تو سہی۔ ملنے کا طریقہ خود بخود آجائے گا۔" سفیر نے لطیف سی شرارت کی تو وہ حجاب آلود انداز میں مدھم سا ہنس دی۔ پلکوں پہ جیسے کسی نے منوں بوجھ لاد دیا ہو اور سامنے۔ سامنے سفیر احسن بیٹھا اسے تک رہا ہو۔

اس کی وارفتی 'اس کی بے تابی دل میں اتر رہی تھی اور اس کی میٹھی باتیں زارا کی سماعتوں میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ لبوں پہ نرم سی مسکراہٹ لیے اس کی باتیں سنتی کبھی بے ساختہ بول اٹھتی اور کبھی کھنکھناتی ہنسی بکھیر رہی تھی۔



"تم سیفی سے پیچھا چھڑا کیوں نہیں لیتیں رباب۔ مجھے تو کچھ خاص اچھا آدمی نہیں لگا وہ۔" اس کی دوست علیشبہ نے ناگواری سے کہا۔ بہت دنوں کے بعد آج رباب کو کسی دوست کے ساتھ چائے پینے کا موقع ملا تھا 'اور بیٹھتے ہی یہ فرمائش۔

رباب ٹھٹکی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔

"اچھا تو ہے۔"

"اچھا۔۔۔؟" علیشبہ نے تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو نہیں لگا۔"

"کیوں۔۔۔ اچھوں کے سروں پہ سینگ ہوتے ہیں؟ یا ماتھے پہ تین آنکھیں۔" رباب نے پیشانی پہ ایک بل ڈال لیا تھا۔

"کم آن رباب سنسیرلی (خلوص سے) تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ اچھا بھلا ہے معیز احمد۔ کیوں تباہی کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

علیشبہ خاصی منہ پھٹ تھی۔ صاف منہ پہ بات کہنے والی۔

"اس سے پہلے بھی ٹاسک کرتی رہی ہو مگر وہ جسٹ فار انجوائے منٹ (محض تفریح) تھے۔ کالج لائف ختم ہوگئی تو یہ سب چکر بھی ختم ہو جانے چاہئیں ڈیر۔"

"شٹ اپ۔ بور کر رہی ہو تم مجھے۔" رباب کو اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

"تم ہی سب نے مجھے سیفی کے پیچھے لگایا تھا۔ اب جب میں اس کی دوستی سے مطمئن ہوں تو تمہارا کیا مسئلہ ہے۔"

"میرا مسئلہ یہ ہے کہ تم میری اچھی دوست ہو۔ اور میں فیوچر میں تمہیں معیز احمد جیسے اچھے شخص کے ساتھ دیکھنا پسند کروں گی۔"

وہ صاف گوئی سے بولی۔ رباب نے تیز نظروں سے چند لمحوں تک اسے گھورا اور پھر تلخی سے بولی۔

"اور معیز احمد۔۔۔ وہ "اچھا" شخص آج کل بغل میں ابیہا مراد کو لے کے گھوم رہا ہے۔" علیشبہ نے چونک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"وہ کہاں سے آگئی؟"

"کہیں سے بھی آئی ہو 'واٹ ایور' لیکن اس پردے کی بوبو کی وجہ سے اب وہ میری ڈریسنگ اور لبرٹی (آزادی) کے طعنے دینے لگا ہے مجھے۔"

علیشبہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ جو خود کنوئیں میں گرنا چاہے ' اسے کون روکے؟
"تم دیکھنا۔ معیز نے میرا دل توڑا ہے نا۔ اب میں کس کس کا دل توڑتی ہوں۔"
رباب کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔
علیشبہ کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے شاپنگ بیگز اکٹھے کرنے لگی۔ جبکہ سیفی کے متعلق علیشبہ کے شک کے اظہار کو رباب نے علیشبہ کی جیلسی قرار دیا۔
وہ بے وقوف تھا جو رباب پہ لاکھوں وارتا جارہا تھا؟ رباب دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پہ مسرور تھی۔ اور ایسے لوگوں کے پاس کھڑی قسمت اکثر ہاتھ مل رہی ہوتی ہے۔



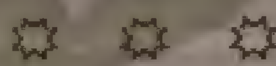
"ماما! آپ بھی چلیں نا۔ عون نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔" معیز اپنی پیکنگ زارا سے کروا چکا تھا۔ آج سہ پہر وہ عون کی سسرال جانے والے تھے۔ رات کو مایوں مہندی کا فنکشن رکھا گیا تھا۔
سفینہ مسکرادیں۔
"ولیمے میں شریک ہو جاؤں گی بیٹا! وہ لوگ یوں بھی وہاں رات رکنے والے ہیں۔ اتنا لشکر کہاں سنبھالیں گے لڑکی والے۔"
بات ان کی صحیح تھی۔ عون کے ابا نے بہت قریبی رشتہ داروں کو انوائٹ کیا تھا۔ دوستوں میں محض معیز تھا اور ایہا کے ساتھ جانے کی تو معیز نے سفینہ بیگم کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ ورنہ تو قیامت ہی آجاتی گھر میں۔
ایہا اپنا بیگ لے کر گھر سے باہر نکلی' وہیں سے معیز نے اسے پک کرلیا۔
اس سے پہلے بھی وہ معیز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی ڈری سہمی۔ دروازے سے لگی۔
مگر آج اس کا عجیب سا چہکتا ہوا انداز تھا۔ سرخوشی لیے۔ سیاہ آنکھوں کی چمک تمتماتے چہرے کے ساتھ بڑا ماورائی سا تاثر دے رہی تھی۔ فیروزی کلر کے پرنٹڈ لباس میں وہ بالکل سادہ تھی مگر یوں دمک رہی تھی جیسے راستہ دکھانے والا ستارہ۔
معیز کو اس سے اچھی تشبیہ نہ سوجھی تھی۔
"اف۔۔" ہاتھوں کو مسلتی وہ خود ہی بے اختیار بول اٹھی۔ "کتنا مزہ آئے گا نا۔ میں نے کبھی کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی۔"
معیز نے گہری سانس بھری۔ اس کے وجود پہ چھائی سرشاری کا معمہ حل ہو گیا تھا۔
"ہوں۔۔" معیز نے سرہلایا۔
"آپ تو بہت سی شادیوں میں گئے ہوں گے نا۔" وہ باقاعدہ اس کی طرف رخ موڑ کے بیٹھ گئی تھی۔
"ظاہر ہے۔ دنیا میں آئے ہیں تو دنیا داری میں شریک بھی ہونا پڑتا ہے۔"
معیز کا اسے بہت نرمی دکھانے یا لفٹ دینے کا کوئی موڈ نہیں تھا' بلکہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز ہی برت رہا تھا کیوں؟ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔
"پتا ہے' وہاں ہمارے محلے میں کبھی کسی نے امی کو اور مجھے بلایا ہی نہیں کسی شادی میں۔" وہ اداس سی ہو گئی۔
"ابا کی وجہ سے۔۔ صرف زرینہ خالہ سے امی کی دوستی تھی اور بس۔" معیز عجیب سے احساس میں گھرنے لگا۔
دفعتاً" وہ پھر سے ذرا پرجوش ہوئی۔

"اور آپ کو پتا ہے' میں نے شادی کا کارڈ بھی دیکھا ہے۔ ثانیہ خود مجھے دینے آئی تھیں۔ مہندی کا الگ ہے' بارات اور ولیمے کا الگ۔ اتنی چمک اور ملائمت ہے اس میں۔ میں نے تو اسے سنبھال کے رکھ لیا ہے۔"
"فریم کراؤ گی کیا۔۔۔؟" معیز نے اس عجیب سے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔
"ایک ہی تو کارڈ ہے میرے پاس اور آپ نے دیکھا نہیں' مہندی کے کارڈ پہ ثانیہ کی فرینڈز میں سب سے پہلا نام میرا ہے۔"
اس کے انداز میں تفاخر تھا۔ معیز کو افسوس ہوا۔ اس نے واقعی نہیں دیکھا تھا۔
"مجھے دراصل عون کی طرف سے کارڈ آیا ہے تو اس میں ایسا کچھ نہیں تھا۔" معیز نے بتایا۔
"اچھا۔۔۔ ان کا کارڈ علیحدہ تھا۔ مطلب کہ ایک شادی کے دو کارڈز۔۔۔؟"
ایپھا بے چاری کی سادگی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ معیز کے ہونٹوں پہ بے اختیارانہ مسکراہٹ آئی۔
"لڑکی والے اپنے مہمانوں کے لیے کارڈز چھپواتے ہیں اور لڑکے والے اپنے مہمانوں کے لیے۔"
"اچھا۔"
معیز نے اس خواب ناک سے "اچھا" پر بے اختیار ہی اسے دیکھا تو ادھر حیرت کا ایک انوکھا ہی انداز تھا۔ حیرانی سے پھیلی سیاہ پلکوں کی باڑ سے سجی آنکھیں اور نیم وا لب۔ جیسے خلا میں ان دیکھا منظر دیکھ رہی ہو۔
معیز کے یوں اچانک دیکھنے پر وہ سٹپٹا کر سیدھی ہو بیٹھی مگر یوں سٹپٹانے اور جھینپ کر سیدھے ہونے کے دوران جو رنگ اس کے چہرے پر پھیلے انہوں نے معیز کو متحیر کر دیا۔
وہ لڑکی اس کے نکاح میں تھی اور چلو آپسی تعلقات جیسے بھی ہوں مگر اس کا اپنے شوہر سے یوں جھجکنا شرمانا۔۔۔ معیز کے لیے بہت انوکھا تھا۔
لڑکیاں تو اجنبیوں سے بھی یوں نہیں شرماتیں۔۔۔
معیز کو بے ساختہ رباب کے انداز یاد آئے۔



حسب توقع عون منہ پھلائے ہوئے تھا۔ ایپھا اور معیز سیدھے ان ہی کی طرف پہنچے۔ وہاں سے پھر قافلہ سید نگر کی طرف نکلتا۔ عون کی امی اور بھابھی بڑے تپاک سے ملیں۔
"یہ بھابھی ہیں۔"
ایپھا کا عون نے سیدھا سادہ تعارف دیا تو معیز بس دانت پیس کر رہ گیا۔
"ویسے یار معیز! قسم سے کیا کمال کی جوڑی بنی ہے تم دونوں کی۔" عون نے دل سے کہا تھا' مگر پھر معیز کی تیوری کے بل دیکھ کے دھیما پڑا۔
"یونہی۔ اپنا خیال ظاہر کر رہا ہوں۔"
"تم اپنے خیالات اپنی "نصف بہتر" کے لیے سنبھال کر رکھو۔" معیز نے اسے یاد دلایا تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔
اچھا لباس اور اچھا "ساتھ" انسان کو کس قدر پر اعتماد بنا دیتا ہے۔۔۔ یہ ایپھا نے اس دن جانا۔
وہ بہترین لباس میں ملبوس تھی اور وہاں اس کا تعارف معیز کی بیوی کے طور پر ہوا تھا۔ اسی وجہ سے عون کی امی اور بھابھی نے اس سے کسی معزز مہمان کی طرح رویہ رکھا تھا۔ ایپھا کے اعتماد کا گراف قدرتی طور پر بڑھا۔
اسے اپنی بیس سالہ زندگی میں ایسی قدر دانی کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

"بڑے خوش ہو۔" معیز نے عون کے قہقہوں پر چوٹ کی۔
"طوفان سے پہلے کی علامات ہیں ساری اور یوں بھی زندگی میں ایک بار شادی ہوتی ہے۔ ایک ہی مووی میں کام کا موقع ملتا ہے' وہ تو اچھی ہے۔"
اس نے تفصیل سے جواب دیا تو معیز کو ہنسی آگئی۔ عون کی فیملی اپنی گاڑی میں تھی۔ ابیہا اور معیز کی گاڑی ان کے پیچھے اور پھر مہمانوں کی ہائی ایس نکلی۔
"تم تیار نہیں ہوئیں۔۔۔؟" معیز کو راستے میں دھیان آیا۔
"مجھے تو تیار ہونا ہی نہیں آتا۔ ثانیہ نے کہا تھا' وہاں آجاؤں تو وہ خود کریں گی۔"
وہ سادگی سے کہتی معیز کو چپ کروا گئی۔ باقی کا سفر ابیہا نے بڑے اشتیاق سے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اور معیز نے جانے کس چپ کے حصار میں گزارا۔
ان کا قافلہ سیدھا حویلی پہنچا تو وہاں ان کا پرتپاک استقبال ہوا۔ ابیہا کو بہت اچھا لگا۔ ساری خواتین' مہمان خواتین سے گلے مل رہی تھیں۔ بنا واقفیت کے کئی ایک نے ابیہا کو بھی گلے سے لگا کر استقبال کیا تو خوامخواہ ہی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
بھابھی نے ابیہا کو تیار کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ تو ابیہا نے فوراً" ثانیہ کو کال ملا کر ساری تفصیل بتائی۔ وہ ابیہا کے جوش اور خوشی پر ہنستی رہی۔



"ماشاء اللہ۔۔۔" وہ کپڑے تبدیل کر کے تیار ہونے بھابھی کے پاس آئی تو اسے دیکھتے ہی جس طرح بھابھی نے توصیفی انداز میں کہا' ابیہا تو کانوں تک لال پڑ گئی۔
"وہ۔۔۔ میں تیار ہونے آئی تھی۔" وہ نروس سی ہو کر انہیں یاد دلانے لگی۔
"تیار تو ہمیں ہونا پڑتا ہے ڈیر' تمہیں تو اوپر ہی سے اتنا سنوار نکھار کے بھیجا گیا ہے۔" بھابھی اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ گھبراہٹ میں آدھی بات سمجھی اور آدھی نہیں۔
"تو پھر۔۔۔ میں تیار نہ ہوں؟"
بھابھی نے اپنا مشہور زمانہ قہقہہ لگایا۔ بچوں کو دادی کے پاس بھجوا کر وہ اطمینان سے ابیہا کو تیار کرنے لگیں۔
ہلکا سا میک اپ۔۔۔ اور وہ یوں نکھری کہ بقول بھابھی آج کا فنکشن تو تمہیں "لُٹ" لو گی معیز تو بے ہوش ہو ہی جائے گا۔ وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتی اپنے کمرے کی طرف بھاگی جہاں اس کا سامان رکھا تھا۔ بیگ میں سے میچنگ جوتی نکال کے موڑھے پہ بیٹھی وہ جھک کر اسٹریپ بند کر رہی تھی۔ سیاہ بال شانے سے پھسل کر آگے کو بکھر گئے۔
واش روم کا دروازہ خفیف سی کلک کی آواز سے کھلا۔ اپنے کام میں مصروف ابیہا نے یونہی سرسری سی نگاہ اٹھا کے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔
معیز سفید شلوار اور بنیان میں ملبوس بالوں کو تولیے سے رگڑتا واش روم سے باہر نکلا تھا۔ ابیہا قدرے سائیڈ پہ تھی' اس لیے ابھی معیز کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مگن تیزی سے بال خشک کر رہا تھا۔
تھوک نگل کر حلق تر کرتے ابیہا نے جلدی سے اپنی توجہ پیروں کی طرف کرلی اور دوسری سینڈل پہننے لگی۔
وہ چوڑیوں کی خفیف سی جلترنگ تھی' جس نے آئینے کے سامنے کھڑے معیز احمد کو پورے کا پورا مڑنے

پر مجبور کردیا۔

سینڈل کا اسٹرپ بند کرتے ایہا کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ معیز حیران و پریشان۔۔۔ یہ کون محترمہ کمرے میں گھس آئیں۔ جلدی سے لپک کر بیڈ پہ پڑی قمیص اٹھا کر بدن پر چڑھائی۔

"ایکسکیوز می۔۔۔" معیز ان "محترمہ" کو متوجہ کر کے بتانا چاہتا تھا کہ یہ کمرہ معیز کو الاٹ کیا گیا ہے۔

تب ہی وہ سینڈل کا پیچھا چھوڑ کر مجبوراً "سیدھی" ہوئی تو معیز کی آنکھیں لمحہ بھر کو تو چندھیا ہی گئیں۔

ایک خوب صورتی چہرے کی ہوتی ہے۔۔۔ محض چہرے کی اور اصل خوب صورتی جو چہرے کی خوب صورتی کو نکھارتی ہے وہ کردار کی خوب صورتی ہے۔ انسان کی معصومیت' اس کی سادگی۔۔۔ سب اس کے چہرے سے جھلکتا ہے۔

ایہا اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ پھرتی سے واپس آئینے کی طرف پلٹ گیا۔ اب ایسا بھی کیا مبہوت ہو کر بت بن جانا۔

"اوہ۔۔۔ تم ہو۔ میں سمجھا پتا نہیں کون کمرے میں گھس آئیں محترمہ۔"

وہ فوراً" ہی خود کو سنبھال گیا تھا۔ ایہا نے بھی اس کی توجہ دوسری طرف محسوس کر کے سکھ کا سانس لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے تبدیل شدہ کپڑے تہہ کر کے رکھنے لگی۔

معیز کے کپڑے واش روم سے نکال کے سنبھالے اور اب وہ وہیں بیڈ کے کنارے ٹکی معیز کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

اس کا دل عجیب سی خوشی کی لپیٹ میں تھا۔ دل چاہ رہا تھا' اڑ کے ثانیہ کے پاس پہنچ جائے۔ وہی تو تھی جس کی وجہ سے آج وہ بھی عام انسانوں کی طرح "دنیاداری" کو "برتنے" کے قابل ہوئی تھی۔

وہ یونہی بال برش کرتے معیز کو دیکھے گئی۔ سفید شلوار کے ساتھ "جنید جمشید" کرتا۔۔۔ گرین اور براؤن لائننگ سے مزین تھا۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خود پر بے دریغ پرفیوم چھڑک رہا تھا۔ ایہا کی مشام جان معطر ہو گئی۔ اس نے گہری سانس اندر کھینچ کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

اسے یاد آیا۔۔۔ یہ خوشبو معیز احمد کے ملبوس میں سے پھوٹتی تھی۔۔۔ جب وہ۔۔۔ اسے یاد تھا۔ کب کب وہ اس کے اتنے قریب آیا تھا کہ وہ اس خوشبو کو محسوس کر سکتی۔

معیز نے آئینے میں دیکھتے ہوئے ایہا کی نگاہ کے ارتکاز کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

بالوں میں ہاتھ پھیر کر آخری جائزہ لیتا وہ اس کی طرف پلٹا تو اس نے جلدی سے سر جھکا لیا۔

معیز کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جلدی سے اٹھ جاؤ۔ عون مجھے کوس رہا ہو گا۔" اس کی نروس نیس کو ختم کرنے کی خاطر معیز اس کی طرف کم ہی توجہ کر رہا تھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو ایہا کا معصوم سا دل اداس ہو گیا۔ بھابھی اس کی اتنی تعریفیں کر رہی تھیں اور معیز نے ایک نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔۔۔ بے ہوش ہونا تو دور کی بات تھی۔

وہ بجھے بجھے انداز میں معیز کی تقلید میں باہر نکل گئی۔



باہر رنگ و نور کی الگ ہی دنیا سجی تھی۔

ایہا تو حیران و پریشان ہی رہ گئی۔ مہندی کی سجی ہوئی تھالیوں میں جلتی موم بتیاں' ڈھول کی تھاپ اور رنگ و بو

کی دنیا۔ بھابھی نے اس کے ہاتھ میں بھی مہندی سے سجی تھالی تھمادی۔
ثانیہ کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ سب مہندی کے گانے گاتی اور لڑکے ڈھول کی تھاپ پہ بھنگڑے ڈالتے لڑکی والوں کے گھر پہنچے۔
ایہا تو معیز جیسے سنجیدہ (سڑیل) مزاج بندے کو ڈھول کی تھاپ پر عون کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہنستا مسکراتا وہ بنا دستک دیے سیدھا اس کے دل میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ لڑکیوں اور خواتین نے پھولوں کی پتیاں برسا کر ان کا استقبال کیا تھا۔ بھابھی نے اندر جاتے ہی ایہا کو ثانیہ کے کمرے میں بھجوا دیا۔ پیلے اور سبز مہندی کے سوٹ میں ملبوس۔ پھولوں کے زیور اور چوڑیوں سے سجی سنوری وہ ثانیہ تھی۔
ایک الگ ہی دل فریب سے روپ میں بسی۔ ایہا سے لپٹ کے ملی۔
"بہت پیاری لگ رہی ہیں۔"
(اور اداس بھی) ایہا آدھی بات دل میں دبا گئی۔
"اور تم تو قیامت ڈھا رہی ہو۔ معیز بھائی پر بھی ڈھائی ہو گی۔" ثانیہ مسکرائی تو وہ جھینپ گئی۔
"قسم سے انہوں نے تو دیکھا بھی نہیں مجھے۔"
ثانیہ نے اسے امی اور دادی سے ملوایا۔ دادی کو تو وہ نیک روح اور کوئی فرشتہ ٹائپ شے لگی۔ وہ ثانیہ سے اس کی دوستی پر حیرانگی کا اظہار کر کر کے ثانیہ کا دل جلاتی رہیں۔
"عون کا موڈ کیسا ہے؟" ثانیہ نے سرسری پوچھا تو وہ ہنسنے لگی۔
"وہ تو بھنگڑا ڈال رہے تھے باہر۔" ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔
دادی کی خواہش کے عین مطابق پیلے دوپٹے کی چھاؤں میں ثانیہ کو لا کر سجے سجائے جھولے پر بٹھایا گیا اس کے بعد لڑکے عون کو لائے۔
ثانیہ کا بڑا جی چاہا گھونگھٹ اٹھا کر ایک بار تو عون کے تاثرات دیکھ ہی لے مگر دل مسوس کے رہ گئی۔ ہاں وہ ساتھ آکر بیٹھا تو پہلی بار ثانیہ کا دل عجیب سے انداز اور ایک الگ سی لے میں دھڑکنے لگا۔
سب باری باری تیل مہندی لگاتے اور انہیں مٹھائی کھلا کھلا کے بے حال کر رہے تھے۔
ایہا نے بھی سب کی دیکھا دیکھی بڑے شوق سے یہ رسم ادا کی تھی۔ رات گئے تک سب فارغ ہوئے۔ سب واپسی کے لیے نکلے تو ایہا بھابھی اور امی کے ساتھ ہی حویلی آگئی کہ سارا سامان تو یہیں پڑا تھا۔
شدید تھکاوٹ پر ایک بہترین دن اور بہترین لمحات گزارنے کی خوشی حاوی تھی۔
معیز تو عون کے ساتھ تھا۔ ایہا اپنے کمرے میں آگئی۔ میک اپ صاف کر کے منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔
کمرے کے وسط میں کھڑی وہ تولیے سے منہ خشک کر رہی تھی۔ اس کا بے ساختہ گھومنے کو جی چاہا بلکہ جھومنے کو۔
"زندگی ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ ٹینشن فری؟" مسکراتے ہوئے وہ لائٹ آف کر کے بستر پہ آگئی۔
(یہاں اکیلے۔۔۔ وہیں ثانیہ کے پاس ہی رک جاتی۔) آخری خیال اسے یہی آیا تھا۔ پھر وہ نیند کی وادی میں کھو گئی۔ جانے رات کا کون سا پل تھا۔ جب عجیب سے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے بالکل پاس آکے گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا بے اختیار ایہا کی چیخ نکل گئی۔
آنے والا بھی بدک کر اٹھا۔
اس نے فوراً ہی لائٹ آن کی۔ وہ معیز تھا۔

ایبہا سراسیمہ سی منہ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ معیز نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تم۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔؟" ہونق سے انداز میں معیز نے پوچھا۔ ادھر ایبہا کا تو حلق میں اٹکا دل ہی قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"سو رہی تھی۔۔" سادہ سا جواب۔ معیز کا دماغ گھوما۔

"تم میرے کمرے میں کیوں ہو۔۔؟"

"مجھے تو آنٹی نے اسی کمرے میں رہنے کا کہا تھا۔ میرا سامان بھی انہوں نے ہی رکھوایا تھا۔" ایبہا نے عون کی امی کا حوالہ دیا۔

معیز کو یاد آیا۔ عون خبیث نے اس کا کیا تعارف پیش کیا تھا۔ اب ظاہر ہے میاں بیوی کو وہ ایک ہی کمرہ دیں گے نا۔ ابھی آتے ہوئے بھی عون نے بہت معنی خیزی سے "سویٹ ڈریمز" کہا تھا۔ اب سمجھ آئی تھی۔

نیند سے گلابی ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ سراسیمہ تھی۔ معیز خاموشی سے بیڈ کے کنارے ٹک کر جوتے اتارنے لگا۔ تھکاوٹ اور نیند سے برا حال تھا، اوپر سے عون کی یہ شرارت، مگر اس کا واپس عون کے کمرے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جہاں نجانے کون کون آڑا ترچھا لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ واش روم میں جا کر کپڑے تبدیل کر کے آیا تب بھی وہ یونہی چادر بھینچ کر سینے سے لگائے پریشان سی بیٹھی تھی۔

"سو جاؤ۔ اب تم کیا مراقبہ کرو گی ساری رات۔۔"

معیز نے نارمل سے انداز میں کہا۔ وہ خوامخواہ اس مسئلے کو کوئی "بڑا معاملہ" نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سو اسے بھی پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"آپ۔۔ سو جائیں یہاں۔۔ میں کہیں اور۔۔" وہ جلدی سے نیچے اترنے لگی۔ معیز نے نا چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

"یہ اصل زندگی ہے، کوئی ڈرامے کا سین نہیں۔ کہ میں بیڈ پہ لیٹوں اور تم زمین پہ جا لیٹو۔" ایبہا نے خائف ہو کر اسے دیکھا۔

"اپنی جگہ پر لیٹو اور سو جاؤ۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔۔ آپ کو پرابلم ہو گی۔ میں مینیج کر لوں گی۔" وہ اٹکی۔

معیز نے اسے گھور کے دیکھا۔

"واٹ ڈو یو مین۔۔ مجھے پرابلم ہو گی؟" وہ سٹپٹائی۔

"مطلب۔۔ آپ کھلے ہو کے سو جائیں۔ میری وجہ سے تنگ ہوں گے۔"

اللہ۔۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔

معیز نے اسے اپنے حواس پہ طاری ہوتا محسوس کیا۔ خوب صورتی اور معصومیت مل جائے تو وہ ایبہا مراد بنتی تھی۔

معیز کو جیسے آج ابھی پتا چلا کہ سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ کیسے چاند سا دمکتا ہے اور نیند کا کچا پن لیے گلابی آنکھیں۔۔ ایسا گلابی رنگ تو اس نے سارے رنگوں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کی نظر کے ارتکاز نے ایبہا کی ہتھیلیاں پسیج دیں اس نے کسمسا کر اپنا ہاتھ معیز کی گرفت سے چھڑانے کی سعی کی تو وہ چونکا اور ایبہا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"چلو اب سو جاؤ آرام سے۔"

وہ اپنے اندر کے شور کو دبانے کی خاطر ڈانٹنے لگا۔ ایبہا خاموشی سے اپنی جگہ پہ جا کے بیٹھ گئی۔ لائٹ میں تو وہ

اس کے سامنے بے تکلفی سے نہیں لیٹ سکتی تھی۔
معیز لائٹ آف کر کے نائٹ بلب آن کرتا اپنی جگہ پہ آ کے دراز ہو گیا۔ تب ایہا بھی آہستہ لیٹ ہی گئی۔ شدید تھکاوٹ کے باوجود اس صورت حال کی وجہ سے معیز کو کافی دیر سے نیند آئی۔
کسی کے جھنجوڑنے سے وہ بمشکل آنکھیں کھول پایا۔ وہ اس پہ جھکی پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ معیز کو اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔
مگر اس کا دھلا نکھرا روپ اس قدر دل فریب اور اس کے اتنے قریب تھا کہ نیند ہی کی کیفیت میں بلا ارادہ و بے اختیار ہی معیز نے اس کا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔
معیز کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پتا نہیں کتنے محبت کرنے والے میاں بیوی رہے ہوں۔
اور ایہا۔ اس کی تو مانو سانسیں ہی تھم گئی تھیں۔ زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور ساتھ ہی معیز کے موبائل کی رنگ ٹون نے بجنا شروع کیا۔ تو وہ جیسے چونک کر حواس میں لوٹا۔ تو ایہا کو اپنے پاس۔ بہت پاس پایا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔۔۔
اسے جیسے اپنی بے اختیاری پر یقین نہ آیا تھا۔ ایہا جلدی سے اٹھ کر دوسری طرف چھوکے کھڑی ہو گئی۔ اس کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ معیز نے اٹھا کے دیکھا' عون کی کال تھی۔ خود کو نارمل کرتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔
"جناب عالی۔ اگر زندگی کی حسین صبح طلوع ہو گئی ہو تو باہر آجائیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" عون نے شرارت بھرے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ دانت پیسنے لگا۔
"یہ بہت بے ہودگی کی ہے تم نے عون۔"
"ارے چل۔ ایک تو رومینس کا موقع فراہم کیا' اوپر سے ہم ہی کو طعنے۔" وہ چکنا گھڑا تھا۔ معیز نے موبائل آف کر کے بستر پہ اچھال دیا۔
وہ کچھ سوچ کر چلتے ہوئے ایہا کی طرف آیا۔
"آئم سوری۔ میں نیند میں تھا۔"
"ہوں۔" ایہا نے مارے حیا کے سر نہیں اٹھایا۔
معیز کو ٹوٹ کر کسی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ اور وہ ایہا کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔
"ہمارے درمیان اول روز سے جو معاملہ طے ہے ویسے ہی رہے گا۔ تم میرے راستے میں کہیں نہیں ہو ایہا۔ آئم سوری اگین۔"
وہ محض ایک لمس کے تعلق کو کوئی نام نہیں دینا چاہتا تھا سو سرد مہری سے اسے جتا کر۔ واش روم میں گھس گیا اور ایہا خالی ہاتھ اور خالی دل کھڑی رہ گئی۔



حویلی سے عون عباس کی بارات اور مختصر سے باراتی پوری دھوم دھام سے نکلے اور دلہن کے گھر جا پہنچے۔ ایہا کی چھب آج بھی نرالی تھی مگر ایک حزن تھا جو اس کی خاموش نگاہوں سے چھلکا جاتا تھا۔
پچھلے دو دنوں سے خوامخواہ مسکرانے والے ہونٹ بالکل خاموش تھے اور ساکت۔ معیز کا کئی بار اس سے سامنا ہوا مگر اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر معیز کو نہ دیکھا تھا۔ عون کی ضد پر نکاح کی سنت ادا کی گئی۔
(بچپن کے نکاح کا کیا بھروسا جی)

پتا نہیں کون کون سی رسمیں ہوئیں۔ ہنسی مذاق قہقہے۔ سب خوش تھے۔ ایسے میں ابیہا کی خاموشی کو کون دیکھتا۔

ثانیہ پر دلہناپے کا روپ ٹوٹ کر آیا تھا۔ تو عون بھی اس کی ٹکر کا تھا۔

دادی جان کی اجازت پا کر دلہن کی رخصتی چاہی گئی اور یہ قافلہ واپس ہوا۔ معیز نے آتے ہوئے سامان گاڑی میں رکھ لیا تھا تاکہ دوبارہ حویلی نہ جانا پڑے اور اب بارات کی واپسی تھی۔ معیز کا ارادہ عون کی طرف جانے کا تھا۔

"مجھے گھر ڈراپ کر دیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ابیہا کی آواز میں بھیگا پن تھا مگر معیز چپ رہا۔ وہ اسے آس کا کوئی جگنو تھمانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ آنسو پیتی خاموشی سے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتی رہی۔



دلہن بنی بیٹھی ثانیہ نے جتنی قرآنی آیات یاد تھیں' پڑھ کے خود پہ دم کر لیں بلکہ اپنے گرد حصار بنا لیا۔

عون تو یہی سمجھتا ہے کہ میں اس شادی پہ راضی نہیں ہوں' ایسے میں یوں سج سنور کر اس کا انتظار کرنا۔ کتنا آکورڈ لگتا ہے۔

اسے یکایک دھیان آیا تو وہ جلدی سے اپنا لہنگا سمیٹتی اٹھی اور بستر سے اتر گئی۔

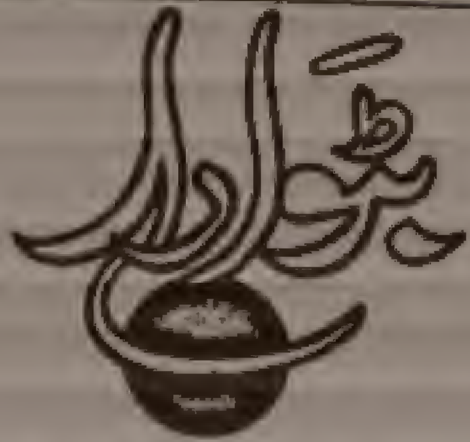
"اوفوہ۔ سینڈل کدھر گئی۔"

اس نے جھک کر دیکھنا چاہا۔ تو لہنگے میں الجھی لڑکھڑائی اور اس سے پہلے کہ زمین بوس ہوتی دو ہاتھوں نے بے اختیار ہی نرمی سے اسے تھام لیا۔

ثانیہ نے کرنٹ کھا کر مقابل کی طرف دیکھا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ان کی اخلاق بٹ



"عروج بھابھی!" گردو پیش سے بے خبر وہ دونوں اپنی ہی باتوں میں مگن تھیں۔ جب دروازہ بجا اور عروج کی نند مشائم نے اندر جھانکا۔

"اندر آجاؤ مشی۔ ان سے ملو۔ یہ سارہ ہے میری بیسٹ فرینڈ۔ ایک بار پہلے بھی آچکی ہے ہمارے گھر۔ مگر تم چونکہ گھر پہ نہیں تھیں۔ اس لیے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ ابھی بھی تم شاید باتھ لے رہی تھیں۔" بولنے کی بے حد شوقین عروج نے بات کے آخر میں اس کے ہلکے نم بالوں کی طرف اشارہ کرکے کہا تو وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے دروازہ دھکیل کر اندر چلی آئی۔ ڈارک میرون کلر کے لباس میں تیار وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ سارہ سے رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد وہ دوبارہ عروج کی طرف مڑی۔

"وہ ایکچوئیلی بھابھی! منال کی شادی کے لیے میں نے اس ڈریس کے ساتھ جو ایر رنگز لیے تھے' ان میں سے ایک کا لاک ٹوٹ گیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے آپ مجھے اپنا جو سیٹ دکھا رہی تھیں' وہ اتفاق سے میرے ڈریس کے ساتھ بالکل میچ ہے تو اگر آپ۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ سرہلاتے ہوئے پھرتی سے اٹھی اور نہ صرف لاکر میں سے اپنا بیش قیمت سیٹ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بلکہ سوٹ کے ساتھ کی میچنگ کچھ اور چیزیں بھی بنا اس کے کہے حاضر کردیں۔ سیٹ پر تو سارہ کی نظریں گویا جم کر رہ گئیں۔ میرون سیٹ پر لگے سفید نگینے گویا ہیروں کی مانند دمک رہے تھے۔

"ارے نہیں بھابھی! مجھے تو صرف یہ سیٹ ہی چاہیے تھا۔ آپ نے خوامخواہ اتنی ساری چیزوں کا ڈھیر لگا دیا اور اس سیٹ کے لیے بھی بہت بہت تھینکس! سچ میں آپ نے تو میرا پرابلم ہی سولو کردیا۔" باقی چیزوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے وہ ممنون سے لہجے میں بولی تو عروج کھل کر مسکرادی۔

"مینشن ناٹ ڈیر! یہ بتاؤ کچھ اور تو نہیں چاہیے آپ کو؟" بیڈ سے چیزیں اٹھا کر وہ الماری میں رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ سارہ نے دیکھا کہ ایک پرخلوص مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

"بالکل نہیں جناب! ساری چیزیں مکمل ہوگئیں۔ اب بس علیشا کی بچی سے اس کا ہینڈ بیگ لینا باقی رہ گیا ہے۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ جانے کے لیے مڑی' لیکن عروج کی آواز پر پھر سے رکنا پڑا تھا۔ اپنی الماری میں سر گھسائے وہ شاید کچھ نکال رہی تھی۔ الماری کے پٹ بند کرکے جب وہ مڑی تو اس کے ہاتھوں میں ایک بے حد اسٹائلش اور برانڈڈ بیگ دیکھ کر مشائم کی آنکھوں میں پہلے ستائش اور پھر کچھ حیرت ابھری۔

"بہت خوب صورت ہے بھابھی۔۔۔ بے حد خوب صورت۔۔۔ مگر یہ آیا کہاں سے؟" نظریں بیگ پر ہی جمائے وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے بھائی صاحب نے کل تحفے میں دیا ہے' مشی ڈارلنگ بھول گئیں کل ہماری دوسری ویڈنگ انی ورسری تھی یار۔۔۔" بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ شوخی سے بولی تو مشائم بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنا تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ سب یقیناً" اس

کی بھابھی کی وسیع القلبی اور اچھائی ہی تھی جو اس جیسی نک چڑھی اور اکھڑ مزاج لڑکی کے ساتھ بھی اس کے تعلقات مثالی اور دوستانہ تھے۔ اس نے ایک بار پھر اس کا پُرجوش شکریہ ادا کیا اور شرارت سے اس کا گال چوم کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سارہ جو ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ مشائم کے باہر جاتے ہی اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور عروج کا بازو کھینچ کر اپنے سامنے بیڈ پر بٹھایا۔

"تم۔۔۔ تم اُلو ہمیں کی۔۔۔ تم نے اپنی اتنی قیمتی اور اچھی چیزیں کس طرح اس کے ایک دفعہ کہنے پر اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ پھر چیزیں بھی وہ جو تم نے خود بھی ابھی تک استعمال نہیں کیں۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ۔۔۔ تمہارے اندر عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟" اس نے شدید حیرت اور اشتعال کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جس پر



اپنی قیمتی نئی اور غیر استعمال شدہ اشیا کسی اور کو سونپ دینے کا کوئی قلق نہ تھا۔

"ہہ۔ بالکل ہے۔ جب ہی تو چیز جتنی بھی مہنگی ہو' میں پروا نہیں کرتی' کیونکہ رشتے ان مادی چیزوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ میرے لیے بھی میرے رشتے ان چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور پھر اس سب میں میرا جاتا کیا ہے؟ چیزیں استعمال کے بعد واپس کر دی جاتی ہیں اور پھر سے میری ہو جاتی ہیں۔ سسرال اور شوہر کی نظر میں میری جو قدر بڑھتی ہے وہ الگ۔ پتا ہے اب یہ مشی گھر میں ایک ایک شخص کو بتائے گی کہ بھابھی نے اپنی نیو برانڈڈ چیزیں میرے ایک دفعہ کہنے پر مجھے دے دیں اور رات کو یہ بات جب وہ اپنے بھائی صاحب کو بھی بتائے گی تو جانتی ہو کیا ہو گا؟ ایسی اور کتنی ہی اچھی اور برانڈڈ چیزیں پھر سے میری الماری کی زینت بن جائیں گی۔" وہ آسودگی سے مسکرائی۔ مگر سارہ اس کے فلسفہ سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔

"جو بھی ہے۔ میں تو اپنی کوئی استعمال شدہ اور دوسرے درجے کی چیز بھی کسی کے پاس برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا تو دل سکڑنے لگتا ہے۔ تم پتا نہیں کون سی احمقوں کی دنیا سے تعلق رکھتی ہو۔" اس کی اس بات پر وہ محض مسکرا ہی سکتی تھی۔ اس لیے مسکرا دی۔

"چھوڑو یار۔ اچھا سنو! تم اپنے آفس کولیگ حذیفہ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں نا۔" اسے پھر سے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی تو اس کا انداز سمجھ کر سارہ نے پہلے تو ایک شکایتی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور پھر سے حذیفہ کاشف کے نام کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔



اس دن اتوار تھا۔ سب گھر والے چچا کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ چچا کے منجھلے بیٹے کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ سارہ کا موڈ نہیں تھا جانے کا اور چونکہ وہ بہت موڈی تھی اور زیادہ تر اپنے موڈ ہی کی مانتی تھی' اس لیے اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ امی نے ایک دو دفعہ کہا بھی اسے ساتھ چلنے کو' مگر وہ نہیں مانی۔ وہ بھی اپنی بیٹی کی عادت اور ضد سے بخوبی واقف تھیں۔ جب ہی انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اپنے کمرے میں لیٹ کر ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب ڈائجسٹ اپنے منہ پہ رکھے وہ اونگھنے لگی تھی۔

"سارہ۔ اٹھو پلیز' میری بات سنو۔" اپنے نام کی پکار پر اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مندی مندی آنکھوں سے تیار کھڑی عمارہ کو دیکھا۔

"مجھے تم سے ایک ریکویسٹ کرنی تھی۔" ہونٹ چباتی انگلیاں مروڑتی وہ کچھ نروس دکھائی دے رہی تھی۔

"ہوں۔ بولو کیا ہے؟" نیند سے بوجھل آواز میں اس نے استفسار کیا۔

"وہ۔ وہ سارہ۔ مجھے آج کے فنکشن کے لیے تمہارا وہ بلیک نیکلس چاہیے جو تم نے پچھلے سال ملتان سے خریدا تھا۔ صرف ایک دو گھنٹوں کے لیے۔ پلیز۔ یقین کرو' فنکشن سے واپس آتے ہی۔" بہن کی شکل پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی نیند سے بری طرح بوجھل اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔

"واٹ؟ کیا کہا؟ نیکلس دے دوں۔ ایک بات بتاؤ عمارہ۔ تم کیا سوچ کر یوں مجھ سے نیکلس مانگنے چلی آئی ہو؟ تم تو یوں فرمائش کر رہی ہو جیسے پہلے بھی میں بخوشی تمہیں اپنی چیزیں سونپتی رہی ہوں۔ یہ نیکلس تو تمہیں میرے مرنے کے بعد ہی مل سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ محض عمیر بھائی کی بیٹی کی سالگرہ کا فنکشن اٹینڈ کرنے کے لیے تو تم مجھے مارنے سے رہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟" مگر دل جلانے والے انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور اطمینان سے اس کے چہرے پر نظریں جما کر اس کی مایوس حالت کا مزہ لینے

بھابھی؟" ائیرپیس سے اس کی چھوٹی نند زوہا کی نرم سی آواز اس کی سماعتوں میں منتقل ہوئی۔

"میں ٹھیک سویٹی۔ آپ سناؤ۔ آپ کیسی ہو اور کیا کر رہی تھیں؟" اسے بھی بادل نخواستہ اخلاق کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

"میں الحمدللہ بالکل فٹ فاٹ ہوں اور جہاں تک بات ہے دوسرے سوال کی کہ کیا کر رہی تھی تو پیاری بھابھی جان! آج کل تو ہم دن رات بس شادی کی تیاریاں ہی کر رہے ہیں' وہ تو شکر ہے کہ کل تک تیاری مکمل ہو جائے گی اور رات تک ہم ان شاء اللہ واپس بھی آجائیں گے۔" اس کے تفصیلی جواب پر وہ مسکرانے لگی۔

"پتا ہے بھابھی! آپ نے ناپ کے لیے جو اپنا ریڈ کلر کا جوتا بھجوایا تھا نا' وہ بے حد خوب صورت اور نفیس ہے۔ یہاں سب ہی کو بہت پسند آیا ہے۔ سب کہہ رہے تھے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دلہن کی پسند کتنی اعلا ہوگی۔" اس کی بات سن کر جہاں اس کی گردن احساس تفاخر سے تنی' وہیں اس نے دل ہی دل میں خود کو اپنی اس چالاکی پر داد بھی دی کہ اس نے جان بوجھ کر ناپ میں اپنا سب سے مہنگا لباس اور جوتا دیا تھا' تاکہ اس کے سسرال والے بری بھی ان چیزوں کے معیار اور قیمت کو دیکھ کر بنائیں' وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ زوہا کی اگلی بات سن کر اس کو دھکا سا لگا۔

"وہ بھابھی! دراصل پرسوں میرے کالج میں فنکشن ہے' آپ کا جوتا مجھے بہت اچھا لگا اور مجھے پورا بھی ہے' اگر آپ اجازت دیں تو میں پرسوں وہ جوتا پہن جاؤں۔ فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد میں جوتا حفاظت سے آپ کے سامان میں رکھ دوں گی۔" ہونے والی نند کی اتنی کڑی فرمائش پر اس کے تو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس وقت اسے وہ نازک رشتہ بھی بھول گیا جو ان دونوں کے درمیان تھا۔

"نہیں زوہا۔ بالکل نہیں۔ میں وہ جوتا آپ کو پہننے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی' وہ میرا سب سے اچھا اور پسندیدہ جوتا ہے۔ پتا بھی ہے اس کی قیمت کتنی ہے؟ پورے ساڑھے تین ہزار کا جوتا ہے وہ۔ آپ لوگ کل جب واپس آؤ تو جوتا مجھے فوراً واپس بھجوا دینا' اوکے۔ مجھے عادت نہیں ہے اپنی چیز کسی سے شیئر کرنے کی۔ ویسے بھی ابھی آپ چھوٹی ہو۔ اتنا مہنگا جوتا پہن کر خراب ہی کرو گی نا۔ فیصل آباد سے جہاں اتنی شاپنگ کی ہے وہیں اپنے لیے ایک جوتا بھی خرید لینا۔ اوکے گڈ بائے۔ میں اب فون رکھتی ہوں' پر ہاں۔ جوتا لازمی بھجوا دینا ڈیئر۔" بے حد تیز لہجے میں بولتے بولتے آخر میں اس نے خیال آنے پر اپنا انداز نرم کیا' جبکہ دوسری طرف فون ہاتھ میں پکڑے ساکت کھڑی زوہا کا وجود اس کے آگ برساتے لہجے اور الفاظ سے جھلس کر رہ گیا تھا۔



اگلے دن سارہ کمپنی کی عمارت میں داخل ہوئی تو سامنے ہی کھڑے حذیفہ کو دیکھ کر اسے بے حد خوش گوار حیرت ہوئی کل شام تک تو وہ فیصل آباد میں تھا اور اب۔ اس نے گنا۔ پورے پندرہ دن رہ گئے تھے شادی میں اور آج وہ جاب سے ریزائن کرنے کے سلسلے میں آئی تھی۔ کسی خوش گوار سوچ کے زیر اثر اس نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا سر جھکا اور چلتے ہوئے نگاہیں اسی پر ٹکا دیں جو تب سے وہیں کھڑا اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھتا' بس دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اس کا انداز نوٹ کیے بغیر اس کے قریب چلی آئی۔

"ہیلو حذیفہ۔ کیسے ہیں آپ؟ اور آج یہاں کیسے؟ آپ تو شاپنگ کے سلسلے میں فیصل آباد میں تھے نا اور واپسی آپ کی غالباً رات کو ہونی تھی۔" وہ بڑے خوش گوار موڈ میں اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی کہ ایک دم حذیفہ نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بے اختیار چونکی اور ایک الجھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی' مگر اس کے تاثرات سنجیدہ اور نہ سمجھ میں آنے والے تھے۔

"یہ۔ یہ کیا ہے حذیفہ؟" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر استفسار کیا۔ نہ جانے کیوں اسے اس کا

لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نیکلس عمارہ کو کتنا پسند آیا تھا‘ مگر اس کے کہنے سے پہلے ہی سارہ وہ نیکلس اپنے نام کر چکی تھی۔ آج اس کے تھوڑی دیر کے لیے نیکلس مانگنے پر بھی اس نے انکار کر دیا تھا۔

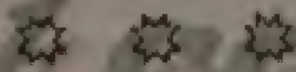
وہ ایسی ہی تھی۔ رشتوں سے زیادہ مادی چیزوں پر جان دینے والی۔ کتنے ہی ایسے واقعات تھے جو اس کی چیزوں سے محبت کا ثبوت ہے۔ چند روپوں کی چیزوں کے لیے کتنی ہی بار وہ اپنے پیاروں کا دل توڑ چکی تھی۔ مگر اسے پروا ہی کب تھی۔ شگفتہ بیگم اس کی اس عادت بلکہ بدعادت سے زیادہ ہی عاجز اور خوف زدہ تھیں۔ انہوں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر بے سود‘ وہ سنتی تو پھر نا۔

ایک دفعہ ایسی ہی کسی بات پر شگفتہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا تھا اور وہ چیخ گئیں۔

”سارہ۔ تمہیں کس طرح سے سمجھاؤں بیٹا کہ اپنی ترجیحات کی ترتیب کو بدلو۔ انسانوں کو انسانوں کی اور چیزوں کو چیزوں ہی کی اہمیت دو بیٹا‘ دونوں کی اہمیت مختلف ہے۔ ان کی جگہیں تبدیل مت کرو۔ تمہاری یہ عادت کتنی بری اور نقصان دہ ہے۔ تمہیں شاید خبر ہی نہیں ہے۔“ وہ اپنا سر پکڑے بڑی بے بسی سے بولی تھیں۔

”کم آن امی! آپ ماؤں کو تو جیسے مرض ہوتا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹینشن لینے کا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس پر آپ فکریں اور اندیشے پالیں۔ بس نہیں ہے مجھے اپنی کوئی چیز شیئر کرنے کی عادت‘ میں اپنی چیزوں کے لیے حد سے زیادہ پوزیسو ہوں۔“ چیونگم چباتے ہوئے اس نے کچھ اتنی بے نیازی سے کہا کہ چند لمحوں تک وہ بول ہی نہ سکیں۔

”اسے پوزیسو ہونا نہیں کہتے بیٹا جی! اسے تنگ دل‘ کم ظرف‘ کمینہ اور مادیت پرست ہونا کہتے ہیں۔“ ان کی بات پر لمحے بھر کے لیے اس کا چیونگم چباتا منہ رکا‘ مگر اگلے ہی لمحے اس نے شان بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔ کیا مجال کہ ذرا سا بھی اثر ہوا ہو اس پر۔



ایم اے اکنامکس کرنے کے بعد وہ ایک کمپنی میں جاب کرنے لگی تھی‘ ایک روز اسی کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز اس کے کولیگ حذیفہ کاشف کا اس کے لیے پرپوزل آگیا۔ گو کہ وہ پہلے ہی سے حذیفہ کی اپنے لیے پسندیدگی بھانپ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے جیسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اتنا اچھا‘ ویل اسٹیبلشڈ اور ہینڈسم لڑکا بھلا برا کیسے لگ سکتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی دل ہی دل میں اسے بے حد پسند کرتی تھی۔ حذیفہ کے والدین نہیں تھے‘ والد چند سال پہلے ایر کریش میں جاں بحق ہوگئے تھے اور ابھی چھ ماہ قبل ہی ان کی فالج زدہ ماں کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ خاندان کے نام پر صرف دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی تھا‘ رسمی کارروائی اور چھان پھٹک کے بعد اس کے رشتے کو ہاں کہہ دی گئی۔ کب منگنی ہوئی اور کب شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہوگئی۔ پتا ہی نہ چلا۔ مارچ کے مہینے کا آخری عشرہ چل رہا تھا اور شادی اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو تھی۔

تیاریوں کے سلسلے میں بازار کے چکروں نے سب ہی کو ہلکان کر رکھا تھا‘ مگر شاپنگ اور نت نئی قیمتی چیزوں کی شوقین سارہ کو تو جیسے تھکن چھو کر نہیں گزرتی تھی۔ اسے تو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کی نندیں گھر میں کسی بڑے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شادی کی شاپنگ فیصل آباد جا کر اپنی خالہ کے ساتھ کر رہی تھیں اور یوں وہ بازار میں گھوم پھر کر اپنی پسند کی چیزیں خریدنے سے محروم رہ گئی تھی۔

اس شام بازار سے واپس آکر ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ اس کی نند زریاب کا فون آگیا۔

”بھابھی! ایک منٹ رکیے ذرا... زوہا بھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد اس نے فون بند کرنا چاہا تو زریاب جلدی سے بولی‘ جس پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا۔ دونوں بہنوں میں ایک سال کا فرق تھا اور دونوں ایک ہی کالج میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھیں۔

”ہیلو۔ السلام علیکم! میں زوہا۔ کیسی ہیں آپ

انداز بڑا کھٹک رہا تھا۔

"تمہاری امانت ہے یہ۔ وہ سب چیزیں جو تم نے میری بہنوں کو بطور ناپ دی تھیں اور ہاں دھیان سے، اس میں تمہارا ساڑھے تین ہزار کا جوتا بھی ہے۔ وہی جوتا جو کل تم نے بڑی بے مروتی سے زوہا کو کالج پہن کر جانے سے روک دیا تھا 'بھئی' آخر تمہیں اپنی چیزیں شیئر کرنے کی عادت جو نہیں ہے۔"

اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اپنے دوسرے ہاتھ سے اس میں شاپنگ بیگ تھماتے ہوئے وہ کچھ اس انداز میں بولا کہ سارہ کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ بیگ تھما کر وہ سیدھا ہوا اور کتنے ہی لمحے اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں کا سامنا کرنا اس وقت سارہ کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگا تھا۔

"پتا ہے سارہ! اپنے والدین کے بعد میں اپنی بہنوں اور بھائی کا واحد سہارا ہوں۔ وہ سہارا جس کے سہارے وہ پھر سے زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں 'یعنی ان کا بڑا بھائی زمانے کی سختیوں اور مصائب کے خلاف ان کے آگے ڈھال بن جاؤں گا۔ آسان نہیں تھا۔ سارہ ہمارے لیے ممی کی ڈیتھ کے بعد خود کو سنبھالنا' مگر ہم نے یہ کام بھی ایک دوسرے کے لیے انجام دے ہی دیا۔ میں اگر انہیں محبت' توجہ اور ضروریات زندگی فراہم کر رہا ہوں تو بدلے میں وہ بھی میری خدمت' حوصلہ افزائی اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے اپنا ہر رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔ ہم اب ایک دوسرے کے لیے سب کچھ ہیں۔ تم... ختم سارہ! تم میری پسند تھیں۔ جسے میں نے بڑی محبت سے' بڑے مان سے اور خاصی توقعات کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا تھا۔ سوچا تھا' تم میرے گھر کو پھر سے گھر بنا دو گی' میری چھوٹی بہنوں کو کبھی ان کی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دو گی کہ آخر بھابھی بھی تو ماں ہی ہوتی ہے نا۔ مجھے لگا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو اس محبت میں میرے بہن' بھائی کو بھی اپنا ہی سمجھو گی اور انہیں وہ محبت اور شفقت دو گی جس کے وہ تم سے طلب گار ہیں۔ مگر... مگر تم تو پیسے اور مادی اشیا سے محبت کرنے والی ایک عام اور سطحی سی لڑکی نکلیں سارہ۔ جس کی ترجیحات کی فہرست میں چیزیں پہلے اور انسان بعد میں آتے ہیں۔ کل تم نے جس انداز میں زوہا کو محض تھوڑی دیر کے لیے اپنا ایک جوتا پہننے کے لیے سختی سے منع کر دیا۔ اس سے نہ صرف میرا اندر زخمی ہو گیا' بلکہ مجھ پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ تمہارے نزدیک — ایک جوتے کی قدر بھی میری بہنوں سے زیادہ ہے۔ سو میں نے درست وقت پر ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا سارہ۔ میں نے ایک غلط اور سطحی لڑکی کا انتخاب کیا۔ جس کے نزدیک جذبات' احساسات اور رشتے بالکل بے معنی تھے۔ اگر تم میری بہنوں کے ساتھ اپنی کوئی چیز شیئر نہیں کر سکتیں تو سوچو میری بہنیں تو تمہارے ساتھ اپنا بھائی شیئر کر رہی تھیں۔ وہ تو شاید مجھے یہ بات کبھی نہ بتاتیں اگر جو میں خود اپنے کانوں سے فون پر تمہاری گفتگو اور انداز نہ سن لیتا' یاد رکھنا سارہ! جس دن تم نے چیزوں کی قربانی دینا سیکھ لی اسی دن تم لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گی۔ او کے... ہمیشہ کے لیے خدا حافظ..."

ایک آخری بے حد کٹھیلی نگاہ اس پر ڈال کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

جبکہ اس کی حالت تو یوں تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ساکت کھڑی وہ کتنی ہی دیر تک اس جگہ پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی' جہاں ابھی کچھ دیر قبل اس کے قدم تھے اور پھر جب آنکھوں کے آگے آنے والی آنسوؤں کی چادر نے کچھ دیکھنے کے قابل نہ چھوڑا تو وہ وہیں قریب رکھی کرسی پر ڈھے سی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



حیا بخاری

ایک خط

کسی نے دروازہ اتنے زور سے دھڑ دھڑایا کہ میرا نازک سا دل سینے کے پنجرے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ ہاتھ میں چھری سبزی جو بھی تھا اچھال دیا۔ کدھر، کس طرف کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس یا اللہ یا رحمٰن کا ورد کرتی دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔

"یہ کیا۔ ابھی تو آپ گئے تھے۔ ابھی واپس بھی آگئے۔ خیریت تو ہے ناں۔"

میاں صاحب کو دیکھ کر بس ٹینشن کی ہمیشہ والی ٹینشن شروع۔ میاں صاحب ہانپتے ہوئے گیراج کے سامنے پڑی پلاسٹک چیئر پہ ڈھے سے گئے۔ دل مزید ہول گیا۔ لوجی ٹھنڈے پسینے شروع۔ بی پی لو۔ وہیں زمین پہ ہی بیٹھ گئی۔ میاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری حالت سمجھ گئے۔ اٹھ کر فوراً" پاس آئے۔

"تمہارے لیے خط آیا ہے۔ بس وہی دینے آیا تھا۔ تم تو خوامخواہ پریشان ہو جاتی ہو۔" وہ ساتھ ہی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

"ویسے خط بعد میں نہیں لاسکتے تھے۔ جس انداز میں لائے ہیں وہ تو ہے ہی پریشان کن۔" میں خفا ہوئی۔

"ارے ایسا ویسا خط تھوڑی ہے۔ خواتین کی طرف سے ہے۔" خوشی ان کی آواز سے زیادہ ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"ہائے اللہ سچ میں۔" میں پوری قوت سے اچھلی۔ وہ بے چارے پیچھے جاگرے۔ مگر مسکرا دیے۔

"بس یہی حال میرا ہوا تھا۔ اچھا سوال نامہ ہے سروے کے لیے۔ جلدی جلدی سوال کے جواب سوچو۔" وہ بے چین تھے۔

"آپ نے پڑھ بھی لیا۔" میں نے آنکھیں دکھائیں۔

"ہاں تو تم بھی تو میرا FB پاس ورڈ جانتی ہو۔ اور چار مرتبہ چیک کرتی ہو میرا اکاؤنٹ۔" انہوں نے بھی آنکھیں دکھائیں اور میں۔

"بس رہنے دیں نا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔"

"اچھا ابھی تو مجھے خط دیکھنے دیں۔ پھر آرام سے جواب لکھیں گے۔" میں نے خط کھول کر دیکھا۔ اور بس دیکھتی ہی رہی عقیدت سے۔

سات دن ہو گئے۔ مگر میرا خط کو دیکھ دیکھ کے ہی جی نہ بھرا۔ میاں صاحب بھی دن میں دو مرتبہ تو ضرور مانگ کے پڑھتے اور مشورے بھی دیتے۔ مگر میں لکھنے پہ تیار ہوں تب نا۔

"کیا لکھوں۔" ساتویں دن اٹھتے ہی میاں صاحب نے یاددہانی کروائی۔ میں روہانسی ہو گئی۔

"کیا لکھوں۔ مجھے خط لکھنا نہیں آتا۔ اگر انہوں نے ریجیکٹ کر دیا تو؟"

"تو بھی پورے ملک میں بینر تو نہیں لگا دیں گے۔ تم لکھو تو۔" وہ بضد ہوئے میرے قلم سے اپنے کان کھرچتے ہوئے۔

"اچھا میرا قلم تو دیں ناں۔"

"او سوری۔ میں نے سوچا میں بھی تمہاری ہیلپ کرا دوں۔" وہ سر کھجا کر رہ گئے۔ "رہنے دیں آپ سے کبھی ہیلپ ہوئی بھی ہے۔"

"اچھا جناب۔ سب سے پہلا قاری تو میں ہی ہوتا ہوں تمہارے افسانے کا۔ اور پھر پوسٹ بھی تو میں ہی کرتا ہوں۔" میں نے فوراً" کان پکڑ لیے۔ "ویسے سچ بتاؤ، پہلی تحریر کے وقت تمہیں کیا محسوس ہوا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ میں بھی چند سال پیچھے چلی گئی۔

"تمہاری پوری فیملی ان رسالوں کی دیوانی ہے۔ خصوصاً" امی کو مجھ میں یہ ہنر نظر آتا تھا۔ اور ان کی خواہش تھی کہ کبھی میں بھی اس ادارے کے لیے لکھوں۔ میں اپنی وجہ سے ان کی آنکھوں اور چہرے پہ وہ خوشی دیکھنا چاہتی تھیں۔ جو مجھے لگتا میری تحریر سے ضرور انہیں ملے گی۔

میں نے تحریر بھیجی تو سبھی نے مذاق اڑایا کہ واپس آجائے گی۔ کیونکہ خواتین میں منجھی ہوئی رائٹرز کو ہی جگہ ملتی ہے۔ بس میں نے بھی خود ہی سے عہد کرلیا۔ کہ پہلی کہانی چھپے گی تو صرف خواتین میں ورنہ لکھنا چھوڑ دوں گی۔ ان دنوں میں شدید بیمار تھی اور مزید پریشان ہوئی کہ اگر شائع نہ ہوئی تو۔ لیکن خیر۔ میں نے خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا اور تحریر شائع ہوگئی۔"

"اور تمہاری یہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے والی عادت ہی تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔" میاں صاحب نے فخر سے کہا تو میں نے خود کو مزید پھولتا محسوس کیا۔

"اچھا اب اور مت پھولو۔ دوسرے حصے کا جواب لکھو۔" انہوں نے خود ہی غبارے سے ہوا نکال دی۔



میں منہ بنا گئی۔

"پذیرائی کا بس اتنا اندازہ تھا کہ یہاں امی اور فیملی سب بہت خوش ہوں گے۔ مگر اس وقت میری کیا حالت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب میرے اساتذہ' میری دوستوں اور شہر کے لوگوں نے میرا نمبر ڈھونڈ کر مجھے مبارکباد دی۔ میری تعریف کی۔ مجھے سراہا۔ مجھے تب ہی پتا چلا کہ میری تحریر خواتین میں آئی ہے۔ پھر کیا تھا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنا شروع۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔" میری پلکیں آج بھی بھیگنے لگیں وہ سب یاد کر کے۔ میاں صاحب نے مجھے خود سے لگا لیا۔

"میری طرف سے عنیزہ سید کا نام لکھ دینا۔" میں نے پسندیدہ رائٹرز میں اپنی تمام رائٹرز کا نام لکھا' جیسے شازیہ چوہدری' راحت جبیں' عالیہ بخاری' نگہت عبداللہ تو میاں صاحب نے بھی لقمہ دیا۔

"جی' جی۔ یہ نام بھی شامل ہے۔ فکر نہ کریں۔" میں مسکرائی۔ اور خواتین کے علاوہ اپنے پسندیدہ رائٹرز لکھنے لگی۔

"اشفاق احمد' ہاشم ندیم اور ابن صفی"

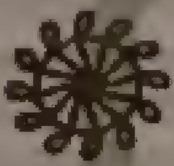
"کمال ہے تم تو بہت گہری کتابیں پڑھتی ہو۔" میاں صاحب کو آج پتا چلا اور میں آخری سوال پر پریشان۔ "کیا لکھوں"

"ٹھیک ٹھیک لکھ دو کہ سوائے فراغت کے سب کر لیتی ہو۔" گھنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مسکرائے۔ میں تیزی سے قلم چلانے لگی۔

"صبح نماز کے بعد کچھ وقت اکیلے گزارنا بے حد پسند ہے اس کے بعد ہاؤس وائف والی ساری ذمہ داریاں سنبھالتی ہوں۔ جیسے بچوں' اماں اور میاں کے لیے ناشتا تیار کرنا' پھر بچوں کو اسکول اور میاں کو آفس بھیجنا' اماں کے ساتھ بھی وقت گزارنا' صفائیاں' کپڑے دھونا' کھانا پکانا' سب گھریلو کام' درمیان میں ایک گھنٹہ فارغ ملتا ہے جو مطالعے میں گزرتا ہے۔ پھر سے کام میں لگ جاتی ہوں۔ جو رات نو تک چلتے ہیں۔ نو بجے کے بعد کچھ لکھتی ہوں یا پڑھتی ہوں۔ دس بجے تلاوت کر کے خود کو تسکین دیتی ہوں اور گیارہ تک لازمی سو جاتی ہوں۔ ٹی وی' فلم' میوزک چھوڑ دیے ہیں۔ جب سے ہجرت کی۔ تعلیم شادی کے بعد مکمل کی۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز اور ایجوکیشن میں بیچلر کیا ہے۔

"اوہ جی' ٹینشن ختم۔ شکر میرے مالک کا میں نے خط لکھ ہی لیا۔" میری یہ حالت دیکھ کر میاں جی مسکرا دیے۔

"میری طرف سے بھی سالگرہ مبارک کہہ دینا۔ تم تو جانتی ہو نا خواتین میرا بھی اپنا رسالہ ہے۔" انہوں نے کہا تو میں کھل کے مسکرا دی۔ اس میں بھی کوئی شک تھا بھلا؟ وہ میری طرح اس رسالے کے دیوانے ہیں۔



مبارک باد

10 اپریل کی ایک سہانی شام میں مقبول مصنفہ نازیہ کنول نازی بابل کا آنگن سونا کر کے پیا کے گھر سدھار گئیں۔

اس پُر مسرت موقع پر ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد۔

ہماری دعا ہے کہ زندگی کا یہ خوب صورت موڑ اور ان کا ہم سفر ان کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)



اور تو کچھ بھی نہیں

اور تو کچھ بھی نہیں
ہاں بس
ایک بار کھل کے رونا چاہتی ہوں
اور تو کچھ بھی نہیں
ہاں بس
ایک بار تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی
ہوں
اور تو کچھ بھی نہیں
ہاں بس
ایک بار صرف
ایک بار تم سے بھرپور نفرت کرنا چاہتی
ہوں۔

نجمہ نسیم

ربط و ضبطِ باہم میں دخل ہو کسی کو کیا
جان بھی چلی جائے اُس کے واسطے سو کیا

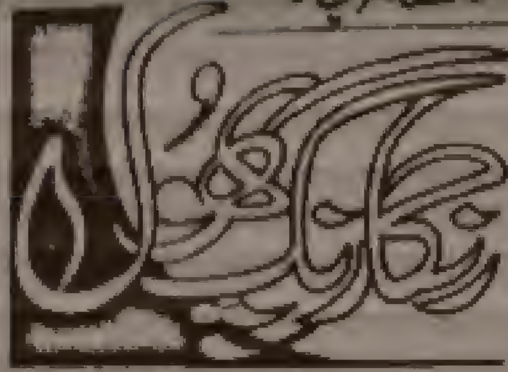
راز داں بتا آخر تجھ کو تو خبر ہو گی
میرا نام سُن کے بھی سوچتے رہے وہ کیا

دوست داریوں میں بھی کلفتیں تو ہوتی ہیں
کتنے لوگ بچھڑے ہیں، تم بچھڑ گئے تو کیا

بے خبر کہ مرتے ہو ایک آفتِ جاں پر
پھر سے اِن دنوں ناصر باؤلے ہوئے ہو کیا

ناصر زیدی

شگفتہ گاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی رکھے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1- پردہ پوشی سے مراد کسی کے گناہ یا عیب کو ظاہر کرنے اور اس کی تشہیر سے اجتناب کرنا ہے۔

2- کوئی انسان عیب اور غلطی سے پاک نہیں، لہٰذا دوسروں کو بدنام کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3- آخرت میں پردہ رکھنے کا مطلب اس کے گناہوں کی معافی ہے۔

4- کسی پر احسان کرنے کا اچھا بدلہ دُنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ انسان دوسروں سے جس قسم کا سلوک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔

کیا فائدہ،

معافی بن سلیمان اپنے دوست کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ دوست نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"آج کتنی سردی ہے۔"

معافی نے کہا۔ "اب تمہیں گرماہٹ مل گئی ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں۔"

اس پر معافی نے کہا۔ "پھر مذمت کرنے کا کیا فائدہ۔ اگر سبحان اللہ کہہ دیتے تو بات بھی تھی۔"

بددُعا،

امیرالمومنین محمد امین کو اپنی ایک کنیز سے بہت محبت تھی۔ اس کا نام غادرہ تھا اور حسن و جمال کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔

امین اس کی محبت میں اکثر اس سے کہتا کہ مجھے یہ خوف ہے کہ میں مر گیا تو مامون دولت کا لالچ دے کر تمہیں اپنے نکاح میں لے آئے گا۔

غادرہ اس کے جواب میں قسمیں کھا کر یقین دلاتی کہ وہ اس کے سوا زندگی میں کسی کی صورت نہیں دیکھے گی۔

چند ہی روز بعد امین مارا گیا اور مامون خلیفہ بنایا گیا۔ غادرہ کے حسن کا چرچا پہلے ہی تھا، مامون نے اس کو نکاح کا پیغام بھجوایا جو اس نے قبول کر لیا۔

نکاح کے بعد پہلی رات تھی۔ غادرہ، مامون کے پہلو میں سو رہی تھی۔ اس نے خواب دیکھا، مامون اس کے سرہانے کھڑا غادرہ کو مخاطب کر کے وعدہ خلافی پر موت کی بددُعا دے رہا ہے۔

غادرہ نے چیخ ماری اور جاگ اٹھی۔ مامون کو سارا واقعہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صبح کو مامون نے دیکھا کہ امین کی بددُعا پوری ہوئی اور غادرہ بستر پر مردہ پڑی تھی۔

فارسی دان،

شاہ ایران کی خاطر گورنر ہاؤس لاہور میں قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ ایک قوال نے امیر خسرو کا فارسی کلام گانا شروع کیا تو شاہ ایران نے پوچھا۔

"یہ کس زبان میں گا رہے ہیں؟"

رخسانہ رخشی۔ السہ ملک ملتان

رام کہانی،

ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے اور بیوی

سے بولے۔
"کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اتنی دیر تک کہاں رہا تھا؟"
بیوی بولی۔ "بالکل اندازہ لگا سکتی ہوں تاہم تم اپنی کہانی بھی سنا ڈالو۔"

محبت،

محبت ایسا پودا ہے جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

ثمرین اکرام۔ میر بلوچ خاص

تعمیل،

مغل بادشاہ شاہجہان کے انتقال کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عالمگیر اور دوسرے کا نام دارا شکوہ تھا۔ دونوں میں تخت نشینی کے لیے رقابت پیدا ہو گئی۔

عالمگیر کو اپنے والد کی جانشینی اور بادشاہت کی طلب تھی اور اس کے بھائی دارا شکوہ کو بھی بادشاہت کرنے کی خواہش تھی۔ ریاست کے جو بڑے لوگ تھے ان میں سے کچھ دارا شکوہ اور کچھ عالمگیر کے حق میں بات کرتے تھے۔ کیونکہ عالمگیر ایک نیک دل انسان تھا جبکہ دارا شکوہ کے کچھ نظریات شریعت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اس کے ہاتھ اقتدار آنے سے ملک کے اسلامی تشخص کے لیے خطرات تھے۔ ان کے زمانے میں ایک مشہور بزرگ تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ دونوں بھائیوں کو ان بزرگ کے پاس بھیجتے ہیں۔ وہ جس کو سلطنت کا بادشاہ بنائیں گے ہمیں منظور ہوگا۔ دونوں بھائیوں نے بھی یہی ارادہ کیا کہ ان بزرگ کے پاس جا کر اپنے حق میں دعا کرائی جائے اور وہ جو فیصلہ کریں، اسے قبول کیا جائے۔

پہلے دارا شکوہ ان بزرگ کے پاس دعا اور زیارت کے لیے پہنچا۔ اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دارا شکوہ کو تخت پر بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے کہا۔
"میں نیچے ہی ٹھیک ہوں۔"
اس کے بعد عالمگیر آئے۔ وہ جب نیچے بیٹھنے لگے تو بزرگ نے فرمایا۔
"تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔"
وہ فوراً اٹھے اور تخت پر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے انہیں کچھ نصیحت فرما دی۔
جب عالمگیر واپس چلے گئے اور لوگوں نے بزرگ سے پوچھا۔
"آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
انہوں نے کہا۔ "ان دونوں بھائیوں نے اپنا فیصلہ خود کر لیا۔ دارا شکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور عالمگیر کو پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ اب تخت شاہی عالمگیر کو ملے گی۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے تو چاہے اس پر عمل کرنا ادب کے خلاف ہی معلوم ہو رہا ہو مگر اس کی تعمیل کرنی چاہیے کہ اسی میں بھلائی ہے۔ مقولہ مشہور ہے۔
"حکم کا درجہ ادب سے بڑھ کر ہے لیکن یہ بھی لازم ہے کہ بزرگ کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو۔"

تمہیں کیوں دوں،

ایک امریکی کروڑ پتی سے ایک خیراتی ادارے کا رضا کار چندہ مانگنے آیا۔ رضا کار پوری تیاری کر کے گیا تھا۔ کروڑ پتی سے کہنے لگا۔
"جناب! ہماری اطلاع کے مطابق فلاں بینک میں آپ کے اتنے کروڑ اور فلاں بینک میں اتنے کروڑ جمع ہیں۔ فلاں ریاست میں اتنی زمین اور فلاں شہر میں اتنی عمارتیں ہیں۔ بے شمار کارخانوں میں آپ حصے دار ہیں۔ مگر آپ نے کبھی کسی خیراتی ادارے کو کچھ نہیں دیا۔"
کروڑ پتی نے بڑے تحمل سے ساری بات سنی اور پھر خیراتی ادارے والے سے کہنے لگا۔
"تمہاری معلومات مکمل طور پر درست ہیں۔ مگر کیا

تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میری ماں فلاں شہر میں اکیلی رہتی ہے۔ اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں؟"

رضا کار بولا۔ "نہیں جناب، مجھے علم نہیں۔"

کروڑپتی نے کہا۔ "اور کیا تمہیں علم ہے کہ میرا ایک بھائی معذور ہے، جو خود کچھ نہیں کما سکتا۔"

رضا کار شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "نہیں سر! مجھے پتا نہیں تھا۔"

کروڑپتی نے کہا۔ "اور کیا تمہیں پتا ہے کہ میری بہن، اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کا کمانے والا بھی کوئی نہیں۔"

رضا کار بولا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے پتا ہوتا کہ آپ پہلے ہی اتنے لوگوں کو پال رہے ہیں تو میں قطعاً آپ کے پاس نہ آتا۔"

کروڑپتی گرج کر بولا۔ "یہ بات نہیں، اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ان عزیز رشتے داروں کو کچھ نہیں دیتا تو تمہیں کیوں دوں۔"

دعا شاہد۔ کراچی

نیکی،

نیکی بیج کی طرح ہوتی ہے۔ آپ آدھ تولے کا لے بیج بوتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ اس بیج میں سے ایک کونپل نکلتی ہے اور یہ کونپل آگے چل کر سینکڑوں ٹن کے درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان زمین میں پچیس تیس فٹ کا درخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر شخص با آسانی سینکڑوں، ہزاروں درختوں کے بیج بو سکتا ہے۔

(زیرو پوائنٹ 3 جاوید چوہدری)

شکر پارے،

٭ مستقبل بین لڑکی ماضی پرست مرد سے نفرت کرتی ہے۔ (ایون ایسار)

٭ اگر آپ ایک خوبصورت اور دلکش عورت میں فرق جاننا چاہتے ہیں تو یاد رکھیے، خوبصورت عورت وہ ہے جس پر آپ کی نظر پڑتی ہے اور دلکش عورت وہ ہے جس کی نظر آپ پر پڑتی ہے۔

(ایڈلائی سٹیونسن)

٭ اگر آپ ایک پونڈ پر ہی راضی ہو جائیں تو ایک لاکھ پونڈ کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔

(برائن ولنپر)

ارم کمال۔ فیصل آباد

آزادی،

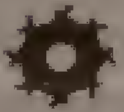
- آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہے۔ (روسو)
- انسانی آزادی کو پامال کرنے کے لیے ہمیشہ نظریۂ ضرورت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ آمروں کی دلیل ہے اور غلاموں کا مذہب ہے۔

(ولیم پٹ)

- انسانی عظمت اور مسرت کے لیے شخصی آزادی سب سے ضروری ہے۔

(بل وڈلیش)

لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں



اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تنزیلہ ریاض "عہد الست" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ ان کی قسط شامل نہیں ہے۔ اس کے لیے قارئین سے معذرت۔

ان شاء اللہ آئندہ ماہ بہنیں "عہد الست" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

امت الصبور

خالدین کی ڈائری

اسیر گل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ خوبصورت غزل آپ سب قارئین کی نذر۔

یاد کہاں رکھنی ہے، تیرا خواب کہاں رکھنا ہے
دل میں یا پھر آنکھوں میں مہتاب کہاں رکھنا ہے

گھر اور آنگن دونوں ہی تقسیم کی نذر ہوئے ہیں
تجھے کہاں ٹھہرانا ہے، اسباب کہاں رکھنا ہے

جو کچھ تھا، سب بانٹ دیا ہے، جو ہے تم لے جاؤ
سُود و زیاں کا ہم ایسوں نے حساب کہاں رکھنا ہے

وہ کہتا ہے آخری باب عشق مکمل کر لیں
اور میں سوچ رہا ہوں، پہلا باب کہاں رکھنا ہے

حسن کی یکتائی کا بس اتنا احساس ہے مجھ کو
کانٹوں کی ترتیب میں، ایک گلاب کہاں رکھنا ہے

عتیقہ فاطمہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ نظم لکھنے میں امجد اسلام امجد کو جو ملکہ حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور کو حاصل ہو۔ آپ سب کی نذر۔

میں نے ٹھیک کیا ہے نا...؟

کہتے ہیں جب گھر میں اچانک
ایسی آگ بھڑک اٹھے
جو چشم زدن میں
ہر اک شے کو اپنی لپیٹ میں لے لے
آگ بجھانا مشکل ہو اور
گھر کا اثاثہ اس سے بچانا ناممکن ... تو
ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے

جو بچتا ہے، وہی بچاؤ
گھر کی سب سے قیمتی چیز ہاتھ میں لو اور
اس سے دُور نکل جاؤ
میرے دل میں بھی ایسی ہی آگ لگی ہے
میں نے جلدی جلدی آنکھ میں تیرے بجھتے خواب سمیٹے
تیری یاد کے ٹکڑے چن کر دھیان میں رکھے
اور اس آگ میں دل کو جلتا چھوڑ کر دُور نکل آیا ہوں
میں نے ٹھیک کیا ہے نا...؟

قرۃ العین کیانی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب کے نام۔

بہت فرسودہ لگتے ہیں مجھے اب پیار کے قصے
گل و گلزار کی باتیں، لب و رخسار کے قصے

یہاں سب کے مقدر میں فقط زخم جدائی ہے
سبھی جھوٹے فسانے ہیں وصال یار کے قصے

بھلا عشق و محبت سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے
سنو تم کو سناتا ہوں میں کاروبار کے قصے

میرے احباب کہتے ہیں یہی اک عیب ہے مجھ میں
سر دیوار لکھتا ہوں، پس دیوار کے قصے

میں اکثر اس لیے جا کر لوگوں سے خود نہیں ملتا
وہی بیکار کی باتیں، وہی بیکار کے قصے

خالدہ جیلانی



اُمِ عسید، روبینہ عتیق ———— کبیروالا

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
بادل کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

نمرہ کشور ———— میلسی

اور کچھ روز یہ چہرہ ہے، یہ آنکھیں ہیں، یہ خواب
اور کچھ روز رہے گا یہ تماشا ہم سے

صائمہ جبیں ———— کراچی

تیرے روز و شب کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں دن ہے نہ رات

فروا، ثانیہ یعقوب ———— کبیروالا

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی جاتی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

حنا سلیم اعوان ———— آخون بانڈی

میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو!
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

کنزیٰ شاہین ———— آخون بانڈی

کوئی موجِ گل سے کہہ دے نہ چلے مچل مچل کے
وہ نظر بدل گئی ہے، میری زندگی بدل کے
شبِ ماہ مختصر تھی، مجھے ہائے کیا خبر تھی
کہ طلوع پھر نہ ہو گا میرا ماہتاب ڈھل کے

سونیا حسین ———— قتال پور

نہ جانے کس کو پسند آگئی ہے میری آنکھوں کی نمی بلاشبہ
میں ہنسنا بھی چاہوں تو یہ پلکیں بھیگ جاتی ہیں

فرحت اشرف گھمن ———— سیدوالا

وہی منصف، وہی قاتل، عدالت اس کی وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرف داری بھی ہوتی ہے

ثناء عابد ———— ناروووال

جو ہم کلام ہو ہم سے، اسی کے ہوتے ہیں
ہم ایک وقت میں ایک آدمی کے ہوتے ہیں

نمرہ، اقرار ———— کراچی

کوئی جہاں میں خوشی سے گزارنا چاہے
تو بے شمار بہانے خوشی کے ہوتے ہیں

نخبہ اکرم ———— گاؤں گوکلی

جمالیات کے پرچے میں آٹھ نو نمبر
فقط شگفتگی و دل کشی کے ہوتے ہیں

ثناء عبدالقیوم ———— بنکہ چیمہ

یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

پاکیزہ ہاشمی ———— بہاول پور

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہو گا
ہمارے بیچ جو حائل ہے، وہ حقیقت ہے
سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

نازیہ سرور ———— لاہور

مجھے چپ لگی ہے مدعا کہتے کہتے
رُکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا تھا
فسانۂ دلِ زار کا کہتے کہتے



ہر دلِ عزیز فنکارہ

صباحت بخاری سے ملاقات

شاہین رشید

ہماری فنکارائیں جب مڈل ایج میں آتی ہیں تو فیلڈ سے کنارا کشی اختیار کرلیتی ہیں کہ انہیں ماؤں کے رول کرنا پسند نہیں ہوتا' مگر اگر عمر کی حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے تو نہ صرف انسان فیلڈ میں آن رہتا ہے بلکہ اس کی عزت و توقیر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ صباحت بخاری بہت ینگ ایج میں اس فیلڈ میں آئیں' اچھا کام کیا۔ اپنے آپ کو منوایا اور پھر ینگ ایج میں ہی ماں کے رول کرنے لگیں۔ کیونکہ انہیں اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ کام کو اہمیت دیتی ہیں نام کو نہیں' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "صباحت بخاری" کا بہت نام ہے۔ یہ بہت کامیاب فنکارہ ہیں۔

"جی صباحت! کیسی ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک' اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟ کیا انڈر پروڈکشن ہیں اور کیا آن ایر ہیں؟"

"اس وقت تین ڈرامے "آن ایر" ہیں اور تین ہی انڈر پروڈکشن ہیں تو مصروفیات تو ڈراموں کے حوالے سے ہی ہے۔"

"مجھے یاد ہے کہ بہت ینگ ایج سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔ پہلے آپ ہوسٹ تھیں اور پھر ڈراموں میں آئیں۔ اب مزید تفصیلات آپ بتائیں؟"

''اس فیلڈ میں آنے کا شوق تو مجھے بہت ینگ ایج سے ہی تھا۔ فیلڈ میں آنے کی اجازت تو پھر بھی مل گئی تھی' مگر ڈراموں میں کام کرنے کی بالکل بھی اجازت نہیں تھی فیملی کی طرف سے۔ خیر ڈراموں میں کام کرنے کا شوق تو مجھے بعد میں ہوا البتہ نیوز پڑھنے کا بہت شوق تھا مجھے۔ تو کسی کے ذریعے سے میں پی ٹی وی گئی نیوز کاسٹر کے آڈیشن کے لیے' مگر میرا بیڈ لک کہ نیوز کاسٹرز کے لیے ان کے آڈیشن مکمل ہو چکے تھے' لیکن اس وقت کے پی ایم ''اعظم خورشید صاحب اور جی ایم رفیق وڑائچ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ تھوڑی لیٹ ہو گئی ہیں' کیونکہ نیوز کاسٹرز کا انتخاب تو ہو چکا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بہ حیثیت اناؤنسر کے آپ ہمارے یہاں کام کریں تو ہمیں خوشی ہوگی'' تو بس میرا تو یہ حال تھا کہ ''اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں'' تو جب آفر آئی تو میں نے فوراً ''ہاں'' کردی۔ یہ بات ہے 1989ء کی۔ بہت اچھا تجربہ رہا اناؤنسمنٹ کا اور تقریباً'' ایک یا ڈیڑھ سال میں نے پی ٹی وی پر اناؤنسمنٹ کی۔ اسی دوران ''نیلام گھر'' جو کراچی سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا' وہ لاہور شفٹ ہوا تو میں نے نیلام گھر میں بھی طارق عزیز کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیے' مگر کچھ مزہ نہیں آیا تو میں نے نیلام گھر چھوڑ دیا اور واپس اناؤنسمنٹ میں آگئی کیونکہ اس فیلڈ کی یا اس شعبے کی کلاس ہی کچھ اور تھی۔''

''کچھ عرصہ آپ غائب بھی رہیں اس فیلڈ سے؟''

''جی ہاں۔ پڑھائی بھی مکمل کرنی تھی' پڑھائی کے لیے کالج کا سلسلہ شروع ہو گیا تو چھوڑنا پڑا مجھے۔ اس دوران پھر ایئر لائن جوائن کرنے کا شوق ہوا۔ اس زمانے میں کچھ پرائیویٹ ایئر لائنز کا آغاز ہوا تو جابز نکلیں تو میں نے بھی اپلائی کیا تو میرا انتخاب ہو گیا اور کچھ عرصہ اس شوق کو بھی پورا کیا۔ ڈومیسٹک فلائٹ ہوتی تھیں۔ سب سے پہلے ''ہجویری ایئر لائن'' کا آغاز ہوا تھا تو اس میں' میں نے جاب کی تھی بحیثیت ایئر ہوسٹس کے۔ اس کے بعد جتنی بھی پرائیویٹ ایئر لائنز آئیں ان سب میں ہی میں نے کام کیا' کسی میں چھ ماہ' کسی میں سال۔۔۔ کسی میں کچھ تو کسی میں کچھ۔۔۔ یہ سب ڈومیسٹک تھیں البتہ ''ایرو ایشیا'' کی فلائٹ ''عمان'' تک گئیں تو میرا سفر بھی انٹرنیشنل اتنا ہی رہا۔''

''فیملی کی طرف سے اجازت نہیں تھی' مگر پھر بھی آپ اس فیلڈ میں آئیں تو زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یا سب کچھ سیٹ ہو گیا؟''

''شروع میں والد صاحب کی طرف سے کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' لیکن والدہ نے بہت سپورٹ کیا تو امی کی حمایت دیکھ کر والد صاحب بھی مان گئے بس وہ یہ چاہتے تھے کہ باعزت جاب ہونی چاہیے اور اس زمانے میں تو سر پر دوپٹا لے کر اناؤنسرز آیا کرتی تھیں تو یہ بات والد صاحب کو اچھی لگی تو پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔''

''ایئر ہوسٹس کی جاب کا تجربہ کیسا رہا؟''

''اچھا رہا۔ بڑے شہروں کے مسافر ذرا جذباتی قسم کے ہوتے تھے۔ ایک تو انہیں پیاس بہت لگتی ہے سیٹ پہ بیٹھتے ہی انہیں پانی چاہیے ہوتا تھا تو یہ ذرا مشکل فلائٹ ہوتی تھی۔ کوئٹہ کے مسافر اتنے معصوم اور اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ کبھی مشکل نہیں ہوتی تھی' کھانا دیتے تھے ہم لوگ تو وہ شکریہ ہی ادا کرتے رہتے تھے اب کافی حد تک چینج آگیا ہے' مگر ابھی بھی وہ لوگ جو پہلی بار سفر کرتے ہیں یا نئے نئے مسافر بنتے ہیں جہاز کے' وہ ابھی بھی ایسے ہی ہیں۔''

''کون سی جاب میں زیادہ مزہ آیا۔ ٹی وی کی یا ایئر لائن کی؟''

''دونوں میں مزہ آیا' لیکن آپ کو بتاؤں کہ ایک وقت آیا کہ میں فلائی کرنے سے تنگ آگئی' کیونکہ فلائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ کافی پرابلمز شروع ہو جاتی ہیں۔ آکسیجن کا بھی مسئلہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر بیک پین پرابلم شروع ہو جاتا ہے۔ ٹیک آف کے وقت اور لینڈنگ کے جہاز کی پوزیشن



ایسی ہوتی ہے کہ تکلیف کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گی کہ ایر اسٹاف کو ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو جب میرے ساتھ بھی یہ مسائل شروع ہوئے تو پھر میں نے یہ جاب چھوڑ دی۔ ایر جاب کی وجہ سے زیادہ تر کراچی میں ہی رہنا ہوتا تھا پھر جب یہ جاب چھوڑی تو کراچی پی ٹی وی گئی۔ اس وقت منظور قریشی پی ایم تھے اور عبدالکریم بلوچ جی ایم تھے۔ پہلے میں نے ان سے فون پر بات کی۔ انہوں نے مجھے فورا" بلایا اور اس وقت کمپیئرنگ کا کوئی پروگرام تھا جس کی آفر انہوں نے مجھے دے دی اور اس پروگرام کا نام "صبح سویرا" تھا' اسی دوران حیدر امام رضوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ڈراموں میں کام کرنے کی آفر دے دی۔ وہ پی ٹی وی کے لیے ایک پلے بنا رہے تھے جو کہ "سٹ کام" تھا نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ اسلم بھٹو کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں طلعت اقبال' صنم اقبال اور میں تھے اور میں نے اپنا ٹیلنٹ دکھانے کے لیے اس پیشکش کو قبول کیا اور پہلے ہی پلے کا مجھے اچھا رسپانس ملا تو پھر بس اداکاری کی فیلڈ میں بھی آگئی۔"

"آپ ماشاءاللہ کافی اچھی اور اسمارٹ ہیں اور جس وقت آپ فیلڈ میں آئیں تو کافی خوب صورت تھیں تو خوبصورتی کام آئی یا ٹیلنٹ؟"

"دونوں۔ اور اگر ٹیلنٹ نہ ہو تو خوب صورتی زیادہ دیر تک چلتی نہیں ہے ایک آدھ ڈرامے میں ہی لوگ برداشت کرتے ہیں زیادہ عرصے تک نہیں۔"

"جس وقت آپ فیلڈ میں آئیں' اس وقت این ٹی ایم تھا اور پی ٹی وی' اب چینلز کی بھرمار ہے۔ اس وقت اور اب کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟"

"کام کے لحاظ سے پہلے والا وقت زیادہ اچھا تھا کیونکہ ایک پروفیشنل ازم تھا اور آج کے دور میں تو آگے جانے کی دوڑ میں پروفیشنل ازم کو ختم کرچکے ہیں اب صرف چل چلاؤ والا کام ہورہا ہے۔ ٹیکنیکلی ہم جتنے اسٹرونگ ہورہے ہیں اتنا ہی ہم پروڈکشن میں پیچھے کی طرف جارہے ہیں۔ یہ ایک نمایاں فرق دیکھا ہے میں نے اس وقت اور اس وقت میں۔ اور اداکاری کا معیار بھی زیادہ گرا ہے۔ اب زیادہ تر جو کام کرتی ہے اب جو پروڈکشن ہاؤسز ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی کم سے کم پیسوں میں کام کرنے والا مل جائے مثلا" اگر ہزار روپے پر ڈے کام کرنے والا مل جائے تو وہ اس سے کام کرانا پسند کریں گے۔ نسبت اس کے جس کو صحیح معنوں میں اداکاری آتی ہوگی' اس لیے اداکاری کا معیار بہت گرا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو اپنے ڈراموں کے ساتھ ساتھ انڈین اور ترکش ڈرامے ہر چینل پہ نظر آرہے ہوتے ہیں۔"

"اب تو غیر ملکی ڈرامے دیکھنے کا رجحان کم ہوگیا ہے' کیا خیال ہے؟"

"رجحان کم ہوا ہے۔ ڈرامے کم نہیں ہوئے ہیں شاید ہمارے یہاں اتنا کام نہیں ہورہا۔ یا ہم شاید چینلز کا پیٹ نہیں بھرپا رہے یا پھر شاید ان کو مہنگا پڑتا

ہے' جس کی وجہ سے انڈین ڈرامے اور انڈین پروگرام اور ترکش ڈرامے زیادہ چلانے شروع کردیے ہیں۔"

بحیثیت ایک سینئر آرٹسٹ کے آپ ان معاملات میں بولتی ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے؟"

"انڈین ڈراموں کے لیے میں ضرور کہوں گی کہ وہ ہمارے یہاں نہیں چلنے چاہئیں۔ میں اس کے خلاف ہوں اور گلیمر کے حساب سے دیکھا جائے تو ترکش بھی نہیں چلنے چاہئیں' لیکن چونکہ ڈراموں میں ڈبنگ ہوتی ہے تو نہ صرف ٹیلنٹ سامنے آتا ہے بلکہ لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے اور اچھے چینلز نے اچھے ڈرامے چلانے کے لیے اچھے آرٹسٹوں کو بحیثیت ڈبنگ آرٹسٹ کے لینا شروع کردیا اور خوش قسمتی سے میں بھی اس میں شامل ہوں۔ تو کلچر کو دیکھتے ہوئے ہم تھوڑا اعتراض کرسکتے ہیں' مگر ویسے نہیں۔ اور انڈین کے لیے یہ اعتراض ہے کہ جب وہ ہمارے ڈرامے نہیں چلاتے تو ہم ان کے ڈرامے کیوں چلاتے ہیں۔ ہم تو انڈیا سے اتنے زیادہ متاثر ہیں کہ ان کے بغیر ہمارا سانس لینا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ ہمارے جتنے بھی شوبز میگزین ہوتے ہیں ان میں ہم اپنے کسی آرٹسٹ کے بارے میں نہیں بتارہے ہوتے بلکہ کترینہ کیف' سیف علی خان اور دیگر کے بارے میں بتارہے ہوتے ہیں کہ آج ان کی سالگرہ ہے تو آج یہ ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ ــــ پاکستانی آرٹسٹ یا ماڈل کی سالگرہ کی کوئی نیوز کسی چینل نے چلائی ہو۔"

"کافی ینگ ایج سے آپ نے ماں کے رول کرنا شروع کردیے' کیوں؟"

"کیوں؟۔ ہاں یہ ایک اچھا سوال ہے۔ پتا نہیں کیوں' مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ آپ جو ہیں وہ نظر آرہے ہیں اسکرین پہ تو کیا حرج ہے اداکاری تو آپ نے کرنی ہی ہے' تو ضروری نہیں کہ ہیروئن بن کر ہی آپ اداکاری کریں۔ آپ مختلف رولز میں ناظرین کو اپنی صلاحیتیں دکھائیں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"آپ نے ماڈرن ماں کے اور مشرقی ماں کے رول بھی کیے ہیں' مگر گیٹ اپ والے رول' جیسے ہماری دیگر فنکارائیں کرتی ہیں آپ نے نہیں کیے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔"

"میں گیٹ اپ والے رول کرنا چاہتی ہوں اور مجھے پسند بھی بہت ہیں' مگر کیا کریں کہ ہمارے یہاں جب کسی پہ کسی کردار کی چھاپ لگ جاتی ہے تو پھر ڈائریکٹرز حضرات کوئی اور کام لیتے ہی نہیں ہیں۔ اور چونکہ میں نے ہمیشہ بہت ہی ڈیسنٹ' ماڈرن اور خوشحال گھرانے کی ماں کے رول کیے ہیں تو شاید سامنے والا سمجھتا ہے کہ یہ اس ٹائپ کے رول کرسکتی ہیں۔ اس لیے مجھے گیٹ اپ والے رولز آفرز نہیں ہوتے۔ میرے اندر بہت ورائٹی ہے اور میں ہر طرح کے رول کرنا چاہوں گی۔"

"آپ نے کبھی اظہار کیا؟"

"ہاں ایک دو کلوز فرینڈز کے ساتھ اظہار کیا' مگر ہر ایک کے ساتھ تو نہیں۔ سب کے ذہن میں یہ ہے کہ صباحت ایک ہی طرح کے کرداروں میں صحیح لگتی ہے۔ یا شاید آزمانا نہیں چاہتے۔"

"کیا ڈراموں کے موضوعات ٹھہر نہیں گئے؟ لڑکیاں روئے جارہی ہوتی ہیں۔"

"جی۔ بالکل ایسا ہے۔ ہمارے یہاں عورت کو اتنا زیادہ مظلوم دکھایا جاتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اس ملک میں عورت پر بہت ظلم ہورہے ہیں اور بے شک ظلم ہو بھی رہا ہے' مگر دوسری سائیڈ پہ لڑکیاں بہت زیادہ پڑھ لکھ بھی رہی ہیں اور بہت بڑے بڑے کام بھی کررہی ہیں' مگر اس سائیڈ کو نہیں دکھایا جاتا۔ اور ہماری بات بھی ہوئی اس سلسلے میں تو بتایا گیا کہ جو اسپانسر کرتے ہیں' جو مارکیٹنگ کرتے ہیں ان کی یہ ڈیمانڈ ہے کہ آپ روتی ہوئی عورت دکھائیں' جتنا زیادہ ظلم دکھائیں گے اتنا ہی لوگ دیکھیں گے۔ اتنا ہی ریٹنگ میں اضافہ ہوگا۔ یہ عجیب سی سوچ ہے جسے چینج نہیں کرسکتے۔"

"سینسر بھی نرم ہوگیا ہے۔"

"بالکل ہوگیا ہے اور اس پر بھی بات ہوتی ہے اور کبھی کچھ ایسے سین ہوتے ہیں' جو آپ نہیں کرنا چاہ رہیں تو اگر ڈائریکٹر اچھا ہے اور آپ کی بات سنتا ہے تو

آپ اسے تبدیل بھی کرا سکتے ہیں۔"

یہ بتائیں کہ آج کل کون زیادہ اچھا لکھ رہا ہے' مرد رائٹرز یا خواتین رائٹرز؟"

"خواتین رائٹرز ہی زیادہ لکھ رہی ہیں۔ اور اچھا لکھ رہی ہیں' مگر اتنا زیادہ اچھا بھی نہیں لکھ رہیں۔ ہمیں آج کل جو اسکرپٹ نظر آ رہے ہیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کو پڑھ کر کہیں کہ واہ واہ۔ کیا بات ہے۔ اور اب تو اتنے لمبے لمبے ڈائیلاگ ہوتے ہیں کہ ماں کا سین ہو یا کسی کا بھی بس وہ بولتے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں سمجھ آتی کہ رائٹر کیا سوچ کر اتنے لمبے لمبے ڈائیلاگ لکھتے ہیں۔ اب لوگوں کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ لمبے ڈائیلاگز کو برداشت کریں۔"

"اب تو یہ حال ہے کہ ایک اینٹ اٹھاؤ تو رائٹرز' ڈائریکٹرز اور آرٹسٹوں کا انبار نکل آتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے' اب تو میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ وہ رائٹر بھی خود ہیں اور ڈائریکٹر بھی خود ہیں۔ اور سارا کچھ خود ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ نے وائس اوور بھی کی' ماڈلنگ بھی کی۔ آج کل کافی فلمیں بن رہی ہیں ہمارے ملک میں۔ اور چینل بھی اور ری مکس بھی۔ آپ کو آفرز آئیں۔"

"نہیں جی۔ فلم ابھی تک نہیں کی۔ دو فلموں کے لیے مجھے کہا گیا تھا لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ دوبارہ نہیں کہا۔ ہمارے یہاں تو فلم کی آفر کرتے ہیں تو اس طرح کہ دھوپ میں پکوڑے تل لو ان کے بجٹ ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کام کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔"

"جی جناب فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں۔ اب کچھ اپنے بارے میں' اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

"لاہور سے میرا تعلق ہے' پنجابی ہوں' لاہور میں ہی پیدا ہوئی اور ساری تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ایجوکیشن کی' 25 اکتوبر کو پیدا ہوئی۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ امی حیات ہیں۔ ہم تین بہن' بھائی ہیں۔ یعنی ایک بہن اور ایک ہی بھائی۔ کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے۔ دونوں جاب کرتے ہیں۔"

"اور یہ بھی کہتے ہوں گے کہ آپ زیادہ اچھا کماتی ہیں ہم جاب والے تو اتنا نہیں کماتے؟"

ہنستے ہوئے۔ "ہاں ہاں۔ بالکل ایسا کہتے ہیں' مگر میں سمجھتی ہوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی فیلڈ میں ماسٹر ہوتا ہے اور سب کو اپنے اپنے نصیب سے ملتا ہے۔"

"شادی ہوئی۔"

"جی شادی ہوئی' میری پسند سے ہوئی۔ ایک بیٹا ہے اور ماشاءاللہ سے گیارہ سال کا ہے۔"

"گھرداری؟"

"گھرداری کا اور کوکنگ کا بھی شوق ہے۔ میرے بیٹے کو کچھ چیزیں میرے ہاتھ کی پکی ہوئی پسند ہیں تو وہ فرمائشیں کرتا رہتا ہے۔"

"لوگ ملتے ہیں تو کس طرح؟"

"بہت پیار سے ملتے ہیں' بہت تعریف کرتے ہیں۔ بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں' بہت عزت کرتے ہیں۔ اور یہی ہمارا فیڈ بیک ہوتا ہے کہ ہم کہیں جاتے ہیں اور لوگ ہمیں پہچانتے ہیں اور میں تو اس وقت اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں۔"

"میاں صاحب کو تو نہیں پہچانتے ہوں گے' نہ بیٹے کو؟"

"جی۔ مگر میرے میاں صاحب اور میرا بیٹا بہت خوش ہوتے ہیں' میری شہرت اور عزت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ لوگ سیلفی بنوا رہے ہوتے ہیں۔"

"بیٹے کو شوق ہے۔"

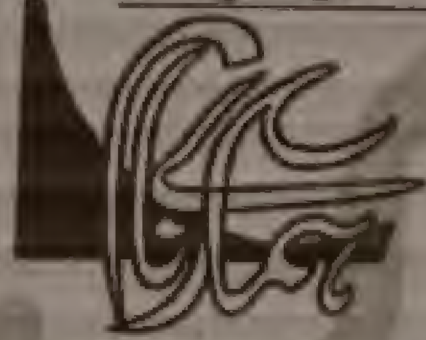
"بیٹے کو شوق تھا اور اس نے ڈرامہ سیریل "میرا سائیں" میں کام کیا بھی تھا' لیکن پھر اس نے توبہ کرلی کہ میں نہ اتنا انتظار کر سکتا ہوں اور نہ ہی وقت ضائع کر سکتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صباحت بخاری سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔





نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

کہکشاں' زمان... کویت

اب آپ کو خط لکھنے کی وجہ بتاتے ہیں کہ پرچے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول جو کہ سلسلے وار ناولز ہیں ان کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ "نمل" بہت خوب صورت ناول ہے جو بہت دنوں تک دماغ میں رہے گا۔ نمرہ کی کہانی ہمیشہ لاجواب ہوتی ہے اور میری بہن اور مجھے "سعدی" کا کردار بہت پسند ہے۔ حنین کی حاضر جوابی بہت بھاتی ہے۔ پھپھو اور بھتیجوں کا پیار دیکھ بہت خوشی ہوتی ہے' یہ ہمارا موسٹ فیورٹ ناول' اس کے علاوہ عمیرہ جی بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ "پیر کامل" کا سیکوئل "آب حیات" گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں۔ سالار کا کردار بہت اچھا ہے۔ بہت مزہ آرہا ہے۔ آپی خواتین ڈائجسٹ اوور آل بہت زبردست ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا معیار گر رہا ہے تو ہم ان کی بات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔

ج- پیاری کہکشاں! معذرت خواہ ہیں کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آج خواتین ڈائجسٹ کا جو معیار ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری قارئین ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی کی وجہ سے ہی خواتین ڈائجسٹ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے' یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اچھی مصنفین کے ساتھ باذوق قارئین بھی ملی ہیں۔ جو اچھی تحریروں کو سراہتی ہیں اور اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

رضوانہ شکیل تولی... سیالکوٹ

مجھے خط لکھنے پر مجبور نمرہ احمد کے مکمل ناول "نمل" نے کیا۔ نمرہ احمد تم کس طرح اتنے پیارے پیارے ناول لکھ لیتی ہو۔ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے "آمین" دوسرا ناول عفت سحر طاہر کا "بن مانگی دعا" بہت زبردست جا رہا ہے۔

ج- پیاری رضوانہ! آپ نے دس سال کی خاموشی توڑ کر ہمیں خط لکھا' بہت شکریہ۔ نمرہ اور عفت سحر طاہر تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

غزالہ ایمان... ملکانی شریف

مت پوچھیے کہ کتنی مشکلوں کے بعد میں یہ خط لکھ رہی ہوں سب سے مشکل مرحلہ تو بھائی سے لفافہ منگوانا تھا۔ میں خواتین اور شعاع کی تب سے قاری ہوں جب چار سال پہلے ناول "پیر کامل" پڑھا تھا۔ "نمل" میں مجھے حنین یوسف اور سعدی یوسف کے کردار بہت زبردست لگتے ہیں اور ہاشم پر بہت غصہ آتا ہے' ویسے عجیب بات نہیں ہے نہ ہی سعدی کی کوئی ہیروئن ہے اور نہ ہی حنین کا کوئی ہیرو، اور نہ ہی ہاشم کی کسی ہیروئن کا وجود' جس طرح ٹیپیکل اسٹوریوں میں ہوتا ہے۔ مجھے اس طرح کے ناول جیسے نمل بہت پسند ہیں اور تنزیلہ آپی آپ جب بھی لکھتی ہیں نہایت شاندار لکھتی ہیں۔ بہت سے ایسے سوال جن کا ہمیں پہلے نہیں پتا تھا۔ اب پتا چل رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میپو کی شادی ڈاکٹر زارا سے ہو جائے گی اور عمیرہ آپی آپ سے کہنا چاہوں گی کہ آب حیات پیر کامل سے اتنا مختلف کیوں ہے۔ ویسے سالار اور امامہ کی نوک جھونک

بہت مزہ دیتی ہے اور ہاں آسیہ رزاقی جی کے کالم "میرے استاد" نے ان کی کمی کو پورا کر دیا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہم بھی ایسے ادیب خاندان کی پیداوار ہوتے تو کیا بات تھی۔ آپ کو پتا ہے، میری امی ڈائجسٹ پڑھنے پر بہت ڈانٹ سناتی ہیں بھلے فارغ وقت میں کیوں نہ پڑھوں۔ ڈیئر عائشہ میں نے آپ کے لیے بہت دعا کی ان شاء اللہ آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔ اور امبر گل میں آپ کا بہت تھینکس کرنا چاہتی ہوں میں یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ عمیرہ آپی کا ناول "دربار دل" کب اور کس شمارے میں شائع ہوا تھا پلیز بتا دیجیے گا۔

ج۔ پیاری غزالہ! آپ نے اتنی دشواریوں سے گزر کر ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کیوں نہیں کریں گے۔ آپ کی امی سے ہم درخواست کریں گے کہ وہ آپ کو پرچا پڑھنے سے منع نہیں کریں۔ مطالعہ کرنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ ہم اپنے پرچوں میں کوئی بھی ایسی بات شائع نہیں کرتے جو ذہنوں کو بگاڑنے کا سبب بنے یا لڑکیوں کو غلط راہ دکھائے۔ "دربار دل" کب شائع ہوا تھا، ہمیں یاد نہیں اگر کسی قاری بہن کو یاد ہو اور اس نے ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کر دیں گے۔

عائشہ جمیل ۔۔۔ بلدیہ ٹاؤن، کراچی

مصنفین سے سروے میں "اقبال بانو، سائرہ رضا اور سمیرا حمید" کے جوابات پڑھ کر بہت مزا آیا۔ (آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے اسے مستقل سلسلہ بنا دیا) "لوٹی بہار" میں تلے ہوئے لوکی کے چھلکے یہ ڈش کچھ عجیب سی ہی لگی اور لوکی کا بالکل ایسا ہی مزے دار سالن میری امی جی بھی بناتی ہیں۔ آپ کے باورچی خانے میں جھانکا تو محترمہ حرا قریشی براجمان تھیں۔ مذاق رات کے ڈی جے محسن عباس سے تفصیلی ملاقات خوب رہی۔ ایمن خان کی باتیں بھی اچھی لگیں۔ خاتون کی ڈائری سے ملیحہ رضوان کا انتخاب پسند آیا۔ میری بیاض میں ثنا عابد کا شعر اچھا لگا۔ نظم اور غزلیں بھی اچھی تھیں۔ کرن کرن روشنی کا سلسلہ چاند کی طرح چمکتا ہوا لگا۔ عمیرہ احمد کا "آب حیات" زبردست ناول ہے۔ امامہ (سلی گرل) کو تھوڑا سا عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔ نمرہ احمد کا "نمل" بہت اچھا ناول ہے۔ جس میں حنین کا کردار اچھا لگتا ہے، مگر یہ (موٹو) کیا کر بیٹھی؟ جواہرات کا کردار ویسے بھی پسند نہ تھا۔ اوپر سے ایک اور نیا کارنامہ۔۔۔ بے شک ماں بن کر اپنے بچوں کے لیے کیا، مگر وہ جو سعدی کو کہانی سنا رہی تھی تو انہیں اپنا آپ کتنا مظلوم لگ رہا تھا، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ جانور بے زبان ہیں۔ عقل و شعور سے بے گانی مخلوق بے شک وہ ماں تھی مگر تھیں تو باشعور انسان۔

عہد الست (تنزیلہ ریاض) اور بن مانگی دعا (عفت سحر طاہر) کا ناول بھی بہت ہی زبردست ہیں، بہت ہی اعلا۔ آئینہ نعیمہ ناز کا سبق آموز ناول تھا۔ پرخار راستوں پر بہار (فاخرہ جبیں) نے بھی اچھا لکھا۔ افسانوں میں سب ہی افسانے اچھے تھے، مگر بدگمان اور ابر گریزاں یہ دونوں زیادہ پسند آئے۔

ج۔ پیاری عائشہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حمیرا قریشی ۔۔۔ حیدر آباد

کئی سالوں سے رسالہ پڑھتی ہوں اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ بن مانگی دعا بیسٹ ہے۔ تمام رائٹرز بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ خواتین میں اپنے نام کی جگمگ دیکھنے کی حسرت حسرت ہی رہ جائے گی۔ میں نے کہانی اور اشعار پوسٹ کیے تھے، مگر کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

ج۔ پیاری حمیرا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

نازش خان ۔۔۔ کراچی

میں 9th کلاس سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں اور اب تو ایم اے (I.R) کر چکی ہوں اور درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود میں کبھی خواتین ڈائجسٹ پڑھنا مس نہیں کرتی، بلکہ اکثر فارغ اوقات ملنے پر اپنے پاس موجود پرانے خواتین رسالے دوبارہ پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں اور خواتین ڈائجسٹ تو میرے لیے نایاب ہے، جس نے مجھے زندگی کے مختلف امتحانوں میں نہ صرف بہتر اور صحیح فیصلہ کرنے کی قوت اور ہمت دی، بلکہ شعور و آگہی سے بھی روشناس کرایا۔

ج۔ بہت شکریہ نازش! آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

نایاب سعید۔۔۔ ڈیرہ غازی خان

جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ عمیرہ جی کا ناول "آب حیات" ہے اس ماہ کی قسط بہت ہی زبردست تھی۔ جب سالار نے امامہ کو ڈانٹا تو بہت ہی مزا آیا۔ اس کے بعد نمرہ جی کا ناول "نمل" بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ جواہرات کو اس کی بڑی سزا ملنی چاہیے نمرہ جی۔ حنین کا پڑھ کر ہم تو شاک میں رہ گئے۔ نمرہ جی آپ "نمل" بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ عفت جی کا "بن مانگی دعا" ناول بھی مجھے بہت پسند ہے۔

ج۔ پیاری نایاب! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

زارا محفوظ۔۔۔ راولپنڈی' چکلالہ ایئرپورٹ

10 اپریل کی اس اداس صبح مجھے یہ خط لکھتے ہوئے خوشی اور افسوس دونوں ہے خوشی اس لیے کہ آج تقریباً" 20 سال میں' میں پہلی دفعہ آپ سے مخاطب ہوں' چھٹی کلاس میں تھی جب شعاع پڑھنا شروع کیا اس وقت خوب صورت ترین ناول ماہا جی کا جو چلے تو جاں سے گزر گئے چھپتا تھا پھر رفعت سراج دل دیا دہلیز کے ساتھ آئیں پھر جبیں سسٹرز اور پھر ان کے بعد عمیرہ جی اپنے پہلے ناول جہاں تک میری معلومات ہے کے مطابق وہ جو اک صبح کا تارا ہے اور یہیں سے ہمارے پسندیدہ ترین رائٹر میں شمار ہونے لگیں اور موسٹ فیورٹ (پیر کامل) تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا کہ ہم کہتے تھے کہ کاش سارا ڈائجسٹ ہی عمیرہ جی کے ناول سے مزین ہو مگر پھر ایک لمبی خاموشی اور جب یہ خاموشی ٹوٹی تو پتا چلا کہ یہ ہماری عمیرہ نہیں ہیں یہ تو کوئی اور ہے۔ امامہ بھی بدل گئی ہے۔

ج۔ پیاری زارا! عمیرہ احمد کی خواتین ڈائجسٹ میں پہلی تحریر "میری ذات ذرہ بے نشاں" تھی' جو اکتوبر 99ء میں شائع ہوئی۔

آپ نے آب حیات اور امامہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے آپ کے بہت سے سوالات کے جوابات تو اس قسط میں ہی آپ کو مل جائیں گے۔

عمیرہ احمد کی تحریروں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں کچھ بھی بلاجواز نہیں ہوتا' وہ بہت مدلل انداز میں لکھتی ہیں اور انسانی فطرت کے تمام پہلو مدنظر رکھ کر لکھتی ہیں۔ آپ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ پہلے پورا ناول پڑھ لیں پھر فیصلہ کریں۔

سدرہ حیات۔۔۔ اٹک

عمیرہ احمد کے آب حیات کی پہلی قسط پڑھتے ہوئے ہر سین میں گمان ہوتا کہ یہ امامہ اور سالار تو نہیں اور دل چاہتا یہ ان دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ امامہ اور سالار کی زندگیوں کو کون سا نیا موڑ ملنے والا ہے' یہ تو عمیرہ احمد ہی جانتی ہیں۔ نمرہ احمد کی ہر تحریر پچھلی سے زیادہ دل چھو لینے والی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی کہانی میں جو سسپنس پھیلاتی ہیں۔ ان کی گرہوں کو بہت احتیاط سے کھولتی ہیں۔ نمرہ بخاری صاحبہ سے گزارش ہے کہ "ہم سے ہے زمانہ" باقاعدگی سے لکھیں' اور ایک شکایت جو مجھے اپنی رائٹرز سے ہے جس نے مجھے خط لکھنے پر مائل کیا' وہ ہیروئنوں سے منسلک ہے۔ آخر ہیروئین ہر دوسرے سین میں ہیرو کے کندھے سے کیوں لگ جاتی ہے' جبکہ ہیرو سے اس کا کوئی محرم رشتہ نہیں ہوتا۔ میری تمام رائٹرز سے گزارش ہے کہ ہیروز کو بلاوجہ کے ہاتھ پکڑنے کی عادت پر سخت سزا دی جائے اور ہیروئین کے بلکتے ہوئے وجود کو کسی اور کا سہارا دیا جائے۔

ج۔ سدرہ! ہم ہر ممکن احتیاط رکھتے ہیں کہ ہیرو اور ہیروئین کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا جائے پھر بھی اگر کہیں غلطی ہو جاتی ہے تو اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ مزید احتیاط رکھیں گے۔

زوباریہ خالد۔۔۔ لاہور

رنگا رنگ ٹائٹل بہت زیادہ پسند آیا۔ "آب حیات" کی قسط پڑھ کر ہمیشہ کی طرح مزا آیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار تھا۔ "نمل" میں "نمرہ احمد" ماضی کے ہر باب کو بہت اچھے طریقے سے واضح کر رہی ہیں۔ اس بار حال کا کوئی سین ہی نہیں تھا۔ فائزہ افتخار کو کہیں کہ وہ ہمارے لیے کوئی سلسلے وار ناول لکھیں۔ اس بار اتنے کم خطوط۔۔۔؟ یہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آمنہ اجالا' ثنا عابد اور نادیہ جہانگیر کے اشعار پسند آئے۔

ج۔ زوباریہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ فائزہ افتخار تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ماریہ صدیق، سکینہ شاہین۔۔۔ جام پور

چار سال سے "خواتین ڈائجسٹ" مستقل طور پر زیر مطالعہ ہے۔ لیکن شمارہ وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے یہ مشکل ہے کہ رواں ماہ شائع ہونے والے ناولوں پر کوئی خصوصی بصرہ کرسکوں۔ تمام ناولز خوب ہوتے ہیں کیونکہ کچھ مصنفین بہت مضبوط پلاٹ پیش کرتی ہیں تو کچھ اعلا وارفع خیالات کو خوب صورت لفظوں کا پیراہن پہنا کر قارئین کو مبہوت کرادیتی ہیں۔ لیکن جس ناول کو پڑھ کر یہ خیال ذہن میں کوندا کہ مصنف دنیا کی ذہین ترین مخلوق ہیں، وہ بشریٰ سعید کا ناول "سفال گر" تھا۔ مشرقی و مغربی تہذیب کو بے حد متاثر کن انداز میں بیان کیا۔ صوفیہ بشیر کا ناول "توبہ" اچھی تحریر تھی۔ "مصحف" ناول میں گو کہ پلاٹ کی وہ مضبوطی نظر نہ آئی جو نمرہ احمد کا خاصہ ہے، لیکن بہت شاندار تحریر تھی۔ عنیزہ سید نے "جور کے کوہ گراں تھے ہم" میں بڑے اچھوتے انداز میں چھوٹے بڑے واقعات، الفاظ، حتیٰ کہ جذبات کو بھی ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ نگہت سیما بڑی تحقیق کے بعد قلم اٹھاتی ہیں۔ "زمین کے آنسو" کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔ کبھی یہ ناول تاریخ کی کتاب، کبھی انسانی نفسیات کا مضمون تو کبھی آج کے صحافی اور مختلف پروگراموں کے میزبانوں کے نقاب کو چیدہ چیدہ کرنے کا نشتر لگتا ہے، لیکن اس ناول کا اختتام بڑے ہنگامی انداز میں ہوا۔

"عہد الست" تنزیلہ ریاض کا شاہکار، جس کا ہر لفظ مجھے اپنے سحر میں جکڑتا ہے۔ Longinus کہتا ہے:

" Sublimity is an echo of soul. "

تو بلاشبہ تنزیلہ ریاض کا یہ تخلیقی کام اپنی مصنفہ کی اعلا وارفع ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ نمرہ احمد بہت اچھے انداز میں "نمل" کے تمام کرداروں کو بیان کررہی ہیں۔ کہانی کے علاوہ اشعار کا چناؤ بہت خوب ہوتا ہے۔ "سحر عترت" ایک نیا موضوع تھا۔ سائرہ رضا کے ناولز زندگی کے نئے رخ سے روشناس کراتے ہیں۔

ج۔ ماریہ اور سکینہ! آپ نے جن کہانیوں کا ذکر کیا۔ وہ واقعی بہترین کہلانے کی مستحق ہیں اور ہمیشہ یاد رہنے والی ہیں۔

ایک مصنف کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی تحریریں قارئین کے ذہنوں میں اس طرح محفوظ ہو جائیں کہ وقت ان کو دھندلا نہ سکے۔

اقصیٰ شرافت۔۔۔ ہارون آباد

واہ واہ! کیا کہنے۔۔۔ خواتین ڈائجسٹ ایک زبردست اور نامور رسالہ ہے۔ ہر کہانی میں ایک منفرد رنگ ہوتا ہے۔ آج کل بن مانگی دعا بہت زبردست ہے۔ نمرہ جی آپ تو کیا خوب لکھتی ہیں۔ بہت خوب صورت انداز ہے آپ کا۔ عمیرہ جی آپ کے تو کیا کہنے۔ لیکن پلیز عمیرہ جی اب "آب حیات" میں سالار اور امامہ کو الگ الگ مت کیجئے گا اور نہ ہی کسی کو ماریے گا۔

ج۔ بہت شکریہ اقصیٰ! آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے۔

سمیرا خان۔ ملتان

سرورق اچھا تھا۔ سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" اس سلسلے میں بنیادی مسائل پر روشنی ڈالیں وضو، غسل۔ وغیرہ اور عورتوں کے بارے میں کچھ مخصوص مسائل اس لیے کہ خواتین تو ہے ہی عورتوں کا رسالہ۔

آب حیات پڑھا بہت لطف آیا۔ خطوط پڑھے۔ عمیرہ جی کی تو کیا ہی بات ہے انہوں نے حقیقت کا رنگ دے کر کہانی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

ج۔ بہت شکریہ سمیرا! عمیرہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

افشاں شہزاد۔ کراچی

اقبال بانو، سائرہ رضا اور سمیرا حمید جی کے جوابات پڑھے۔ ایمن خان سے ملاقات بھی مزے دار تھی۔ محسن عباس سے مل کر بھی اچھا لگا۔ افسانے چاروں ہی زبردست تھے۔ خاص کر بدگمان، تمثیلہ زاہد اور ایسا بھی ہوتا ہے، سعدیہ ملک زیادہ پسند آئے۔ ناولٹ فاخرہ جبیں صاحبہ کا "پُرخار راستوں پر بہار تھا" جو کہ ایک معصوم لڑکی کی کہانی تھی۔ کردار نگاری، جملہ بنت سب ہی کچھ لاجواب رہا۔ یہی حال کچھ آئینہ کے بارے میں بھی۔ زبردست۔ باقی قسط وار ناولز کی تو کیا بات ہے۔ جیسے لکھنے والے نام ہیں ویسے ہی ناول بھی۔

ج: پیاری افشاں! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ افسانہ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثمرو احمد بٹ۔ چوکی

نعیمہ ناز کا آئینہ بہت اچھی تحریر رہی۔ عفت سحر طاہر کا "بن مانگی دعا" بیسٹ جارہا ہے۔ ابیہا' معیز اور عون دونوں پیارے پیارے کردار ہیں۔

فاخرہ جبیں ثانیہ+ ریان جہانگیر بڑا اچھا لگا۔

ننھے منے افسانے ابر گریزاں + چابی دونوں بہت بامقصد رہے۔

عمیرہ احمد' آب حیات میں دیکھیے سالار کے ساتھ کیا کریں۔ سالار کا امتحان تو امامہ بنے گی ہی' دکھائی دے رہا ہے! اور امامہ کا امتحان لگتا ہے سالار کے بعد اسٹارٹ ہوگا۔ میری بیاض سے گڑیا شاہ نے بڑا پیارا شعر لکھا۔

کل کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے
کشتی بھنور میں آئی ہے کردار تو نہیں

اس کے علاوہ ہمارے نام فیورٹ سلسلوں میں سے خطوط پڑھنا' لکھنا' بھرے بڑا لطف آتا ہے۔ اللہ کرے رونقیں اسی طرح دوبالا رہیں۔ رنگا رنگ پھول میں سب ہی پھول اچھے لگتے ہیں۔

ج: پیاری ثمرو! کہاں تھیں آپ؟ کافی دن بعد خط لکھا آپ نے؟ خیریت تھی نا؟ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

آمنہ حسین۔ شہدادپور

آپ کے کہنے پر نمل کی اب تک کی اقساط ایک ساتھ پڑھیں۔ واقعی بہت اچھا ناول ہے۔ اب میں ہر ماہ اسے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔

ج: شکریہ آمنہ! ناول قسط وار پڑھنے اور ہر ماہ انتظار کا اپنا مزہ ہے۔ آپ کی تعریف نمرہ احمد تک پہنچا رہے ہیں۔

پاکیزہ ہاشمی۔ بھاولپور

دل بہت اداس ہے اور اس اداسی میں اضافہ "آب حیات" کی اس لائن نے کیا۔ "جو مقدر میں نہیں ہوتا' وہ ایڑی کا کانٹا بن جاتا ہے۔" پتا نہیں ہمارے لفظ اس قابل نہیں رہے کہ خواتین کی زینت بنے؟ آئینہ بہت اچھی تحریر تھی۔ پلیز ہد بھنڈی کی ترتیب بتادیں۔

ج: آپ کے الفاظ کس قابل ہیں' یہ ہم آپ کو کیا بتائیں؟ آپ کے الفاظ ہمارے دل میں جگہ پاتے ہیں۔ صفحات البتہ محدود ہیں۔ شامل نہیں کرپائے۔ آپ اسے ہماری مجبوری سمجھیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

جس دن اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آیا' اسی دن مجھے جاب کی آفر ہوئی' کچھ کر دکھانے کا جنون مجھ میں خواتین ڈائجسٹ کے توسط سے ہی آیا۔ دسمبر 2015 میں کنیز نور علی کے افسانے "اندر کی آواز" نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا۔ اس کا جملہ "راستہ اگر ڈھونڈنے سے نہ ملے تو خود بنانا پڑتا ہے۔" خاص طور پر سالگرہ نمبر کے سروے میں سمیرا حمید کی باتوں نے بھی بہت زیادہ متاثر کیا۔ "ہمارے والدین نے ہمیں گھر' غذا' بنیادی تعلیم دے دی ہے' ان پر بوجھ نہ ڈالیں' اپنی خواہشات کے لیے' اپنے دماغ اور ہاتھ پیروں کا استعمال کریں' ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے ہونے کا حق ادا کریں۔" تب سے میری یہ بڑی خواہش تھی کہ میں اپنی صلاحیت اور ہنر کو کسی کام لاسکوں۔

"آب حیات" کی یہ قسط کافی ڈریسنگ تھی۔ سالار کا امامہ کے ساتھ جلال کو لے کر جھگڑا کرنا اور جذباتی ہونا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ جلال سے ملنے کے بعد بھی امامہ کی غائب دماغی کی وجہ سے ویڈنگ رنگ کو ہی واش روم میں بھول کر جانا سالار کے لیے کیسے قابل برداشت ہوسکتا تھا۔ "بن مانگی دعا" کی یہ قسط نارمل رہی۔ نمل بہت ہی پرتجسس تحریر ہے' کب کیا ہوجائے' کچھ بھی اندازہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ نمرہ نے اورنگ زیب کے قتل کی سچویشن کی منظر نگاری بہت زبردست کی ہے۔ "آئینہ" نعیمہ جی بہت ہی کمال کی تحریر لکھی' بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ اس جملے نے بہت ہی متاثر کیا۔ "اڑان اتنی ہی اونچی بھرنی چاہیے جتنا پیروں میں دم ہو' اپنی اوقات سے زیادہ اڑتے میں انسان تھک ہار کر نیچے ہی آن گرتا ہے۔"

"عہد الست" کی یہ قسط روح کو جھنجوڑنے والی تھی۔ سفید فام لڑکوں کا مذاق اڑانا۔ تنزیلہ جی نے اس سچویشن کی جس طرح منظر نگاری کی۔ اس نے رونے پر بھی مجبور کردیا۔ افسانوں میں "ابر گریزاں" بہت ہی زبردست تحریر'

اور "ایسا بھی ہوتا ہے" بہت متاثر کن تحریر تھی۔ مصنفین سے سروے بہت ہی انٹرسٹنگ تھا۔ پڑھ کر مزا آیا۔

ج :۔ مسرت! سب سے پہلے جاب کی مبارک باد پھر آپ کو اور صائمہ کو 4 مئی کا دن مبارک ہو' آپ دونوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ خواتین پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس بار بھی آپ نے تفصیل سے ہر کہانی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا' بہت شکریہ۔

منیزہ نعیم۔۔۔ راولپنڈی

یہ 43 واں سالگرہ نمبر تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ اس رسالے کو پڑھتے ہوئے ہمیں 37 یا 38 سال ہوگئے۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ خاموش قاری تھے۔ جب میں عبداللہ کالج کراچی میں پڑھتی تھی' تب ہم بہت سے رسالے پڑھتے تھے اور شعاع بھی میں 85 سے پڑھ رہی ہوں۔ کب سے سوچ رہی تھی' مگر لکھ نہ سکی۔ اب لکھنے لگی ہوں تو دل اداس سا ہے کہ نہ محمود ریاض صاحب ہیں' نہ محمود خاور اور نہ میرے زوتی بھیا' عدنان بھائی کے مشورے پڑھ کر ہم اس وقت اچھی بیوی' اچھی ماں کا فریضہ ادا کررہے ہیں۔ سالگرہ نمبر میں تمام بہنوں نے اچھا لکھا ہے' نئی لکھنے والی بہنیں اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج :۔ منیزہ! ایک طویل عرصہ کی خاموشی کے بعد آپ نے اپنی رائے کا اظہار کرلیا' بہت شکریہ۔ آئندہ خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں پر تبصرہ بھی کیجیے۔

عروج مغل۔۔۔ اللہ ٹاؤن

کیا بتاؤں آپ کو کن حالات میں' میں خواتین پڑھتی ہوں۔ ہم دونوں بہنیں مل کر ڈائجسٹ لیتی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی پہلی باری اس کی ہوتی ہے اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔ اس لیے جس دن خواتین آتا ہے اس دن شکل پہ مسکینی طاری کر کے بڑی بیچاری بن کر بیٹھ جاتی ہوں' تاکہ میری بہن کو میری شکل دیکھ کر مجھ پر ترس آجائے اور وہ مجھے خواتین دے دے اور میں اکثر کامیاب ہوتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھے دے دیتی ہے۔ اف یہ سالار اور امامہ کے جھگڑے بھی نا اور اب یہ ہاشم مبین اللہ ان جیسے لوگوں کو پوچھے' اس باب کا نام غارت گر ہے اور نمل میں بھی ایک باب کا نام غارت گر تھا۔ "میڈم! ازمرکا بھرم رکھے ہوں۔" "اپنے فارس بھائی اس بات نے جہاں خوشی دی' وہیں جواہرات کی قتل کرنے والی حرکت نے شاکڈ کردیا۔ حنہ واقعی ہی جینئس ہے۔ فارس غازی کے دکھی انداز پر ہم بہت دکھی ہوئے۔ سعدی یوسف دی گریٹ! ایسا کریکٹر جو مثالی ہے اور اب تک گناہ کے راستے سے دور۔ "بن مانگی دعا" اچھا جارہا ہے۔



قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

نوجوان نسل کے نمائندہ فنکار

آفان وحید قریشی سے باتیں

شاہین رشید

1 "پورا نام؟"
"آفان وحید قریشی۔"
2 "پیار کا نام؟"
"بچپن میں امی 'عفی' مگر اب سب آفان ہی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"
"29 ستمبر اور شہر کراچی۔"
4 "مادری زبان؟"
"پنجابی 'پنجاب سے تعلق ہے۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"چار بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی دو بہنیں۔ تیسرا۔"
6 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ 11 انچ / میزان۔"
7 "تعلیمی ڈگری؟"
"این سی اے لاہور کا گریجویٹ ہوں۔"
8 "کیسے طالب علم تھے؟"
"بہت بریلینٹ۔۔۔ زندگی میں کبھی سیکنڈ نہیں آیا 'ہمیشہ فرسٹ آیا ہوں۔"
9 "شوبز میں آمد؟"
"حادثاتی طور پر آیا۔ پہلے ریڈیو پہ تھا آر جے پھر ٹی وی پہ آیا۔"
10 "پہلا ڈرامہ؟ وجہ شہرت؟"
"تیرے پہلو میں' اور یہی وجہ شہرت کہہ لیں یا پہچان کہہ لیں۔"
11 "پہلی کمائی؟"
"پہلی کمائی ریڈیو کی تھی اور شاید چار ہزار چھ سو تھی اور یہ بات پندرہ سال پہلے کی ہے۔ تو گھر والوں پہ ہی خرچ کی۔"
12 "شوبز میں برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟"
"شوبز میں بہت پیارے لوگ بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جن سے آپ نہیں ملنا چاہتے۔"
13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"مجھے جلدی اٹھنے کی عادت ہے مگر شوبز میں آکر بگڑ گیا ہوں اور زیادہ سے زیادہ نو بجے تک سوتا ہوں بس۔"
14 "اور رات؟"
"حد سے حد رات بارہ یا ایک بجے تک سو جاتا ہوں۔"
15 "صبح اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"
"کہ فجر کی نماز پڑھ لوں۔ قضا پڑھتا ہوں۔"
16 "گھر والوں سے کوئی شکایت؟"
"بالکل بھی نہیں۔ اللہ تعالٰی نے مجھے آئیڈیل والدین دیے ہیں۔"
17 "کون سے تہوار شوق سے مناتے ہیں؟"
"عید 'بقرعید بس۔۔۔ اپنی سالگرہ بھی نہیں مناتا۔"
18 "زندگی بدل گئی؟"
"جب سے میں نے باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کی۔"
19 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"اللہ نے اچھا قد کاٹھ دیا ہے 'یہ بھی کرم ہے کہ جو کھاتا ہوں 'موٹا نہیں ہوتا مگر پھر بھی لگتا ہے کہ میں تھوڑا دبلا ہوں اور مجھے جم جوائن کر لینا چاہیے۔"
20 "شدید بھوک میں کیفیت؟"
"برداشت کرتا ہوں۔ خاموش رہتا ہوں۔ اظہار نہیں کرتا۔"
21 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"ہر شہری کو بنیادی سہولتیں مل جائیں اور تعلیم عام ہو جائے تو کیا کہنے پھر جرائم بھی کم ہو جائیں گے۔"
22 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"
"ڈرامہ آن ایئر ہونے کے بعد 'فیڈ بیک' کا۔"



23 ""شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟""
""کہیں نہیں .... میرا دل چاہتا ہے گھر پر ہی رہوں اور جس نے مجھ سے ملنا ہے وہ گھر آجائے۔""
24 ""خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟""
""میں انتہائی جذباتی انسان ہوں۔ خوشی میں میرا موڈ بہت اچھا ہو جاتا ہے اور بلاوجہ ہر شخص کے ساتھ اچھا ہو جاتا ہے۔""
25 ""طبیعت میں ضد ہے؟""
""انتہائی ضدی ہوں۔ اتنا ضدی انسان ہوں کہ اپنے آپ سے خوف آنے لگتا ہے۔""
26 ""دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟""
""اس کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میرا موڈ خراب ہے تو چھوٹی سی بات پر میٹر گھوم جاتا ہے۔""
27 ""خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟""
""گریس، پروقار اور جو بولنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ یعنی جنہیں زبان پر عبور حاصل ہوتا ہے۔""
28 ""کوئی خوب صورت لڑکی گھورے تو؟""
""مجھے کوئی بلاوجہ گھور رہا ہو تو مجھے غصہ آتا ہے، لیکن گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے عادت ہو گئی ہے تو اب پرواہ نہیں کرتا۔""
29 ""پرائز بانڈ لیتے ہیں؟""
""ایک بار سوچا تھا، مگر ابھی تک لیے نہیں۔""
30 ""کیا وقت سے پہلے بھی کچھ ملتا ہے؟""
""میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا۔""
31 ""کیا پسند ہے جوائنٹ یا سنگل اکاؤنٹ؟""
""سنگل.... اپنا اپنا۔""
32 ""کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟""
""کہیں کی بھی نہیں .... گھومنا پوری دنیا چاہتا ہوں، مگر واپس پاکستان ہی آنا چاہتا ہوں۔""
33 ""شاپنگ کے شوقین ہیں؟""
""مجھے کبھی شاپنگ کا شوق نہیں رہا، مگر اب مجھے مسلسل شاپنگ کرنی پڑتی ہے کہ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔""
34 ""ونڈو شاپنگ پسند ہے؟""

"ہاں جی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مالز میں گھومنا پھرنا' کھانا پینا بہت پسند ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔"

35 "بچت کی عادت ہے؟ یا شاہ خرچ ہیں؟"

"میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جو بچت کر لیتے ہیں میں تو بچت کر ہی نہیں سکتا۔"

36 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"مجھے تحفے دینا بھی اچھا لگتا ہے اور لینا بھی۔ مجھے پرفیومز بہت پسند ہیں۔"

37 "موڈ کب اچھا ہو جاتا ہے؟"

"تین چار باتیں ہیں۔ مگر مین بات یہ ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ آپ آگے بڑھ رہے ہیں' آپ کی پرفارمنس میں نکھار آرہا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

38 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"

"بالکل بھی نہیں۔ اگر کوئی مجبوری نہ ہو۔ پندرہ میں منٹ تو سوچ کے اور پھر ہمت کر کے اٹھتا ہوں۔"

39 "کن لوگوں کے خلوص پہ شک نہیں کیا جا سکتا؟"

"صرف اور صرف والدین کے خلوص پہ۔"

40 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"جینز اور شرٹ۔"

41 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"

"میزان لوگ تو ہوتے ہی بہت حسن پرست ہیں' لیکن ذہانت کے بغیر گزارا نہیں میرا۔ حسن کے بغیر شاید کسی پوائنٹ پہ گزارہ ہو جائے' مگر ذہانت کے بغیر تو ایک لمحہ بھی مشکل ہے۔"

42 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"مجھ پر کچھ وقت ایسے آتے ہیں کہ مجھے اپنے کمرے میں سکون ملتا ہے۔ کچھ دن ایسے ہوتے ہیں کہ گھر کے لاؤنج میں سکون ملتا ہے امی ابو کے ساتھ۔"

43 "کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں؟"

"ثانیہ سعید کے ساتھ۔"

44 "کیا ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"وہ زمانے بیت گئے۔ جب ایس ایم ایس کا انتظار ہوتا تھا۔ اب تو لیٹ Reply ہی کرتا ہوں۔"

45 "بوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟"

"کتاب پڑھ لیتا ہوں' بہت مطالعہ کرتا ہوں۔ یا پھر میوزک۔"

46 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"ہاں جی' ایک بار نہیں کئی بار۔"

47 "مہمانوں کی آمد' وہ بھی اچانک کیسی لگتی ہے؟"

"مہمانوں کی آمد ہمیشہ اچھی لگتی ہے کیونکہ اس سے موڈ میں تھوڑا چینج آتا ہے۔"

48 "اگر پاور میں آجائیں تو پہلا کام؟"

"میں کبھی پاور میں نہیں آنا چاہوں گا۔ بہت خوف آتا ہے۔"

49 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"کتابیں۔ میں نے بتایا ناکہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔"

50 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"آفان! میڈیا میں سوچ سمجھ کر کام کرنا' زیادہ ڈرامے مت کرنا۔ پتا نہیں ان باتوں کا کیا مقصد ہوتا ہے۔"

51 "انسان کی زندگی کا سب سے بہترین دور کون سا ہوتا ہے؟"

"بچپن.... بہت یاد آتا ہے۔"

52 "کن لوگوں پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"

"اپنے والدین پہ.... خاص طور پر اپنی امی پہ۔"

53 "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟"

"گاڑی.... جو کہ بہت مہنگی تھی۔"

54 "کھانے کے لیے بہترین جگہ' چٹائی' ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"

"اپنا بیڈ۔"

55 "ہاتھ سے کھاتے ہیں یا چھری کانٹے سے؟"

"ریسٹورنٹ میں مجبوری کے تحت چھری کانٹے سے کھاتا ہوں' ورنہ ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں اور پیزا بھی ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں۔"

56 "دنیا سے کیا لینا چاہتے ہیں؟"

"دنیا کچھ نہیں دے سکتی' دنیا سے آخرت کمانا چاہتا ہوں۔"

57 ''فیس بک اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟''
'' صرف ٹائم Kill کرنے کی حد تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

58 ''دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟''
''ایک زمانہ تھا جب دیسی کھانے بہت پسند تھے اور بدیسی کھانوں سے بہت ایشو تھا مگر اب بدیسی کھانے زیادہ پسند ہیں۔''

59 ''ایک بات جو لوگ آپ کے لیے کہتے ہیں؟''
''کہ آپ کو شیف ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں بہت اچھا کھانا پکاتا ہوں۔''

60 ''عشق کے بخار؟''
''میری زندگی کے کچھ پچھتاوے ہیں جو کہ یہی ہیں۔''

61 ''عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟''
''میں نے ویسے کچھ عورتوں کو بہت سخت دل بھی دیکھا ہے لیکن اگر مردوں سے موازنہ کریں تو پھر عورت نرم دل ہوتی ہے۔''

62 ''ایک سوال جو آپ کو برا لگتا ہو؟''
''نہیں۔ ایسا کوئی سوال نہیں ہے اور برا لگے تو منع کر دیتا ہوں۔''

63 ''کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟''
'' مجھے چھپکلی سے انتہائی خوف اور انتہائی گھن آتی ہے۔''

64 ''کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟''
''اندھی؟... محبت کے ہاتھ پاؤں' سر پیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

65 ''کب بہت تکلیف ہوتی ہے؟''
''جب کوئی جھوٹ بولے اور جھوٹ بول کر کہے کہ وہ آپ کے ساتھ مخلص ہے اور جبکہ وہ مخلص نہیں ہوتا اور جب آپ کسی کے لیے ایک دم سے امپورٹنٹ نہیں رہتے تو وہ چیز ہضم کرنا بہت مشکل کام ہے۔''

66 ''شادی میں پسندیدہ رسم؟''
''شادی میں مہندی' کیونکہ ڈانس وغیرہ ہوتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔''

67 ''تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟''
''شادی میں تو کیش ہی دینا چاہیے۔''

68 ''ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟''
''ناشتہ زیادہ شوق سے کرتا نہیں ہوں' ہاں کھانا مجھے اپنی بہن کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے۔''

69 ''کیا بار بار فون نمبرز تبدیل کرتے ہیں؟''
''گزشتہ چودہ سال سے میرے پاس ایک ہی نمبر ہے۔''

70 ''کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''
''اپنا والٹ' اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی۔''

71 ''کیا آپ عام لوگوں جیسے ہیں؟''
''گھر سے باہر عام لوگوں جیسا نہیں ہوں' ہاں گھر کے اندر میں ویسا ہی ہوں جیسے ہمیشہ سے تھا۔''

72 ''ماں ناراض ہو جائے تو؟''
''امی اگر ناراض ہوتی ہیں تو ہم دونوں کو پتا چل جاتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے بات کر لینی ہے اور بالکل نارمل طریقے سے۔''

73 ''اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟''
''کبھی مشکل سے' کبھی فوراً''۔

74 ''دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟''
''میں تو دل کے ہاتھوں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دماغ کی سنوں۔''

75 ''غصے میں پہلا لفظ؟''
''وہ میں بتا نہیں سکتا۔'' قہقہہ

76 ''شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟''
''جب آپ کے اندر غرور سر اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔''

77 ''بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا؟''
''میں تو بستر کے راستے میں ہی ہوتا ہوں کہ مجھے نیند آجاتی ہے۔''

99 ''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''
''میں اس چیز کے لیے بہت زیادہ تیار ہوں۔ اس دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔''



(شرمین مغرب والے تو مسلمانوں کو پہلے ہی اجڈ اور وحشی سمجھتے ہیں' آپ یہ "تعمیری" کام کرکے آسکر تو جیت گئیں لیکن پاکستان کا امیج؟)



راستہ

یہ خبر تو آپ روز ہی پڑھتے ہوں گے کہ فلاں پاکستانی اداکار یا اداکارہ بولی وڈ میں کام کر رہی ہے یا کر رہا ہے اور کامیاب بھی ہو رہا ہے۔ وہاں پاکستانی فنکاروں کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ لیکن اب تک کسی بھارتی فنکار نے پاکستانی فلم میں کام نہیں کیا سوائے نصیرالدین شاہ کے' جنہوں نے شعیب منصور کی فلم "خدا کے لیے' میں مختصر مگر جامع کردار کیا تھا۔ لیکن اب شاید بھارتی فنکاروں کا پاکستانی انڈسٹری میں راستہ کھل جائے۔

خبریں ویریں

واصفہ سہیل

تعمیری کام

پاکستان کی واحد آسکر ایوارڈ یافتہ فلم ساز شرمین عبید چنائے کی نئی دستاویزی فلم "سونگ آف لاہور" کو 14ویں سالانہ ٹری بیکا فلم فیسٹول کے لیے نامزد کرلیا گیا ہے۔ (کیا پاکستان میں شرمین سے اچھی ڈاکومنٹری کوئی نہیں بناتا جو ہر بار۔۔۔) اس سال اس فلمی میلے میں 80 ممالک کی 160 سے زیادہ فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جائیں گی۔

دستاویزی فلموں کے متعلق شرمین عبید چنائے کہتی ہیں کہ دستاویزی فلمیں بنانے میں میری دلچسپی کا آغاز 2001ء میں اس وقت ہوا جب گیارہ ستمبر کا واقعہ پیش آیا تو دنیا کی توجہ پاکستان اور افغانستان کی طرف ہوئی۔ اس وقت مجھے لگا کہ میں مشرق کی معلومات مغرب کو منتقل کرنے کا تعمیری کام کر سکوں گی۔

کیوں کہ ہدایت کار جمشید جان نے اپنی فلم "سوال سات سو کروڑ کا" میں بھارت کے مقبول مزاحیہ اداکار





"راج پال یادیو" کو کاسٹ کرلیا ہے۔ (کیا فلم کا نام دیکھ کر راضی ہوگئے راج پال؟)

امکان

لیجیے جناب اب کراچی "یو آر کلنگ می" (نہ نہ بخدا یہ ہم نہیں کہہ رہے) بلکہ پاکستانی صحافی صبا امتیاز کا ناول ہے یہ۔ اس پر بھارتی ہدایت کار نے فلم بنانے کا اعلان کردیا ہے (پر کراچی پر ہی کیوں ...؟) اور بھارتی فلم ساز اور صبا امتیاز مل کر اس کو بھارتی سیاق و سباق میں ڈھال رہے ہیں (شکر ہے! ورنہ ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ ...؟) اس فلم کا نام "دہلی یو آر کلنگ می" رکھے جانے کا امکان ہے۔ جس میں پرانی دہلی کو فلمایا جائے گا (کیوں نئی دہلی میں ...؟)

مانگ

اداکار میرا' شاہدہ منی کی ویڈیو میں بلا معاوضہ کام کرنے پر تیار ہوگئیں۔ (دیکھا ہم کہتے ہیں نا کہ میرا خبروں میں رہنے کے فن سے آشنا ہیں۔) لاہور میں ایک میوزیکل نائٹ میں اداکار میرا نے پرفارمنس دی۔ میرا نے کہا کہ وہ شاہدہ منی کی بہت بڑی فین ہیں۔ جب وہ اداکاری کرتی تھیں اور جب سے انہوں نے (بھئی شاہدہ منی نے) گلوکاری شروع کی ہے' وہ ان کی ڈبل فین ہوگئی ہیں (مطلب صاف ہے بھئی کہ بچپن سے پسند ہیں۔) میرا چاہتی ہیں کہ شاہدہ منی انہیں اپنی ویڈیو میں کاسٹ کریں۔ جب وہ انہیں کہیں گی وہ ویڈیو شوٹ کے لیے حاضر ہوجائیں گی۔ (میرا کام نہ ملنے کے باعث یہ صورت حال ہوگئی ہے کہ آپ شاہدہ منی سے کام مانگ رہی ہیں ...؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ٹیلی ویژن چینلز کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت نے سیاسی سوالات پر از خود غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی جگہ سوچنے کا ذمہ ہمارے اسٹار بنے اینکروں نے اپنے سر لے لیا ہے' اسی لیے ٹیلی ویژن اسکرین پر اب حقائق نہیں ڈرامے نظر آتے ہیں اور شو بز والوں کے وہ تمام ہتھکنڈے جو نیکی اور بدی کے درمیان کسی بڑی جنگ میں اپنے تئیں حق کے طرف دار بنے مجاہدوں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

(نصرت جاوید)





آپ کا باورچی خانہ

کائنات خالد

کچن روزمرہ کی زندگی کا وہ حصہ ہے' جسے اگر صاف رکھا جائے تو عورت کی سلیقہ مندی کی گواہی کوئی بھی دیکھ کے دے سکتا ہے۔

1 - جب امی کھانا بناتی تھیں' تب بھی اور جب سے میں نے کھانا بنانا شروع کیا ہے تو میں بھی پسند و ناپسند کا خیال ضرور رکھتی ہوں۔ میں زیادہ تر بھائیوں کے کھانے کی پسند کا خیال رکھتی ہوں' کیونکہ زبیر بھائی اور عمیو بہت موڈی ہیں' میرے ابو (خالد ممتاز) وہ کھانے کے معاملے میں نخرے نہیں کرتے ہیں اور چھوٹا بھائی نونی وہ نارمل ہیں اور امی (نائلہ خالد) وہ بھی نخریلی نہیں' بس یہ دونوں بھائی پتا نہیں کس پہ چلے گئے۔ اسی لیے زیادہ تر ہمارے گھر میں دو ڈشیں لازمی بنتی ہیں' زیادہ تر کھانا امی ہی بناتی ہیں۔ اور پسند و ناپسند کی عادت میں نے ان ہی سے سیکھی ہیں' ویسے سچ کہوں تو کھانے کے معاملے میں' میں بھی بہت موڈی ہوں' مگر نخریلی نہیں۔

2 - ہمارے گھر مہمان زیادہ تر عید یا کسی خاص موقع پہ آتے ہیں اور ان کی خاطر تواضع کا اہتمام زیادہ تر باہر کی چیزوں پہ ہوتا ہے' لیکن اگر ماموں کی فیملیز یا بڑی بہن (صبا جمال زیب جس کی شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے۔) وہ آجائے تو بس پھر کیا' امی کچن اور میں۔ امی کھانا بناتی ہیں۔ میں مدد کراتی جاتی ہوں اور ساتھ ساتھ پورے گھر کی صفائی اور برتنوں کی دھلائی' بڑی بہن اور باقی رشتہ دار جب کھانا وغیرہ کے لیے آتے ہیں تو پہلے سے بتا کے آتے ہیں اور میرے خیال سے یہ اچھی بات ہے' کیونکہ ہم بھی جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو بتا کے ہی جاتے ہیں۔ امی کھانا بہت زبردست بناتی ہیں۔ اس لیے جو ایک ڈش وہ بہنوئی کی فرمائش پر بناتی ہیں' اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

لب شیریں

اجزاء :

دودھ	ایک کلو
سویاں	آدھا پیکٹ
چینی	حسب منشا
چھوہارے	چار عدد (باریک کٹے ہوئے)
پستہ' بادام	دس عدد
ناریل ثابت	حسب پسند
چھوٹی الائچی	چار دانے
کیوڑہ	چند قطرے
کارن فلور	دو چمچے
خشک دودھ	ایک کپ

ترکیب :

سب سے پہلے دیگچی میں اچھی طرح دودھ کو ابال لیں۔ پھر اس میں سویاں ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکنے دیں۔ تھوڑی دیر بعد چینی ڈال کر اس طرح پکائیں کہ چینی اس میں اچھی طرح گھل جائے۔ اب ایک بڑے سے پیالے میں خشک دودھ ڈالیں۔ کارن فلور ڈالیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اس مکسچر کو دیگچی میں ڈال دیں اور اس وقت تک چمچہ ہلاتی رہیں جب تک کارن فلور اچھی طرح اس میں رچ بس نہ جائے۔ (تقریباً" پانچ منٹ تک چمچہ ہلاتی رہیں' کیونکہ

کارن فلور ڈالنے کے بعد ایسا نہ کرنے کی صورت میں گٹھلیاں بن جاتی ہیں۔) پھر اس کے بعد الائچی' کیوڑہ' چھوہارے اور باقی میوہ جات ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔ دس منٹ بعد ڈش میں نکال لیں۔ چاندی کے ورق سے سجائیں اور مزے سے کھائیں اور میری امی کو دعائیں دیں۔

3 ۔ ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ یہ کام کا سوال ہے۔ میرا مطلب ہے میرے مطلب کا' کیونکہ مجھے کچن کی صفائی کا خبط ہے۔ میں چاہے کھانا بناؤں یا نہ۔۔۔ مگر کچن گندا ہو بس مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں گندی ہوں اور گھر کا کوئی کونا صاف کروں یا نہ کروں' لیکن کچن صاف میں ضرور رکھتی ہوں اور سچ بات ہے کہ اگر کچن صاف ہو تو کھانا دل سے پکایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ہر تھوڑی دیر بعد میں کچن میں ضرور جاتی ہوں کہ اگر کوئی چیز الٹ پلٹ پڑی ہے تو اسے اس کی درست جگہ پر رکھ سکوں۔

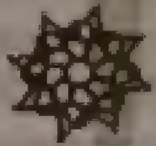
4 ۔ ناشتا عام دنوں میں ہمارے گھر چائے' پاپوں پر ہوتا ہے' لیکن چھٹی والے دن اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ کبھی حلوہ پوری' کبھی باہر کے پراٹھے وغیرہ۔ ہم بہن بھائیوں کی پسند کھانے کے معاملے میں بہت ملتی ہے۔ اسی لیے ناشتا میں پسند و ناپسند کا چکر زیادہ نہیں چلتا۔

5 ۔ ہماری تائی (نادرہ جو کہ ہماری خالہ بھی ہیں) کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور ان ہی کی وجہ سے ہمیں باہر جانے کا موقع (کھانے وغیرہ کے لیے) بہت کم ملتا ہے' کیونکہ وہ اپنے پکوانوں سے ہماری گھر بیٹھے ہی باہر کی سیر کرا دیتی ہیں' لیکن ایسا نہیں کہ ہم نے بالکل بھی باہر کھانا نہیں کھایا' ہم نے باہر کھانا ندا کے ساتھ بھی بہت تو نہیں' لیکن کھایا ہے۔ (ندا میری بہترین دوست کزن ہے۔) جب بھی وہ آتی ہے تو میں تایا ابو سے اصرار کر کے اس کے ساتھ گھومنے کا پروگرام ضرور رکھتی ہوں۔ لیکن ہم لڑکیاں آج تک فیملز کے بغیر خود سے باہر نہیں گئیں' کیونکہ نہ ہمیں پسند ہے اور نہ ہی ہمیں اجازت ہے' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے بڑے ہمیں خود باہر کھانا وغیرہ کھلا کے ہمارا شوق پورا کر دیتے ہیں۔

6 ۔ کھانا موسم کے حساب سے بنانا ضرور چاہیے اور میں تو اس چیز کا خیال ضرور رکھتی ہوں کہ اگر گرمیاں ہوں تو جوس وغیرہ' سردیوں میں سوپ وغیرہ۔ اس لحاظ سے (جو کہ میرے مطلب کی چیزیں ہیں) میں خیال رکھتی ہوں۔ بارش کے موسم یا گرمی' سردی کے موسم' میری امی ماشاء اللہ کھانے کے لحاظ سے بہت اہتمام کرتی ہیں۔ بارش کا موسم ہو اور امی کے ہاتھ کی بیسنی روٹی' مزہ آجاتا ہے سچ میں۔

7 ۔ کھانا ہمیشہ دل سے بنانا چاہیے' تب ہی وہ دوسروں کو پسند آتا ہے' کیونکہ اچھا کھانا وہ ہی ہوتا ہے۔ جو لگن سے اور محنت سے بنایا جائے۔ اسی لیے جب بھی کھانا بنائیں دل سے بنائیں۔ کیونکہ اسی طرح آپ کی تعریف ہو سکتی ہے اور آپ کی محنت وصول ہو سکتی ہے۔

8 ۔ کھانا بنانے سے پہلے بسم اللہ ضرور پڑھیں' کیونکہ اس سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے اور ایک بات جب بھی کھانا پیش کریں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پیش کریں' کیونکہ اگر کھانا برا بھی بنا ہو تو کیا پتا آپ کی مسکراہٹ سے اسے وہ بھی اچھا لگ جائے' اس لیے کھانا اچھا ہو برا' مسکراہٹ زندہ باد۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ۔۔۔۔۔۔۔۔	آمنہ کریم
میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔۔	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ۔۔۔۔۔۔۔۔	موسیٰ رضا

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عدنان

ش۔ن۔۔۔ گجرات

میری شادی کو چار سال ہونے والے ہیں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اڑھائی سال کی بیٹی ہے اور گجرات میں گریڈ 9 پر گورنمنٹ ٹیچر اپائنمنٹ ہوئی ہے لیکن بیٹی میرے بغیر نہیں رہ سکتی اور اسکول ساتھ لے کر جانے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح کے چھوٹے موٹے مسائل کی بنا پر میرا دل جاب سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ شوہر پرائیویٹ جاب کرتے ہیں' آٹھ ہزار تنخواہ پر گزارہ مشکل ہے۔

میں میکے میں تھی ایک سال پہلے میرے شوہر ناراضی ختم ہونے پر آکر مجھے لے گئے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے مجھے کئی دفعہ برملا کہا کہ تمہارے والد صاحب نے مجھے برا بھلا کہا تھا اس لیے تمہیں میکے صرف دروازے تک چھوڑنے جاؤں گا اور ایسا ہوا بھی بلکہ ایک دفعہ میں نے زیادہ زور دیا کہ اب گلی تک آگئے ہیں تو اندر ضرور آنا ہے لیکن انہوں نے ضد میں آکر بیگ وغیرہ گلی کے درمیان ہی پھینک دیا اور واپس چلے گئے۔

میکے رہ کر جاب کرنے کی اجازت انہوں نے میری ساس کے کہنے پر دے تو دی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ ادھر آکر رہ نہیں سکتے۔ سوچتی ہوں کہ وہ کو آپریٹ نہیں کرتے تو میں کیوں ان کی بیٹی بھی پالوں اور اکیلی سروائیو بھی کروں اور پھر انہیں کمائی کا حساب دوں کہ کتنا کمایا کتنا بچایا وغیرہ وغیرہ۔

اب جبکہ میں جاب چھوڑ چکی ہوں تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تم نفسیاتی مریضہ ہو اور اب تم جب گھر آؤ گی تو تمہاری پہلی جیسی عزت نہیں ہو گی اور سب کے طعنے سنو گی۔

ج ۔ اچھی بہن! آپ نے جاب چھوڑ کر واقعی غلطی کی۔ یہ تو آپ کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کو گورنمنٹ جاب مل گئی تھی۔ جہاں تک آپ کے شوہر کے روّیہ کا تعلق ہے تو اس کی بڑی وجہ ان ذہنی پریشانی اور احساس کمتری ہے۔ آپ خود سوچیں' اس مہنگائی کے دور میں آٹھ ہزار تنخواہ میں وہ آپ کا اور اپنی بیٹی کا خرچ کیسے اٹھا سکتے ہیں۔ آپ کی سوچ غلط تھی۔ اگر آپ تھوڑا برداشت اور تحمل سے کام لیتیں تو کچھ عرصہ بعد وہ آپ کے ساتھ آکر رہ لیتے۔

ازدواجی زندگی میں کسی بھی مسئلہ میں ضد' جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے' آپ نے جلد بازی کی۔ اب آپ کو ساتھ رکھتے ہوئے وہ اسی لیے گھبرا رہے ہیں کہ خرچا برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

آپ کوشش کریں کہ دوبارہ آپ کی جاب ہو جائے' شوہر دوسری شادی کا ذکر کرتے ہیں تو کرنے دیں۔ اتنی کم تنخواہ میں دوسری شادی آسان نہیں ہے۔ اور یہ اطمینان رکھیں کہ کچھ عرصہ بعد وہ آپ کے پاس آجائیں گے۔ اور آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔

ن۔ف۔۔۔ سندھ

میری عمر 21 سال ہے۔ جبکہ میری تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔ میرے بابا شروع ہی سے بہت سخت مزاج کے تھے۔ جس کی وجہ سے میرے اندر خوف وہراس' کم اعتمادی اور نگیٹو سوچ جیسی خامیاں اتر آئیں اور آج میرا یہ حال ہے کہ میں کسی کا بھی سامنا کرنے سے کتراتی ہوں اور ہر کام کو کرنے سے پہلے خوف میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ یہ مجھ سے غلط ہو جائے گا اور میں غلطیاں بھی بہت کرتی ہوں۔ میرے اندر ضد والی خامی بھی ہے اور یہ سب عادات اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ یہ کوشش کرنے کے باوجود نہیں جا رہیں۔ 21 سال کی عمر میں ہی لگتا ہے کہ جیسے میں ضعیف ہو چکی ہوں۔ جبکہ گریجویشن مجھے میری سسٹر نے اپنے پیسوں سے کروایا جو جاب کرتی ہیں اور آج تک اپنی تمام تعلیمی اسناد اور ان کا خرچا خود اٹھایا اور ہماری امی جو کہ 9 سال سے فالج کی مریضہ ہیں۔ اب گھر میں ان کی دیکھ بھال میں کرتی ہوں۔ میں زندگی کے بہت عجب بھنور میں پھنس چکی ہوں۔ مجھے آگے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جبکہ ایسے حالات میں' میں کچھ نہیں کر سکتی۔

میرے ایک ٹیچر یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ آپ مینٹلی طور پر صحیح نہیں ہیں' کسی سائیکالوجسٹ کو دکھائیں۔ ٹیچر نے مجھے چیلنج کیا ہے کہ اگر سائیکاٹرسٹ نے آپ کو اگر مینٹل نہ کہا تو آپ مجھے کہنا۔ بھائی آپ بتائیں میں کتنے فیصد پاگل ہوں۔ اب آہستہ آہستہ میرے اندر بدگمانی اور جھوٹ کی عادت بھی پختہ ہو رہی ہے۔

ج : ذہین لوگوں کے ساتھ
ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت حساس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ نہ بزدل ہیں نہ ذہنی مریض نہ ہی آپ میں کوئی خرابی ہے.... ذہنی مریض تو وہ استاد ہیں جنھوں نے آپ سے اس طرح کی باتیں کیں۔ کسی بھی نارمل اچھے بھلے آدمی سے یہ کہنا شروع کردیں کہ وہ مینٹلی ٹھیک نہیں ہے تو کچھ عرصے کے بعد وہ سچ پاگل ہو جائے گا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آپ پریشان تھیں۔ ان ٹیچر کی باتوں نے آپ کو مزید پریشان کردیا۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے خود اعتمادی پہلے ہی کم تھی 'مزید خوف کا شکار ہو گئیں اور رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا۔
آپ کی صاف ستھری موتیوں جیسی لکھائی 'رواں تحریر 'خط لکھنے کا انداز بتاتا ہے کہ آپ پڑھی لکھی 'سمجھ دار اور باشعور لڑکی ہیں.... کچھ بننے کا جذبہ 'کچھ کر دکھانے کا شوق یہ سب باتیں ایک ذہین اور باصلاحیت انسان میں ہی ہو سکتی ہیں۔ اور آپ نے خود لکھا ہے کہ لوگ آپ کو بہت ذہین سمجھتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں۔ یقیناً" آپ میں کوئی خوبی ہے تب ہی عزت کرتے ہیں۔
آپ کو صرف ذہنی سکون کی ضرورت ہے 'ہر وقت کی پریشان کن سوچیں آپ کو سکون سے نہیں رہنے دیتیں۔
آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے ذہنی سکون کے لیے کوئی دوا لے لیں۔ بھرپور نیند 'اچھی خوراک سے آپ چند دنوں میں بالکل خوش باش اور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔
پڑھی لکھی ہیں 'گریجویشن کر چکی ہیں۔ آپ کی بہن جاب کرتی رہی ہیں۔ آپ بھی جاب کے بارے میں سوچیں' پریشانیوں اور پریشان کن سوچوں کا بہترین علاج مصروفیت ہے۔ اگر آپ میں شاعری کی صلاحیت ہے تو شاعری ضرور کریں۔

ن۔۔۔ چیچہ وطنی

میں تقریباً" بارہ تیرہ سال سے ذہنی مریض ہوں اور اس وقت میری عمر اٹھائیس سال ہے میرے ابو بہت کنجوس ہیں اور آج تک عید شب رات پر بھی انہوں نے ہمیں کپڑے بنا کر نہیں دیے جبکہ وہ بہت نمازی پرہیز گار ہیں اور زکوۃ وقت پر ادا کرتے ہیں۔ مگر میری جلدی بیماری پر ایک چونی تک خرچ نہیں کرتے۔ ہم پہلے شہر میں رہتے تھے پھر ابو کے اصرار پر ہم دیہات میں شفٹ ہو گئے۔ میری تعلیم بی اے ہے اور ہم شہر کے ماحول کے عادی ہیں۔ خاندان میں سب لڑکے شادی شدہ یا ہم سے بہت چھوٹے ہیں۔ ابو کی کنجوسی کی وجہ سے میری بہن کا رشتہ ٹوٹ گیا کہ نجانے یہ لوگ ہمیں جہیز دیں گے یا نہیں۔ ہمارے لیے محلے کے آوارہ 'بے روزگار لڑکوں کے رشتے آتے ہیں ہیں اور میرے ابو کہتے ہیں کہ ان میں سے ہی کسی سے شادی کرلو ورنہ ساری زندگی بے شک کنواری بیٹھی رہو۔ میں ایک تو پہلے ہی ڈپریشن کی مریض ہوں۔ دوسرا ابو کی ضد اور سوچ اور اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے روز بروز پریشان ہوتی جارہی ہوں کہ ہمارا کیا بنے گا۔ اگر ابو کے مطابق کسی بے روزگار لڑکے سے شادی کرلوں تو شادی کے بعد میرے مسائل میں اور اضافہ ہو جائے گا۔
ج۔ اچھی بہن! آپ نے یہ کیسے طے کرلیا کہ آپ ذہنی مریض ہیں البتہ آپ کے حالات واقعی بہت پریشان کن ہیں لیکن پریشان رہنے سے کسی مسئلہ کا حل نہیں نکل سکتا۔ کسی جاہل 'آوارہ اور بے روزگار لڑکے سے شادی کرنا پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا ہے لڑکا شریف پڑھا لکھا ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ اسے کوئی نوکری مل جائے گی۔
آپ پڑھی لکھی ہیں۔ کوشش کریں کہ کہیں جاب مل جائے۔ اس طرح ایک تو مصروف رہیں گی دوسرے گھر کے ماحول سے دور رہیں گی۔ آپ ذہنی مریض نہیں ہیں 'صرف پریشان ہیں اور ان ہی پریشانیوں نے آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کیا ہے آپ نے اپنی جلدی بیماری کے بارے میں نہیں لکھا بہت سی جلدی بیماریاں ذہنی پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں۔
آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ جب چاروں طرف سے پریشانیاں گھیر لیں اور کوئی راستہ نظر نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالتا ہے۔ ہر پریشانی کے بعد راحت ہے۔ آپ دعا کرتی رہیں ان شاء اللہ آپ کے حالات ضرور بہتر ہوں گے۔



امتہ الصبور

بیوٹی بکس

شاہدہ انجم..... کراچی

س - میری عمر 25 سال ہے اور میرے اگلے چار دانت ٹیڑھے میڑھے اور قدرے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ جس سے اوپر کا ہونٹ اٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ دانتوں کا رنگ پیلا ہے۔ میں بڑی باقاعدگی سے صبح شام دانت صاف کرتی ہوں۔ کئی منجن بھی استعمال کرکے دیکھ چکی ہوں۔ کوئی ترکیب بتائیں کہ جس سے دانت سفید اور چمک دار ہو جائیں۔

ج - چہرے کی خوب صورتی میں دانت بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر آپ کم عمری میں دانتوں کے گرد تار لگوا لیتیں تو یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ اب بھی ڈاکٹر سے مشورہ کریں' تار لگوانے سے کسی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ورنہ آپ یہ دانت نکلوا کر مصنوعی دانت بھی لگوا سکتی ہیں۔

پہلے دانتوں پر پالش کرا کے انہیں سفید کیا جا سکتا ہے۔

منیزہ خان..... کراچی

س - میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ وزن بھی زیادہ ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے۔ پیٹ زیادہ بڑھا ہوا ہے کمر بھی بہت چوڑی ہے۔ میرا قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن 55 کلو ہے۔ عمر 29 سال ہے۔

ج - بڑھے ہوئے پیٹ کے لیے آپ سیدھی لیٹ جائیں اور جس طرح سائیکل چلاتے ہیں اس طرح ٹانگوں کو حرکت دیں۔ روزانہ باقاعدگی سے یہ عمل کریں پہلے پانچ منٹ سے شروع کریں پھر بیس منٹ تک لے جائیں۔

2- بیٹھ کر ٹانگیں پھیلالیں اور اب ٹانگوں کو سیدھا رکھتے ہوئے ہاتھ سے پیر کے انگوٹھے چھونے کی کوشش کریں۔ روزانہ دس سے پندرہ منٹ یہ عمل کریں' ایک ماہ میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

وزن کم کرنے پر بھی توجہ دیں۔ آپ کو کم از کم تین سے پانچ کلو وزن کم کرنے کی ضرورت ہے پیدل چلنے اور غذا پر توجہ دینے سے آپ کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ چکنائی والی اور میٹھی اشیا کا استعمال ترک کر دیں۔

ثنا اصغر..... لاہور

س - میرا کام ایسا ہے کہ مجھے باہر نکلنا پڑتا ہے دھوپ میں چل چل کر میری جلد بری طرح جھلس گئی ہے۔ چہرہ گردن اور کلائیاں کالی پڑ گئی ہیں جبکہ پہلے میرا رنگ بہت صاف تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے میرا رنگ صاف ہو جائے۔

ج - شہد بہترین جراثیم کش ہے' نیوزی لینڈ میں نوجوان طلبہ پر تجربہ کیا گیا جن کے چہرے پر کیل' مہاسے تھے۔ ان کے چہرے پر شہد کی کریم جب چہرہ کے ایک طرف لگائی گئی تو پتا چلا کہ جس طرف شہد لگایا گیا تھا۔ اس طرف کی جلد دانوں اور مہاسوں سے صاف ہو گئی۔ زخم پر شہد لگانے سے زخم جلد مندمل ہو جاتا ہے۔

دھوپ کی شدت سے مرجھائی اور جھلسی ہوئی جلد کے لیے شہد کا ماسک اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ماسک ہر قسم کی جلد کی حامل خواتین استعمال کر سکتی ہیں۔ شہد اور بیسن ہم وزن ایک پیالے میں لیں اور اچھی طرح مکس کریں تاکہ یہ آمیزہ کریم کی طرح گاڑھا ہو جائے۔ اب اسے چہرے' گردن اور بازوؤں پر لگائیں تقریباً" بیس منٹ لگا رہنے دیں۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ یہ عمل دہرائیں۔

☼